

مکمل ناول

سب کچھ ویسا ہی تھا، کہیں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ ہر جگہ اسی طرح اپنی جگہ پر موجود تھی۔ جو کچھ جب تھا وہی سب کچھ اب بھی تھا۔ لیکن پھر بھی وہاں سب کچھ ویسا نہیں تھا۔ وہاں ایک کمی تھی۔ بہت بڑی کمی۔ سب سے بڑی کمی۔ وہ اپنے قدموں کو گھسیٹتے ہوئے لاؤنج سے نکل کر ڈائننگ روم میں آئی تو پیچھے لاؤنج سے ایک آواز آئی۔

”کبھی کبھی مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔ محبت کے کلمہ جانے کا ڈر۔ اس کے چھن جانے کا ڈر۔ پتا نہیں محبت اتنی وہمی کیوں ہوتی ہے۔“ اس نے مڑ کر لاؤنج میں رکھے صوفے کی طرف دیکھا۔

”اوپر اوپر سے غصہ دکھا رہی ہو۔ اندر سے تو خوش

پھر اس نے اس گھر میں قدم رکھا، جس میں وہ زندگی میں دوبارہ کبھی آنا نہیں چاہتی تھی۔ پھولوں سے بھرا وہ خوب صورت لان بہت سونا اور خاموش لگا تھا اسے۔

”سنو وہ کہاں ہے؟“ اس نے پھولوں سے بے آواز پوچھا۔ وہ جواب میں بالکل خاموش رہے تھے۔ وہ انتہائی سے جلتے ہوئے گھر کے اندر آ گئی۔

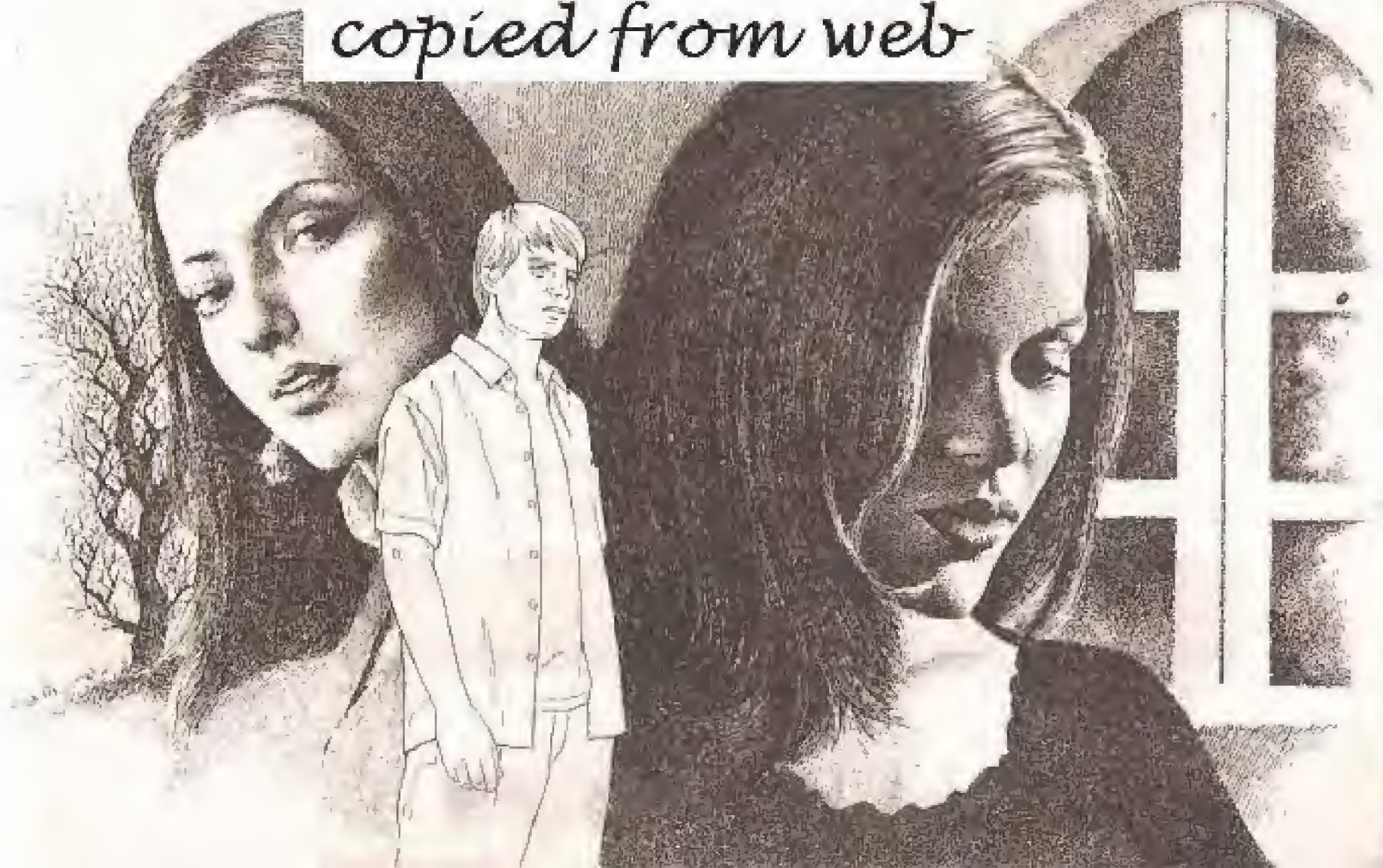
”پہلے سارا گھر تو دیکھ لو۔ تم دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔ میں نے اسے اتنی اچھی طرح سجاایا ہے۔“ اس کے بالکل قریب ایک آواز ابھری۔ اس نے چونک کر اپنے دائیں بائیں دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

وہ اس گھر کے انٹیریئر نظر سے دوڑا رہی تھی۔ وہاں

فرحت رشتیاق



copied from web



ہو رہی ہوگی کہ جس حد سے کے پیچھے اتنی لڑکیاں بڑی ہیں تو میرے پیچھے بڑا ہے۔ اس نے زخمی نگاہوں سے اس خالی صوفے کی طرف دیکھا۔ وہ جو آج اپنی مخصوص کرسی پر سے غائب تھا۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی بھی وہ فوراً "واٹنگ روم سے نکل گئی۔" سلسلے نظر آتے ہیں کی طرف خود بخود اس کے قدم اٹھتے تھے۔

"خود ہی بد تمیزی کرتی ہو پھر مظلوم سی شکل بنا کر روئے بھی کھڑی ہو جاتی ہو۔"

"زندگی میں بہت سی باتیں ہمیں ناگوار محسوس ہوتی ہیں۔ مگر کسی ناگوار بات پر اس طرح ری ایکٹ کرنا بالکل مناسب نہیں ہے۔ تمہارے گل کے دوتے پر مجھے بہت دکھ ہوا۔" وہ خاموشی سے اسی جگہ کو تنگ رہی تھی۔ آج وہاں کوئی نہیں تھا جو اس سے کہتا۔ "نہیں ہوں بابا میں تم سے ناراض۔ اب کب تک یہ رولی صورت بنائے رکھو گی؟" اس کے دل نے شدت سے دھماکا لگی کہ کہیں سے بھی وہ آجائے بالکل اچانک۔ وہ آئے اور آکر اسے حیران کر دے۔ اس نے بچھڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہ بارہ کھولیں۔ اس کی دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔ وہاں پر کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے رونے کی کوشش کی مگر اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکلی رہے تھے۔ وہ رونا چاہتی تھی بہت شدت سے اور چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی۔ مگر سولہ سے آنکھوں کے اندر رہتے ہوئے آنسو ایک بار پھر چھلنے سے انکاری ہو گئے تھے۔



"آپ فرست کیوں نہیں آئے؟" ارغشی بھائی؟"

وہ بہت تنگ سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ ہر سال ارغشی اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن لیا کرتا تھا۔ اب کی بار جب وہ پہلی پوزیشن نہیں لے پایا تو سب ہی کو حیران کر دیا تھا۔ مگر کسی نے اس سے کچھ کہا نہیں تھا بلکہ سب نے اس کا حوصلہ بڑھانے اور دل

جوتی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر صبا نے یہ بات برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی کہ ارغشی غصہ نہیں کسی جگہ بارے۔ ارغشی کی کلاس میں دوسری پوزیشن صبا کے لیے لکھی گئی تھی جیسے وہ ٹیبل ہو گیا ہو۔ وہ خود بھی خود زائل ہوا تھا ساتھ اس لیے صبا کا دل بھی لہجے میں کیا جانے والا شکوہ زیادہ ہی شدت سے محسوس ہوا تھا۔

"دیکھا نہیں تھا؟" ارغشی طبیعت غراب تھی ارغشی کی امتحان کے دنوں میں پیرز سے وہ دن پہلے تو سب چارہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آیا تھا اور گھر آکر بھی طبیعت کماں سنبھلی تھی۔ لیکن اتنی باری میں بھی میرا بچہ اٹھنے اچھے کرپڑ کے ساتھ پاس ہوا ہے۔ کلاس میں دوسری پوزیشن لی ہے۔ میرے لیے تو یہی بہت ہے۔ انشاء اللہ اگلے سال ارغشی بھی پہلی پوزیشن لے گا۔ ساری زاریاں اور تمام شیلڈ میرے بیٹے کی ہو گئیں گی۔" کلاس سے ارغشی کی اداس شکل دیکھی نہ گئی تھی۔ جھٹ اس کا سراپا کندھے سے لگاتے ہوئے بہت محبت سے بولی تھیں۔

ایک دن وہ اس صدمے کے زیر اثر رہا مگر پھر اس نے اپنی اس ناگہانی کواصل پر سوار کرنے کے بجائے نارمل انداز میں بھانپا شروع کر دیا تھا۔

"میں نے جیتنے والے کبھی ہار بھی تو جاتے ہیں اب میں نے خلیفہ انداز میں سوچنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ میں کبھی ہار بھی ہو سکتا ہوں۔ ضروری نہیں جب جو میں چاہوں وہ مجھے مل بھی جائے۔ کبھی کبھی میرے بہت چاہنے پر بھی مجھے میری پسندیدہ چیز نہیں مل سکتی اور مجھے اسے نارمل طریقے سے لینا چاہیے۔" اس دن اسکول جاتے ہوئے ارغشی نے یہ بات ظفر سے کہی تھی۔

ابھی اس کی عمر اتنی نہیں تھی جتنا وہ بیسیور ہو گیا تھا۔ پتا نہیں ماں کی کمی نے اسے وقت سے پہلے بیسیور کر دیا تھا یا پھر اس سوچ نے کہ وہ اس گھر کا بڑا بیٹا ہے۔ جو بھی تھا بہر حال وہ اپنی عمر سے زیادہ کچھ دار

اور ہر بار تھا۔ جبکہ صبا اپنے چھپن کے دنوں کو پوری طرح انجوائے کرتی بہت خفیہ بہت شرر بہت ہندی دیکھنے اور اتنی ہی جلدی مان جانے والی بچی تھی۔ وہ ارغشی سے سات سال بھولی تھی۔ مگر ان دنوں کی آئیں میں وہ سنی بہت تھی۔ ان کی پچھپیاں اور مشاغل بھی قریب قریب ایک جیسے تھے۔ کبھی ایسا ہوا کہ ظفر اور ارغشی کے دوست گھر پر کھیلنے آئے ہوتے ہوتے کو زبردستی ان لوگوں کے کھیل میں شامل ہونے کی کوشش کرتی تو ظفر بیٹھ اسے جھڑک کر روکا دیا کرتا۔

"لڑکیاں کرکٹ نہیں کھیلتیں۔ تم چاکر اپنی ڈولر سے کھیلو۔" اپنے سے چھ سال چھوٹی، لیکن کوہہ ذرا کم ہی خاطر میں لایا کرتا تھا۔ وہ صبر سوتے ہوئے ارغشی کی طرف دیکھتی تو وہ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ظفر کو نوکسے ہونے لگتا تھا۔ کھیل میں شامل کر لیا کہ ظفر اور باقی دوست منہ ہاتھ ہونے اس پورے شعلی حکم کو سنا کرتے۔

ارغشی کا اس کے ساتھ بڑا شفقت بھرا دھیرا اور بزرگانہ انداز ہوا کرتا تھا۔ کبھی اگر ظفر کسی بات پر صبا کو سخت لہجے میں کچھ کہتا یا ڈانٹ ڈپٹ کرتا تو ارغشی فوراً اسے ٹوکتا۔

"کبھی وہ پھوٹی سے ظفر لیا ہو گیا، مگر اس نے تمہارا ہٹن لے لیا۔ استعمال کر کے رکھ دے گی واپس۔" وہ اپنی حمایت کرنے پر ارغشی کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھنے لگتی۔

"لیکن صبا بہت بڑی بات ہے بغیر پوچھ کسی کی بات لینا نہیں اگرچہ اچھا لگ رہا تھا اس سے کہنے کا دل چاہ رہا تھا تو تم ظفر سے پوچھ کر لے لیتیں۔"

ظفر کے۔ جانے کے بعد وہ اس کے پاس بیٹھ کر حننت سے سمجھا تا تو وہ اپنی غلط حرکت پر شرمندہ ہوتی آئندہ کسی کی چیز بغیر پوچھنے نہ لینے کا وعدہ کر لیتی۔ ارغشی کے ان ایسی رویوں کے سبب وہ اس سے بہت گریب ہو گئی تھی۔ اپنی ہر بات پر اہم وہ بڑے آرام سے اس

سے باتیں کر لیا کرتی تھی۔ وہ بغیر نوکے بولے سکون سے اس کا ہر مسئلہ سناتا اور پھر اس کا کوئی نہ کوئی حل بھی بتا دیا کرتا۔



وقت کچھ اور آگے بڑھا کر ارغشی اور ظفر اسکول سے نکل کر کالج اور کالج سے یونیورسٹی پہنچ گئے۔ لیکن اس کی ارغشی کے ساتھ دوستی میں کوئی کمی نہ تھی۔ رات کو وہ ارغشی کے کمرے میں گئی۔ وہ اپنی اسٹڈی میں رائلٹنگ ٹیبل پر بیٹھا پڑھنے میں مصروف تھا۔

"آپ بڑی ہیں میں بعد میں آ جاؤں گی۔" وہ اسے مصروف دیکھ کر پلٹے لگی تھی۔

"کیا کوئی خاص مصروف نہیں ہوں۔ بس صرف آج کے لیچر پر ایک نظر ڈال رہا تھا۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے؟" ارغشی نے فائل بند کرتے ہوئے اسے جاننے سے روکا۔

"آپ یونیورسٹی میں جو کچھ پڑھ کر آتے ہیں اسے اسی روز یاد بھی کر لیتے ہیں؟" وہ اس کی کرسی کے سچے پر بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس سے مصروف سوال پر بے اختیار تھکا لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"آپ شے کیوں؟" اسے اس کا ہنسنا برا لگا تو منہ پٹھا کر بولی۔

"بس یونیورسٹی کی ایک بات یاد آگئی تھی۔ ہاں پوچھو، ہمیں کیا پوچھنا ہے۔" وہ ہجرے پر تنبیہ کی لائے ہوئے بولا تو اس نے صحت لینا چرچا کھول لیا۔ "مجھے یونیورسٹی کا یہ Law سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

For every action there is an equal and opposite reaction

(ہر عمل کا مساوی اور متضاد رد عمل ہوتا ہے)

بڑی سیدھی سی بات ہے صبا! خواہ تو انہوں نے اپنا نام کیا ہے۔ یہ بات تو کوئی پتھر کا سا پتھر بھی بتا سکتا

ہے تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں سب سے ایک اور دار تحفہ
 باروں تو تم چوب میں کیا کرو گی؟" وہ خوشی سے
 مسکراتا ہوا بولا۔
 "آپ مجھے کبھی ماری نہیں سکتے۔" اس نے
 فوراً یہ بات سننے سے انکار کر دیا۔
 "مجھے فرض کرو۔" وہ اس کے پر یقین انداز پر
 دھجے سے خند۔
 "مجھے بہت دکھ ہو گیا۔ میں روؤں گی۔" وہ اس کی
 طرف دیکھتے ہوئے مصومت سے بولی۔
 "پلیوروتا بھی ایک وہ عمل ہی ہوا۔ مگر میں یہ کہنا
 چاہ رہا تھا کہ میرے ذریعہ دار تحفہ کے جواب میں تم مجھے
 مجھے اتنے ہی زور سے مجھ پر مارو گی۔" وہ کہتے کہتے کچھ
 صحت کر شرارت سے مسکرایا۔ "اب کچھ اگر ماں کو
 یہ بتا چل جائے کہ ان احوازے ان کی کیا ہوں کون چڑا
 کر کے جا رہا ہے تو وہ اس چور کے ساتھ کیا سلوک
 کریں گی؟ چور کی چوری ایک عمل تھا اور لالہ کی
 جوانی کا رد والی اس عمل کا *Equal and opposite*
 ہی ہو سکتی تھی۔ اپنی اپنی ساری سے کی جانے والی
 چوری پکڑے جانے پر وہ بہت شرمندہ تھی۔
 "بہت مزہ تمہیں چکے چکے کیوں اٹھاتے ہوئے
 دیکھا ہے۔" وہ ہنوز مسکراتا تھا۔
 "آپ کب کب سے کہہ چوری کرنا میری بات ہے۔
 لیکن اگر تھی بھلی! اماں اور ماما مجھے کیوں اور لالی
 کھاتے نہیں دیتیں۔ میری سب دوستیں اتنے مزے
 لے لے کر اہلی اور کیوں کھاتی ہیں۔ میرا بھی دل چاہتا
 ہے۔ ماما کہتی ہیں تمہارا گانا خراب ہو جائے گا۔ اب
 آپ خود بتائیں میں اس طرح چور کر کے کھاؤں تو کیا
 کروں گی؟" وہ معصومانہ انداز میں اپنے عمل کی تائید چاہ
 رہی تھی۔ ساتھ ہی یہ ڈر بھی تھا کہ میں اس کی بھائی
 اماں کو بتا دوں۔ مگر اس کا یہ ڈر غلط ثابت ہوا۔ اس کی
 نے ان سے کچھ بھی نہ کہا تھا۔
 البتہ اسے اتنی اچھی طرح اس حرکت سے منع کیا

تھا کہ وہ فوراً "مان گئی تھی۔" لیکن حقیقت سننا کسی کو بھی
 اچھا نہیں لگتا۔ پھر وہ بارہ سال کی صاحبیت سننا ہے
 پسند کر سکتی تھی۔ لیکن اس کی نصیحت کرنے کا انداز
 اب اچھا ہوا کرتا تھا کہ اسے اس کا نصیحت کرنا اور کسی
 بات پر کچھ سمجھنا بھی بھی برا نہیں لگتا تھا۔
 "مجھپ کر تو ہم وہ کام کرتے ہیں صبا! جس کے
 بارے میں ہمیں پتا ہو گا کہ یہ غلط ہے۔ ماما ہمیں
 اس لیے منع کرتی ہیں کہ پھر اگر تمہارا گانا خراب ہو گیا
 اور تمہارا ہو سکتی تو سب سے زیادہ پریشانی بھی تو ان ہی
 کو ہو گی۔ ویسے بھی تمہارا اس طرح کی چیزیں کھاتے
 میں کوئی حرج بھی نہیں۔ میں ماما سے کہوں گا کہ صبا کو
 کبھی کبھی اس کی پسند کی اوت پناٹک چیزیں کھانے دیا
 کریں۔"
 اس صبح وہ یونورٹھی کے لیے تیار ہو کر بیٹھے تیار تو
 لاؤنج میں اماں اور صبا بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اسکول
 بوفیٹارم پہنچے۔ اماں سے اپنی چوٹی پوچھ رہی تھی۔ اپنے
 لیے ہاؤس سے فلت انجمن ہوئی تھی۔ کئی مزہ وہ ماما
 سے اس بات پر ہنستا کہ کبھی کبھی ماما اور نہ ہی اماں
 دونوں میں سے کوئی بھی اسے پل کھانے کی اجازت
 نہیں دیتا تھا۔
 "بے وقت! لیے ہاؤس میں تو اصل خوب صورتی
 ہوتی ہے۔" وہ اسے سمجھایا کہ جس سے وہ حیران ہوئی کہ
 ان فیصلہ لیے ہاؤس میں اماں اور ماما کو خوب صورتی
 کہاں سے نظر آچکا کرتی تھی۔ اس کے لیے تو یہ خوب
 صورتی وہاں جانے لگی۔
 ماما مصروف تھیں تو اماں کے پاس سے آگئی تھی
 لیکن اسے ان کی بھائی چوٹی پسند نہیں آتی تھی۔ اس
 نے اماں کی بھائی چوٹی کھول دی تھی اور اماں اس کے
 غروں پر حلت برہم نظر آ رہی تھیں۔
 "پیرھائے میں اتنا دم کہاں سے لاؤں کہ تمہاری
 ماں جیسی لگتی ہوئی۔ تمہارے مطلب کی خیر بات
 سکوں۔" وہ دونوں اچھی ہوئی تھیں۔
 "لاؤ صبا! میں بنا دوں۔" اخبار ایک طرف رہے

ہوئے اس کی نے اچانک اپنی نصیحت پیش کی تو اماں
 کے ساتھ ساتھ صبا بھی اس پیش پیش پر بری طرح
 حیران ہوئی۔
 اس میں حیران نہ کی کیا بات ہے۔ ابھی اتنی دیر
 سے میں اماں کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ تو پتا آتا ہے کہ ماما
 ہے۔"
 اماں اصرار غصے کے باوجود بھی اس کی اس کی ان کی
 پیشکش پر ہنسنے لگی تھیں۔ جبکہ وہ اماں کے ہاتھ سے
 برش لے کر اس کی کے پاس آگئی تھی۔ اماں ہنسنے
 ہوئے اس دلچسپ سی چوٹیں کو دیکھ رہی تھیں۔
 اس کی اور صوبے پر برش لیے بیٹھا تھا اور صبا اس کے
 جیروں کے پاس گاہر پڑے۔
 "مجھے لیے بل۔ صبا! تم ان میں کیا باتیں ہو۔ میرا
 مطلب ہے کون سی گھار؟" وہ اس کے گھنے ہاؤس کو
 حتمی حصول میں تقیر کرتے ہوئے غصہ سے بولا۔ وہ
 ابھی جواب دینے کے لیے لب کو لے ہی والی تھی کہ
 اچانک ایک اور دروازہ اس کے حلق سے نکلے۔
 "کیا ہوا؟" اس کی اس کے دھجے پر حیران ہو گیا۔
 "اتنے زور سے میرے ہاؤس کو بھیجتا ہے اور پھر
 پوچھ رہے ہیں کیا ہوا۔" اس نے کڑن موڑ کر شکایتی
 انداز میں کہا۔
 "ابھی تم خود ہی تو اماں سے کہہ رہی تھیں کہ ہاتھ
 پائت ہی چوٹی نہ لگیں۔"
 "ہاں لیکن یہ تھوڑی کھاتا تھا کہ ہاؤس کو جڑ سے ہی
 اکھاڑ دیں۔" وہ خواب "نہار تھی سے بولی۔
 "آپ ٹھیک ہے؟ اب تو تکلیف نہیں ہو رہی؟"
 اس نے ہاؤس کو ذرا ہلکے ہاتھ سے پکڑتے چوٹی میں پکڑا
 لی لائے ہوئے پوچھ لیا کہ تھی میں کڑن ملا دی۔
 "نہار تھی کیا ہو رہا ہے؟" لاؤنج میں آتا ہوا ظفر
 اس حیرت انگیز منظر کو دیکھ کر رو رہے ہی چلا یا۔
 "صبا کو اماں کے ہاتھ کی چوٹی پسند نہیں آ رہی تھی
 اس لیے۔"
 "اس لیے تم نے صبا کے ہتھوڑا ٹھٹھکی کی ڈیوٹی

سنبھال لی۔" ظفر نے اس کا جملہ کاٹتے ہوئے برہنہ
 کہا۔
 "بات کرنا ہاؤس میں آج پایا ہے۔ کون کا؟" وہ
 لائق اکلوتے بیٹے کی تعلیم پر اتنا پیسہ خرچ کر رہے ہیں۔
 وہ سو صوف تو مستقبل میں چوٹی سیلون کھولنے کا ارادہ
 رکھتے ہیں۔" اس کی اس کے مذاق اڑانے پر راما نے
 بغیر اپنے کام میں مشغول رہا۔
 "تھوڑی دیر اس کی بھائی! اتنی اچھی طرح مس کر
 چوٹی بات تھی ہے آپ نے اب سارا دن میرا آرام سے
 گزار جائے گا۔" اس کی نے سات آٹھ مل دے کر
 ہاں اس کے حوالے کیے تو وہ جلدی جلدی چوٹی میں مل
 ڈالنے ہوئے بولی۔
 "آپ تو میں روزانہ آپ سے ہی چوٹی بنوایا کروں
 گی۔" اپنی کمر سے بھی لے آئی ہوئی چوٹی کو ہنسنے لگے
 ہوئے اعلان کیا تو اس کی کا ہاتھ لگاتے ہوئے
 بولا۔

زی ٹی وی کا مشہور پروگرام

کھانا خزانہ

نیا ایڈیشن
 سنجیو کپور
 خوبصورت تصاویر کے ساتھ
 حسین و خوبصورت گیٹ اپ
 قیمت صرف = 250/- روپے
 ملے کا پتا:
 مکتبہ عمران ڈائجسٹ
 37 اردو بازار، کراچی

”میں باپاں! آج کے لیے سو رہی۔“
 ”اور اپنے نچلے کا مظاہرہ کرو ان محترمہ کے
 سامنے اب شش کی ہے کہ یہ بلا تھرا اور چھوڑ
 دے۔“ وہ اپنے لیے ”بلا“ کا لفظ سنتے ہی غصے سے
 لڑنے مرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ یونہی لڑتے جھگڑتے وہ
 لوگ ٹانھتے گئے ڈانٹنگ روم میں آگئے۔
 ”تو تو ہماری ممانعت ہی صبح بڑی خوش نظر آ رہی
 ہے۔“ ظفر نے پتا نہیں کس بات سے یہ اندازہ لگایا
 تھا۔
 ”بہت صحیح اندازہ لگایا ہے آپ نے پروردار۔“
 ڈیڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”اس کا رات فون آیا تھا۔ وہ لوگ اگلے سنے
 پاکستان آرہے ہیں۔“ ڈیڈی نے اب کی بار اماں کو
 مخاطب کیا تھا۔ تمہاری بے تحاشا خوشی کا سبب صبا
 سمیت سب ہی کی فورا“ سمجھ میں آیا تھا۔
 ”اس ماموں آرہے ہیں یعنی کہ شہزادہ پاکستان آ رہی
 ہے۔“ اس نے دل میں بے حد خوشی محسوس کرتے
 ہوئے سوچا تھا۔ سال ڈیڑھ سال میں وہ لوگ پاکستان کا
 ایک جکر ضرور لگایا کرتے تھے۔ شہنشاہ اس گھر کے ہر فرد
 کے لیے بہت زیادہ اہم تھی۔ مگر ماما اور ڈیڈی کے لیے
 وہ بلی سب لوگوں سے کچھ زیادہ اہم تھی اور وہ اہم کیوں
 نہ ہوئی۔ وہ شفیق علی اور بلور شفیق کی سہیلی بنی تھی۔
 اولاد کوئی ہفتے والی چیز نہیں مگر بعض اوقات حالات
 اور واقعات ایسا رخ اختیار کرتے ہیں کہ انسان کو بہت
 سے کام چل نہ چاہے ہوئے بھی کرنے پڑ جاتے ہیں۔
 بلور شفیق کے لیے ان کا پرانا بھائی صرف بھائی ہی
 نہیں بلکہ باپ کی طرح تھا۔ جس نے بل باپ کے
 مرنے کے بعد بہن کا ہر طرح خیال رکھا۔ اسے کبھی
 ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اور پھر جب
 بہن کی شادی کا وقت آیا تو اس کے لیے ایک بہترین
 گھر لے کر اور بہترین شریک۔ مگر کا انتخاب کر کے اپنے
 سب فرائض بہت احسن طریقے سے ادا کر دیے۔
 شفیق علی اس کے بہت فرحی دوست تھے۔ جتنی بہن
 کی شادی اپنے عزیز ترین دوست سے کر کے انہوں

نے دوستی کے تعلق کو رشتہ داری میں بدل کر اسے مزہ
 مضبور کر لیا تھا۔ خدائے علیہ کو جتنا اچھا بھلا دیا تھا
 اتنی ہی اچھی بھابھی بھی دی تھی۔ ہر کسی کے دکھ درد
 میں کلم آتے والی بڑی ملسار اور خوش مزاج مگر بہت
 رب کی اس میں کیا مصلحت تھی کہ وہ دونوں محبت
 کرنے اور محبت بانٹنے والے لوگ اولاد کی نعمت سے
 محروم تھے۔ کوئی امید ہو تو انسان دعا میں آگئے۔ پھر
 کا انتظار کرے۔ وہاں تو کوئی امید بھی نہ تھی۔
 پہلی پرکاشنی میں ہی کچھ ایسی وحید کی ہوئی تھی کہ
 اب وہ دوبارہ بھی ماں نہیں بن سکتی تھیں۔ یہ بہت بڑا
 صدمہ تھا۔ ان کی برداشت اور غصے سے بھی بڑا۔ وہ
 ہر وقت روتی رہتیں۔ شوہر کی تسلیاں دلا سے سب
 انہیں بے معنی لگا کرتے۔ ان کی حالت دیکھتے ہوئے
 ڈاکٹرز نے اس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ کوئی بچہ گوہر
 لیں۔ انہیں خود بھی اولاد کی بہت خواہش تھی۔ بڑی
 سے بھی بہت محبت تھی مگر اس سب کے باوجود بھی
 کسی پر اسے بچے کو اپنا بچہ بنانے کے لیے وہ کسی طور
 راضی نہ ہوتے تھے۔ بلور بھائی اور بھابھی کے اس تم
 پر بہت دھکی ہوئی تھی۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ
 کس طرح وہ اپنے جان سے پیارے بھائی کی زندگی
 سے اس کی کوہر کر دیں اور اپنے ہی ایک جذباتی سے
 لیسے میں وہ بھابھی سے یہ وعدہ کر بیٹھی تھیں کہ بس بار
 ان کے ماں بنایا جائی جو بھی ہو وہ اسے ان کی گوہر میں
 ڈال دیں گی۔
 شہنشاہ کے پیدا ہونے پر جب بھابھی انہیں لن کا وعدہ
 یا د دلانے آئیں تو ان کا دل اندر ہی اندر کانپ کر رہ گیا۔
 ”تمہارے پاس تو ظفر سے بلور! تمہارا بیٹا! اور اس
 کے بعد بھی تمہارے دل میں کتنی ہو جبکہ میرے پاس تو
 ایسی کوئی امید ہی نہیں ہے۔ کسی اور کے بچے کو اس
 کبھی گوہر لینے پر راضی نہیں ہوں گے۔ شہنشاہ کی
 بھانجی ہے۔ ان کا خون۔ اسے تو وہ دل و جان سے قبول
 کریں گے تم مجھے خود غرض سمجھ لو یا جو بھی ہے۔ بس شہن
 مجھے دے دو۔“ وہ بلور کے چہرے پر نظر آتے انکار کو
 دیکھ کر دھتے ہوئے بولی تھیں۔ وہ انور گزرتا صرف

بلور ہی کا نہیں بلکہ شفیق بھائی بھی موم کر گیا تھا۔
 دل پر بہت بھاری پھر کہ کر بلور نے اپنے بھائی باپ
 جیسے بھائی کے اور شفیق نے اپنے عزیز ترین دوست
 کے پیدا کر دی تھی۔ شہنشاہ کی بھی جب اس
 کو آسٹریا میں ایک بہت اچھی باب آکر ہوئی اور وہاں
 وہ لوگ سفلی چلے گئے۔ شہنشاہ بہت خوش تھی۔ وہ
 جب یہاں آئی تو بالکل مسماں کی طرح ان لوگوں سے
 الگ تھلک رہا کرتی کہ شہنشاہ کے دو سال بعد ہی اللہ
 نے ان کی بھوٹی میں صاڈال دی تھی۔ ظفر اور صبا کے
 ہونے کے باوجود ماما اور ڈیڈی بہن کی کمی بہت شدت
 سے محسوس کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی بلور کا دل چاہتا کہ
 وہ بھائی سے اپنی بیوی واپس مانگ لیں۔ مالا مال وہ لوگ
 اسے کتنے بازو تم میں پال رہے تھے۔ جہاں وہ قدم
 رکھتی ان دونوں کا بس نہیں چلتا تھا۔ اپنا دل رکھ دیں۔
 اس نے چھ سال کی عمر میں ہی یہ بات شہنشاہ کو بتادی
 تھی کہ وہ اس کے بہنوں سمیت ہی یہ بات شہنشاہ کے اس کے
 کے ماں باپ وہ ہیں جنہوں سے وہ لوگ ہر سال ملنے
 پاکستان جاتے ہیں۔ اور انہی کے ساتھ ساتھ ظفر اور صبا
 بھی اس کے لیے گزرتی ہیں۔ شہنشاہ نے کتنے تھے۔ صبا نے
 اپنی بہن کے لیے ہمیشہ ہی دل میں بہت شدید محبت
 محسوس کی تھی۔



شہنشاہ اس ماموں اور مہلی کے ساتھ کراچی بھی
 تھی۔ اس کا آنا یہاں سب کے لیے کچھ ایسا تھا جیسے
 کسی دور ویکس کی شہزادی نے ان کے گھر میں قدم رکھ
 دیا ہو۔ ماما اور ڈیڈی کے ساتھ ساتھ اماں بابا اور صبا
 کے لیے بھی وہ بڑی خاص شخصیت کا وجود رہا۔ کبھی
 تھی۔ یعنی اپنا بہت کا انصاریہ لوگ کر رہے تھے۔ شہن
 ہوا جس میں وہی اپنا بہت کا انصاریہ نہیں کر رہی تھی۔ وہ
 شاید کبھی ہی بہت کم گو اس کا کھنچا کھنچا سا انداز دل کر
 اور انہی اور ظفر بھی اس سے زیادہ بات چیت نہیں کر
 تے تھے۔ صبا کا البتہ بڑا دل چاہتا تھا کہ وہ شہنشاہ کے
 ساتھ خوب ماموں یا شہنشاہ کرے۔ اسنے فاصلوں اور

دوری نے ان کے درمیان بے تکلفی اور اپنائیت پیدا
 نہیں ہونے دی تھی۔ بلکہ ان کا آپس میں جو رشتہ تھا
 وہ تو ایک اٹل حقیقت تھی۔
 ”صرف لڑائی جھگڑوں میں ہی چیز ہے ہماری صبا یا
 پر بھائی میں بھی کچھ کارنامے انجام دے رہی ہے۔“
 اس روز کھانے کی میز پر اس ماموں نے اس سے
 پوچھا۔ ظفر کے ساتھ ہونے والے اس کے مہر کوں
 اور بھائی ماں کے شفیق کی طرح بھائی ہوئی زبان کو دیکھ
 کر خالہ ماموں نے یہ سوال کیا تھا۔
 ”صبا شفیق ہر کلم میں اچھی ہے ماموں!۔“ اس نے
 فرحی انداز میں جواب دیا۔ اس ماموں اس کے جواب
 پر ہنستے ہوئے ظفر اور انہی سے بھی ان کی بھائی کے
 بارے میں پاشیں کرنے لگے تھے۔ ماما ان لوگوں کی
 باتوں سے نا تعلق شہنشاہ کے لڑا اٹھانے میں مصروف
 تھیں۔ اصرار کر کر کے وہ مختلف دفتر اس کے آگے
 رکھ رہی تھیں۔ سارا سال وہ ان دونوں کا انتظار کرتی
 تھیں جب شہنشاہ کے پاس ہوتی تھی۔ یہ تھوڑے
 سے دلن تھی جلدی گزرتے تھے اور اب کی بار تو ان
 لوگوں کا قیام بہت سے بھی زیادہ مختصر تھا کیونکہ شہنشاہ کی
 خواہش پر اس ماموں اسے مہر کھانے لے جا رہے
 تھے۔ چند دن کراچی میں گزار کر ان لوگوں کو قاپوہ جانا
 تھا۔
 شہنشاہ نے صبا کو بتایا تھا کہ اس نے اپنی ہسٹری کی
 کتاب میں مہر کے بارے میں کئی کچھ پڑھا ہے اور
 اسی وجہ سے اسے وہاں جانے کا بہت شوق ہے۔ اس
 نے حسرت سے شہنشاہ کی طرف دیکھا۔ ”صرف چھ
 سال کی عمر میں پتا نہیں اس نے کیا کیا بڑھ ڈالا تھا۔ کم از
 کم صبا کو تو ہسٹری میں قطعاً لکھنی چاہی تھیں تھی۔“
 اس ماموں سے باتوں کے دوران ہی پپا نے یہ
 انکشاف کر کے کہ وہ انہی کو آئرز کے بعد مزید تعلیم
 کے لیے لندن بھیجے گا اور وہ کہتے ہیں صبا کے اوسان
 خطا کر دیے تھے۔ ایسی کوئی بات اس سے پہلے تو اس
 کے علم میں کبھی نہیں آئی تھی۔ اور انہی کا انور بھی ایسا
 تھا جیسے وہ اس بات سے پہلے سے باخبر تھا اور یہی ہے

مرد خوش بھی ہو کھانے کے بعد اس کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں آگئی۔
 ”آپ نے بھی مجھے بتایا بھی نہیں کہ بابا آپ کو پڑھنے کے لیے باہر بھیجے والے ہیں۔“ وہ اندر آئے ہی شکاری انداز میں بولی۔
 ”اس بارے میں پہلے سے کیا شور مچاتا۔ اس ایک روز بابا نے پوچھا کہ کیا تم لندن جا کر پڑھنے میں لگے ہو اور میں نے ہل کر دی اور پھر سب اچھی تو میرے ہانے میں بہت وقت گزارا ہے۔“ اس نے حسب معمول بڑی نرمی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔
 ”آپ مت جائیں ناں ارٹھی بھائی آپا ستن میں رہ کر بھی تو پڑھائی کی جا سکتی ہے۔“ وہ اس کے بچکانہ سے اصرار پر آگئی سے نہلا۔
 ”ابھی تو اس سب میں بہت دن پڑے ہیں۔ تم کہیں بلاوجہ اس بات کو مزید سوار کر رہی ہو۔ جاؤ جا کر شرم کو لکھنی دو۔“ وہ اتنی دیر سے تم سے ملنے آئی ہے۔“
 ارٹھی نے رسائی سے کہا وہ ارٹھی کے سمجھانے پر وقتی طور پر ہل گئی تھی۔ دوسرے یہ بات بھی ذہن میں تھی کہ جب جانے کا وقت آئے گا تو میں انہیں جانے میں دوں گی۔ یہ پیش کی طرح شرم تھوڑے سے دن نہ کر واپس چلی گئی۔ کتنے دنوں تک ممانیات یہ بات اس کا ذکر کر کے روٹی رہی تھیں۔



”ابھی تو تم یہاں ہو۔ میں سارے گھر میں جھیس ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔“ ظفر نے کچن میں آتے ہوئے ارٹھی کو مخاطب کیا تھا۔
 ”ہاں میں اور سوال کر رہی تھیں کیا ہے۔“
 ”ابھی تم بھی اتنی ساری دھم دھم کر رہے ہیں۔ کیا یاد کرو گے تم بھی۔“ اس نے سر کھٹا کر ظفر سے کہا۔
 ”سو ٹھیک کے لیے نہیں چل رہے؟ میں تو جھیس اسی لیے ڈھونڈ رہا تھا۔“ ظفر اور ارٹھی اکثر سو ٹھیک کے لیے شام میں ایک ساتھ ہی جایا کرتے تھے۔

”مبوتو تھا میرا جانے کا۔ لیکن اب صبا سے بہن ایک ہفتے کا وعدہ کر لیا ہے تو وعدہ پورا بھی کرنا پڑے گا۔“ وہ خاموشی سے کھڑی ارٹھی اور ظفر کی گفتگو سن رہی تھی۔ ظفر اس کے انکار پر کندھے کا کانٹا نہیں سے باہر چلا گیا اور وہ دونوں ایک مرتبہ پھر پکڑ لیا۔ ایک ہفتے میں مصروف ہو گئے تھے۔
 اسے خود تو چھتا نہیں آتا تھا وہ تو بس ارٹھی کو کھلم کرتے ہوئے دیکھتے جا رہی تھی اور خود ارٹھی انہیں پر دور ڈال کر ”آپ کیا کرنا ہے؟“ اور ”کیا والا ہے؟“ کا دوہرے جا رہا تھا۔ بڑی کوششوں اور جان توڑ محنت کے باوجود بھی وہ چیز تیار ہوتی تھی اسے بہن ایک کے علاوہ سب کچھ کما کما جاتا تھا۔ وہ خود ہی اپنے ہانے ہوئے اس بجوبے کا مذاق اڑاتے اور منہ بنا کر اسے کھانے میں بیٹھ بیٹھ تھا۔ صبا بہن ایک کے بارے میں اس کے دلچسپ جھوٹوں کو انجوائے کر رہی تھی۔
 ارٹھی اکثر بونور پٹی سے سیدھا بابا اور ڈیڑی کے پاس آکر چلا جایا کرتا تھا۔ بابا چاہتے تھے کہ وہ شرم تعلیم ہی ارٹھی بڑنس کے آثار چھوڑے اور عملی زندگی کی دشواریوں سے آگاہ ہو جائے اور انہیں حل کرنا بھی سکھ جائے۔ چاہتے تو وہ یہ تھے کہ ظفر بھی ارٹھی ہی کی طرح آفس آیا کرے لیکن ظفر کو بڑنس میں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ فزکس میں آکر ڈگریا تھا اور اپنے متعلقہ مضمون کے علاوہ کچھ اور بھی دیکھی نہیں تھی۔ بابا اور ڈیڑی دونوں ہی بچوں پر روک ٹوک اور پابندیاں لگانے کے خلاف تھے۔ ڈیڑی کی کتنی شدید خواہش تھی کہ ظفر اہل۔ اسے کمرے لیکن جب اس نے فزکس میں ماسٹر کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے اسے خوشی خوشی اجازت دے دی۔
 ارٹھی کا آئرا عمل ہوتے ہی بابا نے اس کے لندن جانے کے تمام انتظامات عمل کر دیے تھے۔ وہ لندن اسکول آف اکنامکس London school of economics کے لیے انٹرنکس میں M.S.C کرنے جا رہا تھا۔
 صبا اس کے جانے کا سن کر مت روٹی تھی۔ وہ اسے

روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔
 ”آپ مت جائیں ارٹھی بھائی آپ پہلے گئے تو پھر مجھے جیسے کون پڑھانے کا اور سڑی میں جواتی ساری ڈیڑی یاد کر لیں پڑی ہیں وہ کون یاد کروائے گا۔“ وہ ارٹھی کا ہاتھ پکڑ کر ملتانیانہ لہجے میں بولی۔ اس وقت لاٹونج میں ملاں ”مما اور ظفر بھی موجود تھے۔
 ارٹھی اس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھ کر بدکاری سے سمجھانے لگا۔
 ”میں پر اس نے کر چڑوں کا ظفر سے وہ جھیس ڈالنے کا بھی نہیں اور پر ملاں میں پہلے ہی کیا کرے گا۔“ مگر وہ اس کی کوئی بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔
 ”اور صبا میں کوئی ہمت کے لیے تھوڑی جا رہا ہوں۔ تم دیکھنا اچھی جلدی دو سال گزریں گے اور میں واپس تم لوگوں کے پاس آجاؤں گا۔“ وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے یقین دلانے لگا۔
 ”ہاں اگر وہاں کسی سیم نے انہیں اپنے پیٹھ میں نہ پھنسا لیا تو۔“ ظفر نے بڑی برحسب سے کہنے ہوئے ایک نظر ملاں کے چہرے پر ڈالا۔
 ”میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔“ ملاں نے بڑے یقین اور اطمینان سے کہا تھا۔ ”یعنی یہ سب ہے کہ آپ جائیں گے ضرور۔ میرے روکنے سے بھی نہیں دیکھیں گے۔“ وہ گفتگو کا موضوع تبدیل ہو تا دیکھ کر چڑ پڑے بہن سے بولی۔ ارٹھی نے بڑی بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے تارا ہی کہتے تھے جانا چاہتا تھا۔ اس وقت بھی اس کا ہاتھ تھامے ”آنکھوں میں آنسو اور ناراضگی لیے بیٹھی تھی۔
 ”صبا! کیا تم سارا مل نہیں چاہتا کہ تمہارے ارٹھی بھائی خوب سارا پڑھیں؟“ ”ممانے اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے پیار سے پوچھا۔
 ”ہاں تو چاہتا ہے ممانے۔“ لیکن ممانے اس کی بات مکمل نہیں ہوسکتی تھی۔
 ”اگر ممانے نہیں بھیجی بھی اپنے بہن پر تو کون ان کی سڑی اور قاعدے کے لیے خود سے ذرا بھیجنا پڑا

ہے۔“ مگر جھیس ارٹھی سے پیار سے تو پھر نہیں اسے خوشی خوشی رخصت کرنا ہو گا۔“ ارٹھی نے تفکر آمیز نظروں سے ممانی طرف دیکھا تھا۔ اپنی اس تھو سال کی ٹٹ کھٹ اور خندنی کی کزن کو جو بات وہ نہیں سمجھا رہا تھا وہ ممانے سمجھوتی تھی۔
 ایئر پورٹ پر جب وہ سب لوگ ارٹھی کو الوداع کہنے آئے تو وہ پکلیں جھپکا جھپکا کر اپنے آنسو روک رہی تھی۔
 ”میں جھیس باندی سے خط لکھا کروں گا صبا اور فون بھی بہت جلدی جلدی کیا کروں گا۔ باقی پکا پر اس کر رہا ہوں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر محبت بھرے انداز میں بولا۔
 ”آپ وہاں پر بھی ہمیشہ فرسٹ پوزیشن لیا کیجئے گا ارٹھی بھائی! آجیے یہاں پر لیتے تھے۔“ اس کی آنکھوں سے ایک دم ہی آنسو برتا شروع ہو گئے تھے۔ اسے رو تا دیکھ کر ملاں کو بھی روکنے کا ہاتھ مل گیا تھا۔
 ”کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو۔“ وہ جنگ لڑنے تو نہیں جا رہا۔ بجائے مٹی خوشی اسے رخصت کرنے کے آپ لوگ آنسوؤں کے ساتھ رخصت کر رہے ہیں۔“ ڈیڑی نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 پھر وہ چلا گیا تو جیسے اپنے ساتھ ساری رونقیں بھی لے گیا۔ وہ دن میں کتنی مرتبہ اسے یاد کر کے رویا کرتی تھی۔ بڑے بڑے یقین اور کوئی چیز سمجھ میں نہ آتی تو جھٹ رونا شروع کر دیا کرتی۔ حالانکہ ارٹھی کے جانے کے بعد ظفر اس کا بہت خیال رکھنے لگا تھا۔ پانٹ ٹیٹ اور پلاٹی جھگڑا بھی بہت کم کر رہا تھا۔ لیکن ارٹھی کی کمی تو کوئی بھی پوری کر ہی نہیں سکتا تھا۔ فون پر ارٹھی سے زیادہ اطمینانی بات نہیں ہو پاتی تھی لیکن وہ اسے خط خوب لباچ رہا تھا۔ لکھا کرتی تھی۔ ظفر اس کے خطوط کی سبلی پڑاؤ کا بہت مذاق اڑاتا تھا۔
 اس رات وہ ارٹھی کو خط لکھتے بیٹھی تھی۔ دھیر ساری باتوں کے بعد جب اس نے ہمیشہ کی طرح خط کے اختتام میں پہنچے تھے۔
 ”ارٹھی بھائی! میں آپ کو بہت مرس کرتی ہوں۔“

بے طرح رویا کرتی تھی۔ لیکن اپنے کمرے میں سب سے چھپ کر۔ اب جب وہ اسے یاد کر کے روتی تو اس کا دل چاہتا کہ کسی اور کو اس کے رونے کا پتہ نہ چلے۔
ار تفضی کا ایم ایس سی کا پہلا سال مکمل ہو گیا تھا۔ بابا نے اس سے چھٹیوں میں پاکستان آنے کے لیے کہا سب ہی کا اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کا بہت دل چاہ رہا تھا۔

لیکن ار تفضی نے اگلی فون کال پر اماں اور بابا سے اپنے دوستوں کے ساتھ آسٹریلیا جانے کی اجازت مانگنی تھی۔ اماں اور بابا دونوں ہی نے اسے فوراً اجازت دے دی۔

”اسٹوڈنٹ لائف کی یہ بے فکری پھر اسے کہاں ملے گی۔ اچھا ہے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ زندگی کی خوب صورتیوں کو انجوائے کرے۔ ہمارے پاس تو پھر اسے ہمیشہ ہی رہنا ہے۔“ بابا نے فون رکھنے کے بعد ڈیڈی کو ساری بات بتاتے ہوئے کہا۔

اسے ار تفضی کے نہ آنے کا سن اتنا دکھ ہوا تھا کہ وہ اس رات کتنی دیر تک تکیے میں منہ چھپائے روتی رہی تھی۔ وہ ار تفضی سے بری طرح ناراض ہو گئی تھی۔ ار تفضی آسٹریلیا میں اپنے دوستوں کے ساتھ چھٹیاں انجوائے کرنے کے بعد واپس لندن آ گیا اور واپس آ کر اس نے گھر پر سب سے فون پر بات کی تو اس نے بات نہیں کی۔

”تم بات نہیں کرو گی؟“ ظفر نے اسے صوفے پر الگ تھلگ سے انداز میں بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر سامنے پڑا میگزین اٹھا لیا تھا۔ لیکن وہ اپنی یہ خود ساختہ ناراضی زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ پائی تھی۔ اس روز اماں نے ار تفضی کو فون کیا تو ان کے بات ختم کر لینے کے بعد اس نے ریسیوران کے ہاتھ سے لے لیا۔

”کیا سڈنی کا ساحل کراچی کے ساحل سے زیادہ خوب صورت ہے؟“ سلام دعا کے فوراً بعد اس نے روٹھے لہجے میں شکوہ کیا تھا۔

”ہاں خوب صورت تو ہے۔“ وہ اس کا شکوہ سمجھنے

مجھے آپ کے بغیر گھر میں بالکل مزا نہیں آتا۔ آپ بس جلدی سے واپس آجائیں۔“ لکھتے کے ساتھ ہی اسے پتا نہیں کیوں خود ہی اپنے لکھے ہوئے جملوں پر اعتراض ہوا۔ اس نے وہ پورا صفحہ پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا، لیکن وہ خود ہی اپنی اس حرکت پر بہت حیران تھی۔

اپنے لکھے جملوں میں آخر اسے کیا بات نامناسب لگی تھی، جو اس نے اسے کاٹ دیا۔ وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھی اور مسلسل اپنے آپ پر حیران ہوئے جا رہی تھی۔ اپنے رویے کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے خود اپنے بارے میں بعض ایسی باتیں پتا چلیں جن پر ابھی تک اس نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ ار تفضی کا فون آنے پر اس سے بہت سنبھل کر اور سوچ سمجھ کر باتیں کرنے لگی تھی۔ پہلے کی طرح بے دھڑک اور بے جھجک اپنے دل میں موجود ہر بات نہیں کہتی تھی۔ اس کے فون کا اسے پہلے ہی کی طرح بڑی بے چینی سے انتظار رہا کرتا تھا۔ اس کے خطوط کا وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے انتظار کرنے لگی تھی۔ دن میں کئی کئی مرتبہ جا کر لیٹر بکس چیک کرتی کہ اس کا خط آیا یا نہیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں اب وہ اس سے پہلے جیسی بے تکلفی سے بات نہیں کر پاتی تھی۔ ار تفضی کا انداز تو پہلے جیسا ہی ہوا کرتا تھا لیکن صبر و ضبط اب شاید بڑی ہو گئی تھی۔ یہ اس کا اسکول میں آخری سال تھا۔

جب اسے ار تفضی سے جھجک محسوس ہونی شروع ہوئی تھی وہ اب گھر والوں کے سامنے بھی اس کا ذکر سوچ سمجھ کر کرنے لگی تھی۔ پتا نہیں ار تفضی نے اس تبدیلی کو محسوس کیا تھا یا نہیں مگر خود اس نے تو اپنی اس تبدیلی کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ اب وہ خود پر حیران ہوتی تھی کہ کیسے ار تفضی کے جانے پر اس نے ننھے بچوں کی طرح رونادھونا مچایا تھا۔ وہ اب بھی اسے پہلے کی طرح شدت سے یاد آتا تھا۔ اب تو وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اب بھی اسے پہلے کی طرح شدت سے یاد آتا تھا، وہ اب بھی اسے یاد کر کے

کے پلندہ و خبیثی کی ہے ہوا۔ وہ مذاق بھی بڑی خبیثی کی کے ساتھ کیا کرتا تھا۔

”وہاں کی ہر چیز خوب صورت ہے۔ وہاں کے ساحل وہاں کا قدرتی حسن وہاں کی تپ و ہوا۔“ وہ اس کے بچے کی شرارت سے بچنے کی بات بھی۔ اسی لیے اس بات پر اپنے دل میں مزید کچھ محسوس کیا۔

”اچھی ساری خوب صورتیوں کے باوجود مجھے وہاں خوب صورتی نظر نہیں آ رہی تھی اس لیے کہ وہاں صبا شیفین نہیں تھی۔“ ایک سیکنڈ کا ڈرامائی وقفہ دے کر اس نے ہنسنے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

”اگر آپ آجائے تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ وہاں دوں بعد سب گھروا لے آئیں گے جو تہنا کر آئے۔“

”کچھ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ لیکن یاد رکھیے کھار دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کا بھی تو دل چاہتا ہے نا اور پتا ہے جس میں وہاں کس کس انگلی کے گھر بھی کیا تھا۔ ممانے خاص طور پر تاکید کی گئی کہ سفلی جارہے ہو تو اس انگلی کے گھر بھی ضرور جائے۔“ وہ اس بات سے پہلے سے ہی واقف تھی۔

”بھگن کبھی ہے ارٹھی بھائی؟“ وہ اپنی سب ناراضیاں صوبل کر شمس کے بارے میں پوچھنے لگی۔

”بھگن بالکل ٹھیک ہے اور تمہیں ایک مرتبہ کی بات چاہوں صبا! ہم لوگ شمس کو جتنا دیر اور کم کو سمجھتے ہیں وہ ایسی ہے نہیں۔ بہت زیادہ باتوں تو خیر وہ نہیں ہے لیکن جس طرح وہاں آکر خاموش خاموش رہتی ہے ایسی بھی نہیں ہے۔ مجھ سے اس نے کافی ساری باتیں کی تھیں۔ انگلی اور آئی کے ساتھ شمس نے بھی بہت اچھی طرح میری پہچان لی۔“ وہ صبا کی بھی خیریت پوچھ رہی تھی۔

”کچھ رہی تھی کہ کیا صبا ابھی بھی ظفر بھائی کے ساتھ جھگڑتی ہے اور کیا بیڑیاں چڑھتے اترتے وقت وہ ابھی بھی تین تین اسپیس ایک ساتھ پھلاکتی ہے؟“ وہ ہنسنے ہوئے اسے شمس کے بارے میں بتا رہا تھا۔ صبا بھی بے اختیار کھنکھلا کر ہنس پڑی۔

ارٹھی کا نام اس ہی مکمل ہو گیا تھا اس کی آواز اسٹینڈنگ ٹاکر کوئی کو سب سنا رہی تھی۔ لیکن صبا کی خوشی و مسرتوں سے کچھ بڑھ کر تھی۔ ارٹھی نے کانویشن کی آواز پر ان لوگوں کو بھیجیں تو وہاں شمس و کچھ کر اور زیادہ خوش ہوئی تھی۔ لیکن اسکولی آگ آگناکس کا مخصوص گھوٹا بننے کا تہا بند نہ لگا رہا تھا۔ اس کے چہرے کی فحش مسکراہٹ صبا کے چہرے پر بھی غراؤ تھا۔

”تم خوش ہو صبا؟“ ارٹھی نے فون پر اس سے پوچھا۔ وہ فی الحال پاکستان نہیں آ رہا تھا۔ اپنے سرکار کے ساتھ مل کر وہ کسی دوسرے جگہ پر مصروف تھا۔

چھ مہینے پہلے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ شمس بہت خوش ہوئی ارٹھی بھائی! میرا دل چاہتا ہے آپ ہر جگہ جیتیں۔ کبھی بھی کسی جگہ آپ نہیں ہوں۔“ اس نے بڑی چلائی سے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

ارٹھی کی کراچی واپسی اس کے لیے کیا معنی رکھتی تھی یہ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ بے پناہ خوش تھی۔ اسے ساری دنیا اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی خوشی سب گھروالوں کو نظر آ رہی تھی۔

”وہاں یہ یہ لڑکی ارٹھی کے بچھے۔“ اس نے اس کی بے تحاشا خوشی پر تبصرہ کیا تو ظفر اسے چڑا دیا۔

”وہاں نہیں بلکہ یہ ارٹھی کی چچی ہے لانا! دیکھیں گے بھائی کو کھاس نہیں ڈالتی اور ارٹھی بھائی کا رنگ لاپے جاتی ہے حالانکہ اس نے ارٹھی کو گھر والوں کے سامنے اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار بالکل نہیں کیا تھا۔“

”صبا! یہ صبا تو پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہو گئی ہے۔“ ارٹھی نے اسے دیکھتے ہی سب کے سامنے ممانے سے بات کہی تھی۔ اپنی اس تعریف پر خوشی کے ساتھ ساتھ اسے ارٹھی سے عجیب سی شرم بھی محسوس ہوئی تھی۔

”صبا تو واقعی بڑی ہو گئی ہے۔“ اور وہ شرمیلی

شرمیلی سی اس سے کچھ واسطے پر بیٹھ کر اسے اپنی پڑھائی کی مصروفیات کے بارے میں بتانے لگی۔

وہ چار روز آرام کرنے اور اپنے دوستوں اور قریبی رشتے داروں سے ملنے ملانے کے بعد ارٹھی نے باقاعدہ طور پر شمس چنا شروع کر دیا تھا۔

وہ صبح کا آٹھ بجے تھا۔ صبا سات سات سات سے بچے سے پہلے گھر واپس نہیں آتا تھا۔

گھر کے تمام افراد کے ساتھ اس کا وہ بالکل دیرپا تھا جیسا لندن جانے سے پہلے تھا۔ وہ اہل کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر ان کے پسندیدہ گھریلو موضوعات پر بغیر پور ہوئے گفتگو کر لیا کرتا تھا۔ ممانے کے ساتھ بھی اس کی باتیں جیسی ہی ہوتی تھیں۔ ظفر کو اس نے کزن سے بھی بڑھ کر بیش و مست کا درجہ دیا تھا۔ وہ کبھی بھی اس کا سب سے اچھا دوست تھا۔ وہی صبا تو اسے وہ پہلے جیسی ہی توجہ اور اہمیت دیا کرتا تھا۔ صبا کے ساتھ اس کے دل سے اس کی واپسی بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

وہ اب بھی چاہے یا کالی کاموا ہونے پر کسی ملازم کو توازن لگانے کے بجائے خود اپنے کمرچن میں آجاتا کرتا۔ لیکن اب صبا بچن کے معاملات میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

کالی مرتبہ جب وہ رات کو ارٹھی کے لیے کافی لے کر اس کے کمرے میں آئی تو وہ حیرت سے بولا۔

”جیسے کافی بھائی آئی صبا؟“ پھر کافی کا ایک گھونٹ لے کر اس کی تعریف کرتے ہوئے اسے یکدم ایک اور بات پر حیرت ہوئی تھی۔

”جیسے یہ کیسے پتا چلا کہ میرا اس وقت کافی پینے کا ڈبہ ہے؟“

”ارٹھی بھائی! ہم دونوں اس گھر میں شروع سے ایک ساتھ رہتے آئے ہیں۔ کیا مجھے اتنی سی بات بھی پتا نہیں ہو گی کہ جس وقت آپ کچھ لکھتے پڑھتے کا کلمہ کر رہے ہوتے ہیں اس وقت آپ کو چاہے یا کالی کی شہوت سے طلب ہو جاتی ہے۔“ ارٹھی اس کی بات سن

کر شرارتی انداز میں بے ساختہ بولا۔

”ہاں جیسے مجھے یہ بات معلوم ہے کہ امتحان کے دنوں میں رات رات بھر جاگ کر پڑھتے ہوئے صبا چپس کے چار پانچ پیکٹس اور پیپری کے دو تین کین بوتے تو اس سے خالی کر دیتی ہے اور اگر امتحان کر کے فنانس میں آئیں اور انیس سے ٹھیک لگی کیوں مل جائے تو پھر تو کیا ہی بات ہے۔ پڑھنے میں بھی خدا بخواد ہی ملے لگتا ہے۔“ وہ ارٹھی کی بات پر ہنس پڑی۔

صبا اپنا کمر صاف کرتی تو اس کے بعد ظفر اور ارٹھی کے کمرے بھی صاف کر دیا کرتی تھی۔ ارٹھی کے کمرے اور ارٹھی کی تمام چیزوں کو صاف کرنا ترتیب سے ان کو اصل جگہ پر رکھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔

ارٹھی کو شاید یہ بات معلوم بھی نہیں تھی کہ صبا ہر روز اس کی بکھری اور بے ترتیب چیزوں کو قرینے سے واپس لے کر اصل جگہ پر رکھتی ہے۔ اس نے خود بھی کبھی ارٹھی کو یہ بات نہیں بتائی تھی۔

ارٹھی صبا کی بعض تبدیلیوں کو مست انجوائے کرتا تھا۔ وہ اب اس کا ہاتھ پکڑ کر خدیں کرتی تھی اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر اپنی جان بڑھاتا تھا۔

پوری گواہا کرتی تھی۔ چھوٹی سی صبا اب بڑی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ کبھی بھی بڑی ہو جاتی ارٹھی کی نظر میں اسے جیسے ہی ہی رہتا تھا۔

اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ ”ارٹھی غضبناک تمہارے لیے کیا ہے؟“ تو وہ ایک لمحہ کی دیر لگائے بغیر کہتا کہ صبا اس کی پھوٹی سی ٹیوٹ سی کزن سے پور اس پھوٹی سی شرارتی بچی سے وہ بے تحاشا پیار کرتا ہے۔ وہ ان کے گھر کی سب سے پھوٹی بچی تھی۔ اس نے بیٹھ اسے بچوں کی طرح ٹیٹ کیا تھا۔ وہ اس کا اسی طرح خیال رکھتا تھا جیسے گھر کے سب سے چھوٹے بچے کا گھر کے بڑے افراد رکھتے ہیں۔ وہ سات سال کا تھا جب صبا پیدا ہوئی تھی۔

”یہ مونیو مجھ سے نہیں اٹھتی۔“ ظفر کبھی لاڈ میں اسے گود میں اٹھا بھی لیتا تو چھوٹی سی بچی میں منہ داتے

ہوئے اسے دایس گھٹ میں لٹا دیتا۔ لیکن ارٹھی کو اسے گود میں لیتا۔ بار کرنا سب بہت اچھا لگتا تھا۔ یہ جیتی جاگتی لڑیا تو اسے اپنے سب اٹھو لوں سے زیادہ پیاری تھی۔

اس قدر غم سے اس کے شاید ممالور ڈیڈی نے بھی نہیں اٹھائے تھے جیسے ارٹھی نے اٹھائے تھے۔

جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی ارٹھی سے اس کی قربت بڑھتی چلی گئی۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے مسئلے اس کے پاس لے کر آتی تھی۔ کبھی کبھار تو اس کی چٹکانہ پاؤں پر جھکی جاتا مگر کچھ کہہ کر اس کا دل توڑنا اسے بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

اور یہ وقت کتنی جیزی سے گزارا تھا وہ چھوٹی سی بچی بڑی ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے لیے تو سارا کچ بھی وہی مہا تھی۔ مصوم سی، خدی سی، شرارتی سی بیٹی۔



مما جو دن رات غم کو یاد کر کے آنسو بہاتیں اور اکثر بھائی بھادر سے بیٹی کو دایس گھٹ لینے کا سوچا کرتی تھیں لیکن یہ خواہش بہت تکلیف دہ انداز میں پوری ہو گئی تھی۔ لڑائی پیاری اور لڑائی غم دایس گھٹ کے پاس آگئی تھی۔ مگر تمس کا یہ آنا خوشیوں کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ وہ آنسوؤں کے ساتھ دایس گھٹ کے پاس آئی تھی اور انہوں نے بھی اس کا استقبال آنسوؤں کے ساتھ ہی کیا تھا۔ کتنا بدنام کامیادونا تھا ماما اور غم برائش ہوں اور ممالی کا ایر کر کش میں انتقال ہو گیا تھا۔ ممائی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ غم ایک کونسی اور دلاست دیں یا خود اپنے آپ کو۔ وہ جان سے عزیز بھائی جس سے انہیں اس قدر محبت تھی کہ اپنے بھگڑا کھلا اس کے حوالے کر دیتا تھا اس کی جدائی کا دکھ کوئی معمولی دکھ نہیں تھا۔ ڈیڈی غم کو اپنے ساتھ کراچیا لے آئے تھے۔ وہ اپنی بھتیجی ہر اسالیسی غم نہ غم لگ ہی نہیں رہی تھی جس سے وہ اوگ واقف تھے۔ سب سے الگ تھلک وہ سارا سارا دن کرتے میں پڑی

رہتی تھی۔ پہلے پر سب اس کے اپنے تھے اس کے تھنی رہتے۔ مگر وہ غم سب کو اپنی نگاہوں سے لگا کر لیتی تھی۔ ماما اپنا غم بھلا کر غم کی کل بھتیجی میں لگ گئی تھیں۔ مگر کابیر فرول دچکے تھے اسے خوش رہتے اور یہ احساس دلانے میں کہ یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ مصروف تھا۔

صبا، غم کو کسی بھی وقت اکیلا نہیں رہنے دیتی تھی۔ اکثر وہ اسے زبردستی کمرے سے نکال کر باہر لے آتی اور اگر وہ سختی سے انکار کرتی تو پھر وہ خود بھی وہیں اس کے پاس ہی بیٹھ جاتا کرتی اور اپنے کان اور دوستوں کے لوٹ پلوٹکھے اسے سنا کر شروع ہو جاتی۔ اس نے پوشی غم کے لیے اپنے دل میں بہت محبت محسوس کی تھی۔

رشت کی تھمائی میں جب وہ گھٹ گھٹ کر رہے آوا روئی تو صبا بڑی طرح بے چین ہو جاتی تھی۔

"غم! میں تمہاری بہن ہوں۔ سہلی بہن۔ تم چھپ چھپ کر اکیلے رونے کے بجائے میرے گلے لگ کر کیوں نہیں رو گئیں۔ تم اپنے دکھ اور اپنے آنسو مجھ سے شیئر کرو غم! پلیز۔" اس رات اسے کھیل میں جتن چھپائے خاموشی سے آنسو بہاؤا دیکھ کر وہ وہیں بیٹھی تھی۔ غم ایک دم ہی اس کے بالوں پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"مئی پلیا کے بغیر زندگی میں کچھ نہیں رہا۔" "ہمیں اور ممالی کا غم بہت بڑا ہے غم! اگر تم بھی تو سوچو کہ اس غم کو بھیلنے کے لیے تم تنہا نہیں ہو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تم ہمارے دل کے بہت قریب ہو۔ تمہارے آنسو ممالور ڈیڈی سے لے کر اس گھر کے ہر فرد کو دکھ میں مبتلا کرتے ہیں۔" وہ بھتیجی ہو کر بڑی بہنوں کی طرح اسے خود سے لگائے ہوئے چارے سمجھا رہی تھی۔ دلاست دے رہی تھی۔ چاہے غم اس کے گفتگو میں کوئی جاؤ تھا یا اس کے انداز میں دالہ پین اور وار فکلی اس شدت کی تھی کہ غم ساری اجنبیت اور غیرت بھلا کر اس رات سارا وقت اس کے گلے لگ کر اپنے سب غم بھگنے کرتی رہی تھی۔

صبح دو بج کے لیے تیار ہو رہی تھی جب غم کی آنکھ کھلی تھی۔ "سو جاؤ! ابھی سے مت اٹھو۔ اپنی غیند پوری کر لو" رات بھر کی جاگتی ہوئی ہو۔

"تم بھی تو میرے ساتھ جا چکی تھیں۔" غم کیل ایک طرف جھٹکتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "میری تو بیوی ہے یہ بار لکھی نہ جانا ہوتا تو کبھی نہ اٹھتی اتنی جلدی۔" وہ درنگ کھیل کے آگے کھڑی خود پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کھلی کھلی بانہہ دے رہی تھی۔

"جیسے جیسے میرا تم کتنا اور تمہارا نام لینا پڑا تو نہیں لگتا میں!۔ پہلے کی بات دو سہری تھی پہلے تو تم مجھ سے کرنا کی حیثیت سے مل کر تھی میں لیکن اب تو تم میری بیوی، بہن ہو اور وہ بھی پورے دو سال پڑی ہیں۔" غم نے اس کی بات پر بیٹھے ہوئے غمی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یعنی تمہیں برا نہیں لگتا؟ یہ اچھا ہے اور اگر تم خود کو بھولتی آتی کھلو آتیں تو پھر مجھے خواتین اور تمہارا احترام کرنا پڑتا اور پھر پھر احترام کے لیے اور غمی بھائی اور ظفر بھائی کھلی ہیں۔ تم تو بس صرف میری دوست ہو۔" اس نے غم کے چہرے پر لڑنے والوں میں پہلی مرتبہ ایک اپنیت بھرا تاثر ابھرا ہوا دیکھا۔ ڈیڈی نے غم کی مرضی سے اس کا کراچی یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروا دیا تھا۔ یوں اس کی تعلیم کا مشق ہو رہا تھا سلسلہ پھر سے بڑھ گیا تھا۔

"آپ دونوں میں سے کوئی کافی بے گار؟" گھر کے دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے اس نے غم اور ظفر سے پوچھا۔ وہ دونوں اس وقت صبا کی کمرے میں بیٹھ کر ڈیڈی کے کمرے میں مصروف تھے۔ ظفر اپنی عادت اور مزاج کے خلاف غم کا بہت زیادہ خیال رکھ رہا تھا۔ اس وقت بھی یقیناً وہ اس کا دل بٹانے ہی کے لیے اس کے ساتھ کارڈز کھیل رہا تھا۔ "تم کیا اپنے لیے کھلی بنائے جا رہی ہو؟" غم نے گردن گھما کر سوال پوچھا تو وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے

بول۔

"میں ارٹھی بھائی کے لیے کھلی بنائے جا رہی ہوں۔"

"وہ اتنی رات کو تم سے کھلی ہوا کر رہے ہیں؟" غم نے تعجب سے پوچھا۔ اس تعجب میں ناگواری بھی چھپی ہوئی تھی۔ رات کے بارہ بجے ارٹھی کا اپنی بس سے کال کی فراہم کرنا بہت برا لگتا تھا۔

"اے کیوں گے گا؟ اسے خود ہی شوق ہے اس کی چھ مہری کرنے کا اصل میں یہ شروع ہی ہے ارٹھی کی جی ہے۔ اس کے سامنے اپنے کھلے بھائی تک کو خاطر میں نہیں لاتی۔ ابھی تمہیں آئے تو یاد دلان تمہیں ہوئے اس لیے حیران ہو رہی ہو۔ آہستہ آہستہ تمہیں پتا چلے گا کہ کیسے یہ کھلے بھائی پر اپنے ارٹھی بھائی کو ترجیح دیتی ہے۔" ظفر نے پتا چھٹتے ہوئے غم کو آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ صبا اس محلے پر ہلکاتے ہوئے صمت کر کے اندر آگئی۔

"ارٹھی بھائی بہت اچھے ہیں غم! تمہارے تو شیر سبیک گھٹ ہی بہت مختلف ہیں ورنہ تم سب کچھ کہہ کر بھائی میں تمہاری کبھی قدر نہ کر سکتے۔ اتنے کثیر رنگ اور نرم مزاج ہیں ارٹھی بھائی کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ اپنی اہانت اور علم پر انہیں بالکل بھی غور نہیں ہے۔" آخری جملے خالصتاً ظفر کے لیے کہے گئے تھے۔ غم اس کے طنز پر بیٹھے ہوئے ظفر کو دیکھتے لگی تھی جو صبا کو نو لٹ کر واپس آئی توجہ کھل ٹھوہر کارڈز کی جانب مبذول کر رہا تھا۔

ظفر غم کو یونیورسٹی میں اپنے ایڈمیشن کے مراحل طے کرنے میں مصروف تھا۔ اس مصروفیت کے علاوہ فی الحال اس کی کوئی دوسری مصروفیت نہیں تھی۔ اس لیے وہ آج کل وقت گزارنے کے لیے آفس جانے لگا تھا اپنی فراغت کا کام لگاتا تھا کہ وہ صبح کالی در سے سو کر اٹھتا تھا اور غم یونیورسٹی جانے کے لیے اس کے غمے بمشکل برداشت کرتی تھی۔

پھر ایک روز ارٹھی ہی اسے یونیورسٹی لے کر لے کر آیا تھا اور پھر یہ سلسلہ اس ایک دن پر ختم نہیں ہوا

صبح وہ جا رہا ہو کر ناشتے کے لیے لیکن میں آئی تو ریشماں کے ساتھ کھانسی کا جھکاؤ تھا۔ وہ صبح کے لیے دلہن بن رہی تھی۔ وہ نماز کو سلام کرتی جلدی سے فریج سے ایک ٹیڑھا ٹکڑا کر اپنے لیے چھوٹے روٹے لے لی۔ جب سے ارضی بھائی آیا تھا اس کے ناشتے کی ذمہ داری اس نے لے لی تھی۔ وہ ناشتے کے لیے آئی تھی۔ اس کا ناشتہ ہوتا بھی بہت سادہ سا تھا۔ پیرا کا ایک سلاٹس ہوا تھا اور ایک کپ چائے۔

اس کے علاوہ باقی سب لوگ ناشتے میں شریک نہ تھے۔ صبح بہت جلدی سے ناشتہ کیا کرتی تھی۔ انڈیا پر اٹھا اور صبح پوری شام کا ناشتہ کرتی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ابھی صبح کو لیکن میں آئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ شمن بھی لیکن میں آئی۔

"میرے لیے شریک مت بننا۔ ریشماں! رات کی کھیر اور شیریں رکھے ہیں۔ میں وہ کھوں گی۔" شمن کے اس لہجے کا ناشتہ وہ بے اختیار دھنسی ہوئی۔

"کھیر بھی کوئی شیریں کے ساتھ کھا جائے اور وہ بھی ناشتے میں؟" وہ اس کے مذاق اڑانے کا بار بار بغیر رات کے شیریں اور ان میں رکھ کر گرم کرنے لگی۔

مما شمن کو ناشتے کا اپنی اچھی طرح اہتمام کرنا کچھ کر حسب عادت اس ناشتے میں صرف ایک گلاس دودھ پیتے رہتے تھے۔

ارضی نے شمن کے ایک ہاتھ میں کرشٹ کا ٹکڑا سا پالہ اور دوسری پلیٹ میں دو گے شیریں کو دیکھ کر تعجب سے دیکھا تھا۔ شمن پر ایک مسکرائی ہوئی نگاہ ڈال کر ارضی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"آج میں ناشتے میں کھیر شیریں کے ساتھ کھاؤں گی۔ چاہیں تو آپ بھی کھا سکتے ہیں۔ یہ میری گارنٹی ہے کہ انٹامزے دار ناشتہ آپ نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں کیا ہوگا۔" وہ پالہ اور پلیٹ میز پر رکھنے کے بعد خود کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ارضی اس کے پچکارے لینے اور مزے لے لے کر کھیر اور شیریں کی تقریبات کرنے پر دھنسی ہوئی۔

"آپ یونہی دھنسی رہے ہیں ارضی بھائی! ایک ہاتھ میں کرسی۔ شمن زانی کر کے پچھلے آپ کو کھانا چلے گا کہ میں غلط تعریف نہیں کر رہی۔" وہ اپنی پلیٹ میں کھیر نکالتے ہوئے بولی۔

"ارضی بھائی تو یہ کبھی بھی نہیں کھائیں گے۔ بہت لاشٹ ناشتہ کرتے ہیں ارضی بھائی! ارضی کے جواب دینے سے پہلے وہ بول پڑی۔

"مگر کبھی کبھار دو تین سے بڑے میں کچھ مضائقہ بھی نہیں۔ زندگی میں تبدیلیاں تو اچھی لگتی ہیں۔ کیا خرچ ہے خود اسے انجوائے منٹ ہی رہتا ہے۔" وہ بیک وقت صبا اور شمن سے مخاطب ہوا۔ اپنی پلیٹ میں تھوڑی سی کھیر نکال لی۔

"صبا! تم بھی زانی کر رہے۔ شمن بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ یہ تو ارضی بہت مزے کا لگ رہا ہے۔" پہلے نواسے کے بعد وہ سراوا لہجہ میں قائل ہوئے اس نے صبا کو بھی دعوت دی۔ وہ ارضی کی من پسند فل کریم پیر کے گلاس کا ممکن بنائے ہاتھ میں پھیرنے لے لے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اس سے جواب میں کچھ بھی نہیں بولا جاسکا۔ اس نے زبردستی مسکرائے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ شمن ارضی کو اپنی پسند کا ناشتہ کرتے اور اس کی تقریبات کرتے دیکھ کر کچھ خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ ہر نواسے پر اس ناشتے کی تعریف کر رہا تھا اور شمن کو یقیناً یہ بات اچھی لگ رہی تھی کہ اس کی پسند کا ناشتہ گھر میں کسی اور کو بھی پسند آ رہا ہے۔ اچانک اس نے اپنے سامنے پلیٹ میں رکھے پالہ اٹھنے اور پیر کے گلاس کو ٹیپ پر ہنستا ہوا محسوس کیا۔ وہ یہ سب کس کے لیے لائی تھی؟

کیا ارضی کو کچھ بھر کے لیے بھی اس بات کا خیال نہیں آیا تھا کہ وہ ذات کی طرح صبا آج بھی یہ ناشتہ اسی کے لیے لائی ہے۔ وہ اس کے کندھوں سے آگے کے بعد سے پچھلے پچھو سال سے ہر روز اسی طرح اس کے لیے ناشتہ لاتی تھی۔ کیا وہ اتنی غیر اہم تھی کہ وہ اسے نظر انداز کیے زندگی میں پیدا ہو جانے والی تبدیلیوں کو

انجوائے کر رہا تھا۔

ارضی کو اس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسے کس سے پتا تھا کہ وہ آج بہت دواس ہے مگر کیوں؟ وہ خود اپنے آپ کو کچھ نہیں یاد دہانی تھی۔ آخر کیوں وہ اتنی حساس اور زود رنج ہو رہی تھی؟ صبح ناشتے کی میز پر ہونے والی بات اتنی بڑی بھی نہیں تھی جسے وہ دل سے ہی اگا کر بیٹھ جاتی۔ مگر وہ بات اسے اتنی بڑی کیوں لگ رہی تھی۔

لہذا کو وہ ہمیں نیند نہیں آتی تھی، شمن اکثر وہ صبح میں ان کے پاس لیٹ کر باتیں کیا کرتی تھی۔ وہ شمن سے اپنے بچنے والے کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ اپنی نو عمری کے قصے اور اوجان کی باتیں بلانا اور بڑی کے بچپن کے واقعات۔ صبا کو ان قصوں میں کبھی بھی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ شمن بتاتے تھے ان کا دل دھنسنے کی خاطر وہ قصے سن کر بھی یاد رکھتی تھی اسے ان قصوں میں مزہ آتا تھا۔ وہ کبھی صبا کی طرح اہل کو نہ پر جواب نہیں دیا کرتی تھی۔ ارضی جلدی اس نے خود کو اس گھر کے ماحول میں بھول لیا تھا۔ زندگی کے اتنے سال ایک آزاد معاشرے میں گزارنے کے باوجود شمن کے ہر انداز میں شریقت تھی۔ اس کا انجوائے ناشتہ چیت، سلیقہ اس کی شخصیت کا دھماکا تھا۔ یہاں سے آہستہ آواز میں نظریں نیچے کر کے بات کرتا۔ اہل تو بے بسی کھار صبا کو کسی بات پر روکتے ہوئے شمن جیسے بھنی کی صحبت بھی کرنے لگی تھیں۔

نماز وہ پابندی سے پڑھتی تھی اور تو اور مسالے نے اسے کافی حد تک گھٹا کر کھانا کھایا تھا۔ وہ لیکن میں کلام کر رہی ہوئی تو صبا سے حیرت سے دیکھا کرتی تھی۔ کئی غصت اور سلیقے سے وہ ہر کلام کرتی تھی۔ خود صبا اگر لیکن میں کوئی کلام کرتی بھی تو ایک چیز پکانے میں دس چیزیں پھیلانی تھی۔ شمن کے ہر انداز میں ایک عجیب شہلاہے بن اور نزاکت ہوئی۔ طریقہ اور سلیقہ گویا اس پر آکر فٹم ہو گیا تھا۔

اس گھر کا ہر فرد اس کی ان خوبیوں کو سراہتا تھا۔ "میں کیا ہوا ہے صبا؟" وہ لینے کے لیے کھیر

سیدھا کر رہی تھی جب شمن نے پوچھا۔

"کیا ہوا ہے مجھے؟" اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا بات تو میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔ کیا تم مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو؟" وہ ہلکے پر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

"میں کیا پاگل ہوں جو بغیر کسی بات کے تم سے ناراض ہوں گی۔" وہ ہر ماننے والے انداز میں بولی۔

"پھر کیا بات ہے؟ تم نے آج دن بھر میں مجھ سے بالکل بات نہیں کی۔ شام کو میں تمہارے اور اپنے لیے سندھو چڑھنا کر لائی تو تم نے منع کر دیا۔ ابھی بھی رکھو، ارضی جلدی سونے کے لیے لیٹ گئی ہو۔ جبکہ دوڑا نہ ہم دونوں کتنی دیر تک جاگ کر باتیں کرتے ہیں۔ ان باتوں پر میں بھی سوچ سکتی ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔" شمن کے ان شکوک پر وہ ہر طرح شرمندہ ہو گئی۔

مردہری شمن ابھی چھ نہیں کیوں کہ میرا سوا بلا وجہ خراب ہو رہا تھا۔ تم سے میں کیوں ناراض ہوں گی۔"

"مردہری! بات پر خراب ہو گیا تمہارا؟" شمن اس کے برابر میں لیٹ گئی۔

"بات کوئی نہیں ہے دار! اس میں ہوں ہی سوئی۔ تمہاری طرح ٹیک اور اچھی بی نہیں ہوں نا۔ لہذا میں سے نصف صدی پہلے کے قصے خوش خوش سننے والی۔" اس نے شرارت سے شمن کو پھیلایا تھا۔

"تم بہت اچھی ہو صبا! یہاں ہوں میں اتنی جلدی ایڈجسٹ ہو گئی ہوں تو اس میں سب سے بڑا ہاتھ تمہارا ہے۔" وہ شمن کے منہ سے اپنی تعریف سن کر مسکرا دی۔

"جب می پاپا کی ڈیوٹی پوری ہوئی تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں بھری دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی ہوں۔ مجھے تم لوگوں سے بالکل بھی محبت اور لگائیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ تم سب تو شروع سے ایک ساتھ ایک ہی گھر میں تھے۔ تم لوگ ایک تھے اور میں تم لوگوں سے الگ، بالکل پرانی۔ میرا ناول میری تربیت سب تم لوگوں

”واقعی؟“ وہ خوشی سے فوراً ”کھڑی ہو گئی تھی۔
ار تفضی نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا اور بولا۔
”تم مجھے ایک گلاس پانی کا پلاؤ اور تمہیں کو بھی بلا
لاؤ۔ پھر تینوں مل کر چلیں گے۔“ صبا جانتی تھی ار تفضی
اخلاقیات نبھانا کبھی نہیں بھولتا۔ وہ لوگ کہیں باہر
جائیں اور ار تفضی تمہیں سے نہ کہے ایسا ہو ہی نہیں سکتا
تھا۔

”وہ اپنا اسائنمنٹ بنا رہی ہے۔ مشکل ہی ہے کہ وہ
ہمارے ساتھ چلے۔“

”تم اس سے کہو تو۔“ وہ صوفے کی پشت سے سر
ٹکاتے ہوئے بولا۔ یوں جیسے صرف ایک اخلاقی تقاضا نبھانا
چاہ رہا ہو۔ ار تفضی کو پانی پلا کر وہ تمہیں کے پاس کمرے
میں آگئی۔

”تمہیں! میں اور ار تفضی بھائی باہر کھانا کھانے جا
رہے ہیں۔ ار تفضی بھائی نے تمہیں بھی انوائٹ کیا
ہے۔“ وہ برجوش سے انداز میں بولتے ہوئے اس کے
پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ تمہیں رائٹنگ ٹیبل کے
آگے بیٹھی مسلسل کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔

”تم لوگ جاؤ صبا! مجھے ابھی بہت کام ہے۔“ اس کا
جواب حسب توقع تھا۔

”چلی چلو نا تمہیں! مزہ آئے گا۔“ اس نے دوبارہ
اصرار کیا تو تمہیں نے سہولت سے معذرت کر لی۔ وہ
تمہیں کی بدذوقی پر لعنت بھیجتی واپس لاؤنچ میں آگئی۔
”تمہیں نہیں آئی؟“ ار تفضی نے اسے اکیلے آنا دیکھ
کر آہستگی سے پوچھا۔

”یا گل ہے تمہیں، پڑھائی کو سر پر سوار کر لیتی ہے۔
اسائنمنٹ جمع کرانے کی تاریخ ابھی دور پڑی ہے پھر
بھی محترمہ دل و جان سے اسے مکمل کرنے میں لگی
ہیں۔ فرما رہی ہیں، آپ لوگ جائیں مجھے اسائنمنٹ
بنانا ہے۔“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولی۔

”تمہیں کو ابھی یہ نہیں معلوم کہ آخری تاریخ سے
ایک دن پہلے گھبرائے اور بو کھلائے ہوئے انداز میں
کام کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔“ اس نے لطیف
سے انداز میں صبا کے ہر کام کو آخری وقت پر ٹالے

سے مختلف تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ تم لوگوں کا یہ گھر
چھوڑ کر واپس سڈنی چلی جاؤں مگر اب مجھے اپنی اس
وقت کی سوچوں پر افسوس ہوتا ہے۔ تم سب کتنے اچھے
ہو۔ میرے اپنے ہو۔ مجھ سے بے تحاشا پیار کرتے ہو،
اس کے لفظوں میں اتنی سچائی اور اتنی وارفتگی تھی کہ
اس نے بے اختیار تمہیں کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر
محبت سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔



ار تفضی اپنی فٹنس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ روزانہ
صبح پابندی سے ایکسرسائز اور جاگنگ اور ہفتے میں دو
مرتبہ سو وہ ضرور کیا کرتا تھا۔ آج بھی وہ آئس
سے گھر آنے کے بجائے سوئمنگ کے لیے چلا گیا
تھا۔ وہاں سے گھر واپس آیا تو لاؤنچ میں صبا اکیلی بیٹھی
نظر آئی۔

”کیا ہوا؟ اتنی بری بری شکلیں کیوں بنا رہی ہو؟“
اس کے سلام کا جواب دے کر وہ بھی صوفے پر بیٹھ گیا
تھا۔

”بور ہو رہی ہوں۔ اس گھر میں کسی کو میری پروا
نہیں ہے اور یہ نی وی بھی بس، ایک دم فضول اور
بورنگ۔“ وہ نی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر روٹھے
لہجے میں بولی۔

”یوں منہ بسورتے ہوئے تم کتنی پیاری لگتی ہو
صبا!“

”خاک پیاری لگتی ہوں۔ اس پیاری کی کسی کو رتی
برابر بھی پروا نہیں ہے۔ ماما اور ڈیڈی، غیث انکل کے
گھر چلے گئے، بابا ابھی تک گھر ہی واپس نہیں آئے،
ظفر بھائی تو خیر گھر پر ٹکتے ہی کم ہیں، اماں ہیں تو وہ اپنے
وظائف پڑھنے میں مصروف ہیں اور تمہیں کا تو ذکر ہی
بے کار ہے۔ کتابی کیرئیر نہ ہو تو۔“ وہ ہنوز ناراض تھی۔

”چلو میں تو ہوں اپنی پیاری سی صبا کی پروا کرنے
کے لیے۔ ایسا کرتے ہیں آج ڈنر کہیں باہر کر لیتے
ہیں۔ تمہاری پسند کی جگہ پر۔“ اپنی تھکن بھلا کر اس
نے فوراً ”پروگرام ترتیب دے ڈالا۔“

رکھنے کا ذکر کیا تو وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ کر ہنس پڑی۔

"پاکل اس کامیابی سمجھ اور نہ تپ۔"

"چلو پھر ہم لوگ چلتے ہیں۔" وہ بڑے اطمینان سے انداز میں چلتی چلتی پر سے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے بولا۔ لاؤنگ سے باہر نکلنے کے لیے اس کے اٹھنے سے وہ قدم صبا کو لپکا جیسے وہ اسے زیر دستی جا رہا ہو۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے ارٹھی کی طرف دیکھا تو پتا نہیں کیوں وہ اسے بہت چپ چاپ اور بچا ہوا محسوس ہوا۔ کچھ دیر پہلے اس نے خود ہی تو یہاں پر کھانا کھانے کا پروگرام بنایا تھا پھر اب اچانک اس پر یہ بیزاری اور کوفت کی کیوں چھا گئی۔ سب لوگ کہتے تھے کہ ارٹھی کو اپنے ناگزرت دوستوں سے چھانے میں کمال حاصل ہے۔ اسے غصہ آ رہا ہو یا کسی کی کوئی بات ناگوار گزر رہی ہو وہ تب بھی اپنے احساسات ظاہر نہیں ہوتے۔ لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ارٹھی اس وقت کسی بات پر ناخوش ہے۔ کسی چیز نے اسے افسوس کر دیا ہے۔ پہلی مرتبہ اس پر اس بات کا اعتراف ہوا تھا کہ وہ ارٹھی غصہ کا چہرہ نہ رہی ہے۔ وہ دوستوں سے اپنے جذبات چھپا لیا کر رہا ہو گا، لیکن صبا شفیق اس کے چہرے پر موجود ہر اثر کو پڑھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ مسلسل اس سے باتیں کر رہا تھا۔

گاڑی میں صبا کا فاسٹ میوزک بھی لگایا ہوا تھا۔ کیونکہ اسے خود تو فاسٹ میوزک پائیکل پسند نہیں تھا۔ ہل میں آئے سارے چل کر ارٹھی نے سینو کاڑا اس کے جواب کرتے ہوئے اس سے اس کی پسند کی چیزیں منگوانے کے لیے کہا۔

"میں بھی تمہاری پسند کی ڈشز کھاؤں گا۔" اس نے صبا کے اختصار کے جواب میں نرمی سے کہا۔ وہ دونوں کھانا کھاتے ہوئے انہیں میں بے تکلفانہ باتیں کر رہے تھے نہیں رہے تھے۔ آتے جاتے لوگوں پر کنکشن بھی دیے جا رہے تھے مگر پھر بھی صبا کا دل خوش نہیں تھا۔

ارٹھی اس کی خاطر موتا "پاکل تمی تھا ورنہ اس کا دل صبا میں نہیں تھا اس کی سوچیں صبا میں نہیں تھیں۔"

چھٹی کا دن تھا۔ سب لوگ گھر پر موجود تھے اور چھٹی کے اس دن کو انہیں کرنے کے موافق بھی تھے۔ ارٹھی کے خالہ زاد اور ماموں زاد کزنز آئے ہوئے تھے۔ شمن نے پہلی مرتبہ اس طرح کا موقع دیکھا تھا اس لیے خوشی کے ساتھ ساتھ حیران بھی ہو رہی تھی۔

ارٹھی اور ظفر دونوں ہی فینس اور ہڈ مینش کے بہترین کلاڈی تھے اسکول اور کالج میں بھی ان کا ان تہیں میں مقابلہ ہو کر آتا تھا۔ ہر بار ان دونوں کا مقابلہ بہت زوردار اور دلچسپ ہوا اگر آتا تھا۔ کھیل شروع ہوا۔ پچھلے طرح تمام شاہیوں کے دو گروپس بن گئے تھے۔ کچھ ارٹھی کو سپورٹ کر رہے تھے اور کچھ ظفر کو۔ صبا چیخ مچی کہ "ارٹھی بھائی، ارٹھی بھائی" کے نعرے لگا رہی تھی۔ شمن نے صبا کو بھائی کے مخالف گروپ میں دیکھ کر نا پسندیدہ سی شکل بنائی تھی۔ وہ ظفر کے مہلتیوں کے ساتھ شامل ہوئی اور ان کے ساتھ مل کر ظفر کے حق میں نعرے لگا رہی تھی۔

اس وقت وہاں بھانٹ بھانٹ کی آوازیں اور جسم کے ٹکڑے گونج رہے تھے۔ سب لوگوں کی زوردار تھاپوں اور نعروں میں شمن کی آواز تو بالکل سب سے گئی تھی۔ وہ پچھلے آواز میں پت کیا کرتی تھی۔ سب سے زوردار اور بلند آواز صبا کی تھی۔

"ہم تم ارٹھی بھائی، ایک بار پھر جیت کر دکھائیں" آپ کو ہار نہیں ہے۔" وہ گلا بھاڑ بھاڑ کر چلا رہی تھی۔

"اللہ کرے ظفر بھائی جیتیں۔" شمن نے دل سے دل میں دعا مانگی۔ تھوڑی دیر گزری ہوئی کہ صبا کی ہاتھیاں اور نعرے کچھ ہلکے پڑنے لگے۔ ظفر ہر طرح کھیل پر تھکا ہوا تھا۔ ارٹھی کے تمام مہلتیوں کی آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ وہ بار بار اظہارِ اہانتا شور

کم ہو تو شمن کی آواز سب کو واضح سنائی دینے لگی۔ کھیل ختم ہو گیا تھا۔ ظفر دیت گیا تھا۔ زوردار "ہرے" کا نعروں کا کر اس نے انگلیوں سے دلی دلتے ہوئے اپنے مہلتیوں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ شمن نے ساتھ ساتھ ہاتھ دھوئے ظفر کے پاس گئی تھی۔

"تپ ہارے تو تھے، بہت دیکھ ہو تپ۔ سب لوگ کہہ رہے تھے کہ ظفر بہت اچھا کھیلتا ہے مگر پھر بھی پتا نہیں کیوں ارٹھی سے ہر بار ہار جاتا ہے۔" اس نے بھائی کا ہاتھ تھامتے ہوئے ہر خوش سے انہیں کہا۔

خوشی اور مسرت اس کے ہر انداز سے عیاں تھی۔ ظفر نے اس کے والدین انداز پر خوشی محسوس کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ دیا۔ اس کی محبت کا جواب دیا تھا۔ ارٹھی ان دونوں سے کافی فاصلے پر کھڑا مسلسل مسکرا رہا تھا۔ اسپورٹس مین اسپرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے ظفر کو گلے لگا کر مبارکباد دی اور پھر اس کے بعد شمن پر ایک مسکراتی ہوئی نگاہ ڈال کر بولا۔

"صبا رک، ہو تمہیں، تم تو یقیناً بہت خوش ہو گی تمہارے بھائی صاحب جیت کر گئے ہیں۔"

"ہاں، مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔" وہ بغیر ہچکچائے فوراً "بھئی۔" ارٹھی نے اس کی صاف گولی پر اپنی سب سے سافٹ سٹیپ بھجھا کر دئی تھی۔ وہ شمن کی خوشی سے ہلکتی ہوئی آنکھوں میں آنسو کر مسکرا رہا تھا۔

اور صبا شفیق ابھی تک کسی مجسمہ کی طرح جمی ہوئی اپنی جگہ پر بیٹھی تھی۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ کسی نے اس کی طرف دیکھا نہیں تھا۔ کسی کو یہ بات پتا ہی نہیں چلی تھی کہ صبا ابھی تک وہیں کھڑی ہی بیٹھی ہوئی ہے۔ اسے اپنے آپ میں ہلکا ہلکا ہنسنے محسوس ہوا۔ وہ جیسے اس جگہ میں خفا کھڑی تھی۔ "ما" کسی کے زوردار نعرے کی آواز نے اسے جو نکالا اسے اس بات کا احساس دلایا کہ وہ زندہ ہے سانس لے رہی ہے۔ اس کا دل معمول کے مطابق دھڑک رہا ہے۔ اس کا ہاتھ اپنے چہرے کی طرف گیا تو اسے پتا چلا کہ وہ

دور رہی ہے۔ اس نے اپنے آنسو صاف کرنے چاہے مگر وہ اور شدت سے بہتے چلے جا رہے تھے۔ اپنی آنکھیں دہاتی وہ بے اختیار کرسی پر سے اٹھی اور پھر کسی کی طرف دیکھے بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ اپنے کمرے میں آکر بہتر سے اونٹھے منہ گری وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

اس کے کمرے کا دروازہ زور زور سے پٹکا جا رہا تھا۔ "صبا! میں ہوں ارٹھی۔" ہار کر بہت خوش ہونے والے کو تنہا بیٹھی اس لڑکی کا دھیان آئی گیا تھا۔ اس لڑکی کا جو صرف اس کے ہارنے کا سوچ کر رہی وہ اس ہو چلا کرتی تھی۔ وہ اس کی آواز سننے کے بعد جوا بھی نہیں گئی۔ وہ تین منٹ تک اس کے چہرے کا انتظار کرنے کے بعد وہ خود ہی دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ وہ اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"صبا! انھو میری طرف دیکھو۔" اس کے لمبے میں نرمی اور محبت تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتا نہیں جانتی تھی اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی مگر ارٹھی نے ایک دہائی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھا کر بٹھا دیا تھا۔

"آج آپ کو میرے دل کے دیکھنے کا کوئی خیال نہیں آیا۔ آج بھی تو آپ کے ہارنے سے مجھے تکلیف ہوئی ہے لیکن آپ کے پاس میری تکلیف کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی کمال ہے۔ آپ کے ہارنے سے شمن تو خوش ہے نا۔ آپ ہارے ہی جان بوجھ کر ہوں صرف اسے خوش کرنے کے لیے۔" آنسو گزر گزر کر صاف کرتے ہوئے اس نے اپنے دل میں گونجتے یہ شکوے سننے انہیں زلزلہ میں لاسکتی تھی۔

"دوری صبا! میں بار بار پتا نہیں کیوں آج میں جیت نہیں پایا۔ شاید ظفر آج مجھ سے بہتر کھیلے اس لیے۔"

وہ اس کے پاس پہنچ کر سنجیدگی سے بولا۔

اس نے خود سے کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے ارٹھی غصہ کی طرف ایک بل کے لیے دیکھا۔

"آپ کیوں ہارے؟ آپ کیوں ہارے ارٹھی غصہ؟ آپ جان کر ہارے ہیں نا؟ شمن کے لیے اسے خوش کرنے کے لیے۔ میرے لیے آپ جیتتے تھے اور

اس کے لیے آپ ہارنے اپنا آپ ہارنے آپ نے
 شمن کے آگے اپنا تپ کیوں ہار دیا؟ اسے مزید رونا آ
 رہا تھا۔ مگر وہ اس وقت اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی
 تھی اس سے کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔

"آپ کیوں ہارے ارٹھی بھائی؟" اچانک ہی اس
 کے ہونٹوں سے غصہ پھیل گیا تھا۔

"یار بیوہ دیتا بھی تو میں ہی ہوں۔ ایک بار ہار گیا
 ہوں تو تم اس طرح رورہی ہو۔ اچھا چلو پاگل نکالو وہ
 اگلی بار میں جیتوں گا اور پھر جیتنے کی خوشی میں تمہیں
 تمہاری بیوی ریٹ آؤں کریم بھی کھاؤں گا۔ بہت
 ساری آؤں کریم۔" وہ یار سے اس کی طرف دیکھتے
 ہوئے وعدہ کر رہا تھا مگر اس مسکراہٹ اور پیار میں وہ
 بات نہیں تھی جو شمن کی طرف اٹھنے والی نگاہوں میں
 تھی۔

"صبارک ہو تمہیں اتھو یقیناً بہت خوش ہو گی۔
 تمہارے بھائی صاحب جیت جو گئے ہیں۔" یہ بات
 شمن سے کہتے وقت ارٹھی غصہ کرنے میں نگاہوں سے
 شمن کو دیکھتا تھا ان میں کتنی دیر لگی تھی کس قدر
 محبت تھی۔ وہ غفلت کا اندازہ کر اسے دیکھتے ہوئے ان
 نگاہوں سے موازنہ کر رہی تھی۔ پیار و دونوں ہی جگہ تھا
 مگر اندازہ تھا وہ اس سے کیا کہہ رہا ہے اسے ایک
 لفظ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

"اچھا اب یہ آؤ صاف کرو۔" اس نے اسے ہاتھ
 پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

"جلدی سے منہ دھو کر آؤ۔ ظفر زندگی میں پہلی
 مرتبہ مجھ سے جیتنے پر خوشی سے پاگل ہو رہا ہے اور اسی
 خوشی میں وہ سب کچھ کھائے پائے باہر لے کر جا رہا
 ہے۔" ارٹھی شوخی سے بولا۔ وہ خاموشی سے دانش
 روح میں بلی گئی تھی۔ ارٹھی بیڑ پر بیٹھا اس کا انتظار
 کر رہا تھا۔ وہ سب لوگ لاؤنج میں بیٹھے ان ہی دونوں کا
 انتظار کر رہے تھے۔

"بہت برا لگا ہے۔" بھی لوگوں کو میرا جتنی ظفر نے
 اسے دیکھتے ہی طنز انداز میں کہا۔ وہ جواباً خاموش
 رہی۔ کچھ دیر بعد وہ سب گاڑیوں میں شخص ٹھہرا کر

ظفر سے شاندار سی ٹریٹ وصول کرنے جا رہے تھے۔
 وہ بہت کوشش کے باوجود بھی سب کے ساتھ باہر
 کرنے اور بیٹھنے بنانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی
 تھی۔

"تو بٹے تمہارے ہارنے پر مجھے بہت حیرت ہے۔
 جیسی کلاس لیتے ہو سنے ناور نے ارٹھی سے کہا۔

"بھئی بلی بات تو یہ ہے کہ ظفر نے واقعی
 بہترین انداز میں کھیلا اور دوسرے یہ بھی ہے کہ اس
 کل میں آؤں میں ضرورت سے زیادہ مصروف رہا
 ہوں اس لیے پابندی سے پریکٹس نہیں کیا کہ۔" وہ
 جواب دے کر وہ اپنی پلیٹ میں میٹرو پیز ڈالنے لگا۔

"مطلب یہ کہ اگر آپ دوبارہ پابندی سے پریکٹس
 شروع کریں تو با آسانی ظفر بھائی کو ہرا دیں گے۔"
 شمن کو ارٹھی کی بات بہت بڑی لگی تھی۔ ارٹھی نے
 ہاتھ میں پکڑا ہوا اچھو واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔ شمن کی
 طرف وہ بڑی محفوظ سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"ہار کر لوگ پونسی الٹے سیدھے جوڑ پیش کرتے
 ہیں۔ بول ہوتا تو میں یوں کر لیتا اور یوں نہیں ہوتا۔
 اس لیے میں یوں نہیں کر پاتا۔ یہ بات تھوڑی سی اس کے
 منہ سے نکلنے کی کہ آج میں نے اسے آؤٹ کا اس کر دیا
 ہے۔" ظفر نے شمن کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ جا
 پلیٹ میں تھوڑے سے چاول اور ملاوڑ والے انہیں
 زبردستی کھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تمہیں ہارنے پر دکھ تو ہوا ہو گا؟" اس نے سوالیہ
 نظروں سے ارٹھی کو دیکھا۔

"کبھی کبھی انسان ہار کر بھی تو جیت جاتا ہے۔"
 "اوہ فلسفہ۔" اس نے مذاق اڑانے والے انداز
 میں کہا۔

"مسٹر ارٹھی غصہ آج آپ نے ہار کر کیا جیت لیا
 ؟" وہ اس کی بات پر دھجے سرول میں ہنسا۔

"میں نے یہ کہہ دیا تھا۔ بات اصل بات تو یہ ہے کہ
 آج کا دن میرا نہیں، ظفر کا تھا۔" اس نے جواب دیتے
 ہوئے اس نے ایک نظر اپنے پاگل سامنے بیٹھی شمن
 پر ڈال دیا۔ کچھ سوچ کر مسکرایا۔

"لوہر جہاں تک جیتنے کی بات ہے تو اور کچھ نہ سی
 کم از کم آج میں نے شمن کی مسکراہٹ تو جیت لی
 ہے۔ کیا میرے جیتنے پر یہ اس طرح مسکرا سکتی تھی؟
 یہی سوچ کر مجھے زیادہ افسوس نہیں اور ہار کر چلو میرے
 ہارنے پر ظفر کے ساتھ ساتھ شمن بھی بہت خوش
 ہے۔" شمن اس کی صاف گوئی اور کچھ دیر پہلے کے
 اپنے رویے پر شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

"مجھے آپ کے جیتنے پر بھی خوشی ہوئی ارٹھی بھائی!
 لیکن ظفر بھائی کے لیے جس طرح میں شل کرتی ہوں
 اس طرح آپ کے لیے تو نہیں کر سکتی۔ یہ تو بہت
 بچپل سی بات ہے۔" وہ اپنے رویے کی وضاحت
 کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ظفر شمن کی محبت پر
 بڑی سرشاری سے مسکرایا تھا۔

"وہاں کی ساری بیٹیں میرے ظفر سے رشتہ جوڑے
 تھوڑی سی بھی ہوتی ہیں۔ کچھ تو شمن جیسی بھی ہوتی ہی
 ہیں۔" ظفر نے بہت دیر سے جب بیٹھی صبا کو لڑائی پر
 آسانے کی کوشش کی تھی۔ ظفر کی بات نے سب کو
 ایک دم ہی اس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ ورنہ اتنی دیر
 سے کسی کی بھی توجہ اس کی جانب نہیں تھی۔

"ظفر بھائی پاگل ٹھیک کہتے ہیں صبا تم واقعی
 ارٹھی بھائی کی چچی ہو۔" شمن صبح پونہ سو بجے پن کر
 جانے والے پیرے نکالتے ہوئے بولی۔ ان لوگوں کو
 واپسی میں اچھی خاصی دیر ہو گئی تھی۔ واپس آکر وہ
 فوراً ہی ستر لیٹ گئی تھی۔

"اور ظفر بھائی کتنے اچھے ہیں۔ انہوں نے
 تمہارے رویے کا برا بھی نہیں لٹا۔ میں ان کی جگہ
 ہوتی اور تم میرے جیتنے پر اس طرح ناراض ہو نہیں اور
 روئیں تو میں تم سے بات بھی نہیں کرتی۔" وہ اپنے
 کام میں مصروف اس کے رویے پر اپنی تاپ بند کی کا
 اٹھار بھی کرتی جا رہی تھی۔

"ہم میں سے کسی کو تو پتا بھی نہیں چلا تھا کہ تم
 ناراض ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی ہو۔ دو تو ارٹھی
 بھائی ہی کی نظر پڑی تھی۔ ظفر بھائی کہنے لگے کہ اس
 کے جیتنے ارٹھی بھائی مجھ سے ہار جو گئے ہیں تو ضرور

کمرے میں بیٹھ کر اس بار کا فہم ساری ہو گی۔" وہ اپنے
 کام سے فارغ ہو چکی تھی بیڑ کی طرف آتے ہوئے
 اس نے اپنا جملہ عمل کیا تھا۔

"لائٹ آف کر دو شمن!۔" ٹکیہ منہ پر رکھتے ہوئے
 اس نے بیڈ کی سے شمن سے کہا۔ شمن لائٹ آف کر
 کے اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔

"ارٹھی بھائی کے گزرتا ساڑھے سی بہت اچھے ہیں۔
 خوش مزاج اور بیٹھنے بیٹھنے والے ہے صبا!۔" کچھ دیر
 بعد اس نے شمن کی توجہ اس کی سنی۔ وہ روزانہ کی طرح جانتی
 کرنے کے سوا میں بھی صبا جواب میں اسی طرح بے
 حس و حرکت خاموش بیٹھ رہی۔

"تم کیا سوئیں صبا؟" اس کے جواب نہ دینے پر
 شمن نے پوچھا۔ اس نے آپ کی ہار بھی جواب نہیں دیا
 تو اس نے یہ کچھ کہہ کر صبا کو کی پ دیا کہ اسے آواز
 نہیں دی۔ کافی دیر تک کمرے میں خاموشی اور سناٹے
 کا راج رہا۔ بہت دیر بعد اس نے منہ پر سے ٹکیہ ہٹا کر
 شمن کی طرف دیکھا۔ بے خبر سو رہی تھی۔ گہری اور
 پرسکون نیند۔

"میری آنکھوں سے نیند چر آخر کتنے مزے سے
 سو رہی ہو شمن!۔" اس نے شمن کے حسین چہرے پر
 نگاہیں جمائیں۔

"تم یہاں پر کیوں آئی ہو شمن۔" اس رات پہلی
 مرتبہ اس نے شمن کے پارے میں یہ بات سوئی۔

"یہ تو واپس چلی جاؤ شمن تمہارا پس منڈی چلی جاؤ۔
 جہاں سے گئی تھیں وہیں لوٹ جاؤ۔ تمہارے آٹے
 سے پہلے ہم سب کتنے خوش تھے۔" اتنے دنوں سے
 اسے کیا بات اور اس کر رہی تھی گوانی جی جی جی جی
 دہکی کر رہی تھی اور تھے وہ کچھ نہیں پادری تھی آج
 اس کی سمجھ میں وہ بات آگئی تھی اور وہ بات کتنی
 تکلیف دہ تھی۔

"وہ مجھے نہیں دیکھتا شمن کو دیکھتا ہے۔ اسے مجھ
 سے نہیں شمن سے محبت ہے۔" ساری رات وہ بے
 چینی سے کوشش بدلتی رہی تھی۔

وہ ہر روز شمن کو دیکھ کر "تم یہاں کیوں آگئی ہو شمن؟ ضرور سوچا کرتی تھی۔ اس رات بھی وہ فرس کی کتب اور نوٹ بک سامنے رکھے اسی ایک جگہ کو بڑھے جا رہی تھی جب شمن نے اس کے پاس میز پر لا کر کچھ رکھا۔

اس نے سر اٹھا کر نہ تو شمن کی طرف دیکھا اور نہ اس چیز کی طرف جو اس نے میز پر رکھی تھی۔

"نہا کو صاحب! یہ سینڈویچز اور چائے میں آپ ہی کے لیے لائی ہوں۔" اس نے چائے کے آگے سے کتب اٹھا کر دور رکھتے ہوئے نقل سے کہا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے پاس رکھی پلیٹ میں خوب مصوری سے سجے ہوئے سینڈویچز اور بک میں پھلپ اڑائی ہوئی چائے کو دیکھنے پر مجبور ہوئی تھی۔

"میرے لیے؟ لیکن یہاں میں نے کھانا کھا تو کیا تھا۔" اس نے سر اٹھا کر شمن کی طرف دیکھا۔

"جس بس رہتے دو کھانا کھا لیا تھا۔ دیکھا تھا میں نے تمہیں کتنا کھانا کھانا تھا تم نے۔ ایسی بھی کیا اختلافوں کی ٹیڈل کہ بندہ کھانا چاہتا ہے پھر ڈسے۔ حالت دیکھو ذرا اپنی عقلی کنوڑ ہو رہی ہو۔ مہمانی کہہ رہی نہیں کہ آپ کی دفعہ صاحبان کی ضرورت سے زیادہ ناشن لے رہی ہے۔" اس کی ڈانٹ میں پرار چھپا ہوا تھا۔ بالکل بڑی ہنسن والا عبت بھر انداز تھا اس کا اپنی لہجہ بھر مے کی سوچ پر اسے ایک دم ہی عداوت ہوئی۔ "کتنا اچھا ہے کہ لوگ ہماری سوچ نہیں پڑھ سکتے۔ ورنہ شمن کو دکھ ہوتا۔"

"ہمت مزے کے سینڈویچز بنائے ہیں میں نے۔ اس میں چکن بھی ہے۔ ٹو بیٹلر بھی ہیں اور مایونیز بھی ہے۔ کھا کر دیکھو تمہیں مزا آجائے گا۔" شمن کے کہنے پر اس نے سینڈویچ اٹھا لیا تھا۔

"مزے کا ہے نا؟" اس کے سلا نوالہ لیتے ہی شمن نے پوچھا اس نے اسی طرح پلیٹ پر نظریں مرکوز رکھتے ہوئے سر اٹھا دیا تھا۔ وہ شمن سے انگلیں نہیں ملا رہی تھی۔

"آپ میں بھی پڑھنے بیٹھ رہی ہوں۔ شرائط سے

یہ پوری پلیٹ خالی کر دینا۔ ورنہ پھر میں زبردستی سارے سینڈویچز تمہارے منہ میں ٹھونسوں گی۔" وہ اسے وضاحتی ہنڈ پر اپنی نوٹ بک اور پین لے کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر اس من موہنی سی بڑی کی طرف دیکھا جو اس کی بہن تھی لیکن بہت اچھی تھی جو اس سے بہت پیار کرتی تھی۔

"شمن! جس طرح تم مجھ سے پیار کرتی ہو اسی طرح میں بھی تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔ بہت زیادہ بے حساب کر پھر بھی تمہیں یہاں کتب کے سرے دل میں تمہارے بارے میں ایسے خیالات آتے ہیں کہ اگر وہ میں تمہیں بتا دوں تو تم مجھ سے نفرت کرنے لگو۔ اکثر تمہیں دیکھ کر میں یہ سوچتی ہوں کہ تم یہاں نہ آتیں تو کتنا اچھا تھا۔ تم اتنی ہی اچھی ہو جس اتنی اچھی کہ تم سے پیار کرنے کے علاوہ کچھ اور سوچا نہیں جاسکتا۔ کاش تم کتبوں سے لباب بھرا ہوا یہ دل نہیں رہتیں۔ تم اتنی خوبصورت کی مالک نہ ہو تیں۔ پھر کوئی بھی تم سے پیار نہ کر سکا ہو گا۔"

اس نے کمرے میں داخل ہوتے ارٹھی کو دیکھ کر اس کا دل چلنے لگا تھا۔

"بہت زیادہ صبر سے یہ دعائی ہو رہی ہے۔ گناہ ہے اب کی بار فرسٹ پوزیشن لینے کا ارادہ ہے۔" وہ بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ شمن بھی کمرے ہی میں موجود تھی۔

"میں آفس کے کلمے تو کیوں جا رہا ہوں۔ جلدی سے اپنی فرائض تھا۔ کیا کیا چیزیں ملاؤں تمہارے لیے وہاں ہے۔"

"جو مجھے چاہیے وہ تم مجھے بھی نہیں دے گے۔" وہ چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"یار! مہمانے تو بس پونہ ایک بات کہی تھی۔ تم پلاؤجہ لن کے ڈانٹنے پر اپنی سیریس ہو گئی ہو۔" بیٹے یقین سے وہ اس کی خاموشی کی وجہ بتا رہا تھا۔ انہوں نے اس بات کے علاوہ اور کوئی بات ہوئی نہیں سکتی تھی۔ یہ بالکل اتفاقی ہی تھا کہ جس روز ارٹھی کے کزن ان لوگوں کے گھر آئے تھے اسی روز صبح مہمانے اسے

مختصر میں سیریس نہ ہونے اور اپنا وقت بیکار کے مشغلوں میں ضائع کرنے پر خاصا تفصیلی پیکر دیا تھا۔ ارٹھی اس وقت وہیں بیٹھا ہوا تھا اور اس نے ہمیشہ کی طرح مہمانے کے ساتھ صبا کی طرف داری بھی کی تھی۔

"مہمانہ ڈانٹ بہت اچھا آئے گا اس بات کی آپ کو میں گارنٹی دے رہا ہوں۔ ہر ایک کا رہنے کا لینا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ صبا ہر وقت کتابوں میں منہ گھسا کر نہیں بیٹھتی، لیکن جس وقت بڑھتی ہے تو پھر پوری سنجیدگی سے بڑھاتی کرتی ہے۔" اور ارٹھی ہی کی وجہ سے مہمانے اپنی ڈانٹ اور لکچر کا دورانیہ توڑا مختصر کر دیا تھا۔ شمن اپنے برٹل پر ڈانٹ کر اسے جاتے ہوئے ان دونوں کی طرف بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ ارٹھی نے شمن کی توجہ محسوس کی تو بظاہر اسے نظر انداز کیے صبا سے بولا۔

"مہمانی صبا تو ہنسی کھانکھاتی اور شرارتیں کرتی ہوئی ہی اچھی لگتی ہے۔ بڑی بی ٹائی کی بزرگ اور سنجیدہ خواتین تو یہی پہلے ہی خاصی اعداد میں موجود ہیں۔ اہل اور مہمانیں جن خاتون کے جیسا بننے کی نصیحتیں کرتی ہیں خدا کے لیے تم ان کے پیچھے مت ہو جانا۔" اس کے چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں بڑی شرارت چمک رہی تھی۔ شمن نے پٹیل اور ریو ایک طرف دیکھ کر ارٹھی کی طرف ہنسی باریں نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ اس سے بے نیاز صبا سے باتوں میں مصروف تھا۔ لیکن آنکھوں کی چمک جا رہی تھی کہ وہ شمن کے تاثرات کو انجوائے کر رہا ہے۔

"آپ کو میری پسند معلوم تو ہے جس جو آپ کو اچھا لگے ہے اسے لگے گا۔" وہ اس کے اصرار پر آہستگی سے بولی۔ کچھ دیر تک وہ اس سے اس کی بڑھتی کے بارے میں باتیں کر کے کمرے سے چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کے مزاج کی تبدیلی گھر کے کسی فرد کے لیے بھی قابل قبول نہیں۔ ابھی تو احتیوں کا ہمارا تھا اس کے بعد اس کے پاس سب سے الگ تنگ اور خاموش رہنے کے لیے کیا ہمارا ہو گا؟ وہ پریشان ہوئی تھی۔ لہاں تک بھی جو اسے شمن

کے آنے کے بعد سے اکثر اس جیسا بننے کی نصیحت کرنے لگی تھیں۔ کل بے اختیار کہہ بیٹھیں۔

"میرے گھر کی بیل خاموش کیوں ہے۔ تم سے ہی تو اس گھر میں رونق ہے صبا! ان کل تو گھر کے کوڑا ہے۔ ایسی خاموشی کوئی شور مچا رہی نہیں۔"

وہ پریشان ہوئی تھی۔ اس کے بدلے دوسرے کو کوئی قبول نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہنسنا اور شرارتیں کرنا چھوڑ دے ارٹھی کے آگے پیچھے پھرتا چھوڑ دے۔ نظر سے لڑنا چھوڑ دے۔ ان سے بحث کرنا چھوڑ دے۔ اسے خود کو بدلانا ہو گا۔ صبا کو لب بڑا ہونا ہو گا۔ اپنی خوشی اور غم چھپانا سکھنا ہو گا۔ اب وہ کبھی کسی کو صرف صبا شفیق کا دل رکھنے کی خاطر چہرے پر جھولی مسکراہٹ نہیں چھاندے گی۔

وہ دوبارہ سے پہلے والی صبا بن گئی تھی۔ ارٹھی تو کیوں سے واپس آیا تو اس کے لیے بہت سی چیزیں لایا تھا۔

"یہ رہیں تمہاری چاکلیشن۔ یہ تمہاری کی چیونز دیکھ لو یہ ساری کی ساری تمہاری پسند کے کارٹون کی پیکرز کی کی چیونز ہیں اور یہ ہیں تمہاری پسند کے ٹکڑے فل چین اور پٹیل سب سے خاص چیز ہے یہ کیلکولیٹر جب تم یونیورسٹی جانا شروع کرو گی تو اس سے تمہیں بہت مدد ملے گی۔" اس نے کیلکولیٹر اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے بتا چلا کہ صبا کو اس طرح کی چیزیں لا کر دینا کون ہے۔" شمن جو کی چیونز کو بغور دیکھ رہی تھی مسکرا کر بولی۔

وہ شمن کی بات سے بغیر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی اور وہاں سے اپنا کالنگ ٹیک اٹھا کر لے آئی۔ پہلی کی گئی ہوئی چند کی چیونز انار کر اس نے ان کی جگہ ارٹھی کی لائی ہوئی ٹی کی چیونز لگائی شروع کر دی تھیں۔

ارٹھی اس کام میں اس کی مدد کر رہا تھا۔ "مہمانہ شروع سے شوق ہے اس طرح کی چیزیں جمع کرنے کا۔" کی چیونز اس کے بیگ پر لگاتے ہوئے ارٹھی نے شمن کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"مہمانہ ہی اس کے پاس مار کر اور پٹیلوں کا لینا

زبردست زخموں سے۔ مجھے بھی جوش سے نئی نئی طرح کے چین جمع کرنے کا شوق رہا ہے۔
 ”پھر تو مجھے تمہارے لیے بھی اس طرح کی کوئی چیز ضرور ملنی چاہئے تھی۔“ وہ بیک اور کی جھکن سے توجہ دنا کر غصے کی طرف دیکھتے ہوئے آسف سے بولا۔

”تم بھی بتائی تھی تو نہیں ہوا اپنی پسند ناپسند اجاڑا ہونا تو میں تمہارے لیے بھی دو چار منفرد قسم کے چین لے آتا۔“ اس کے لیے میں فیوس کے ساتھ ساتھ نکلی بھی تھی۔

”یہ تو میں جیسے ہی ایک بات کہہ رہی تھی اور ویسے بھی آپ اپنے برنس کے کام سے گئے تھے میرے صاحب سے تو اس پر فیوم کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“ شمن نے اسے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔
 ”شمن کو جو پر فیوم ارٹھنی نے مجھے میں دوا بہت تھی تھا۔ لیکن میرے سارے مصلوں کی قیمت کے ساتھ اگر اس پر فیوم کا مقابلہ کیا جاتا تو یقیناً ”عبا“ کے تھے قیمت میں زیادہ تھے۔ وہ ایک اکیلا پر فیوم جو بہت منگواؤ تھا لیکن عبا کے لیے آئے بہت سارے مصلوں کی مشق کہ قیمت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے لینے کے لیے سا کاہل چل رہا تھا۔ اس کاہل چاہ رہا تھا کہ وہ شمن سے خرید بدل لے۔ اس کاہل چاہ رہا تھا کہ وہ شمن سے کہے۔

”یہ سب چیزیں تم لے لو مجھے بس صرف یہ پر فیوم لے لینے دو۔“ ارٹھنی سے اس کے لائے ہوئے تمام تحائف کے لیے بہت شکریہ ”کہہ کر اور ان پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کر کے جب وہ کمرے میں نکلی تو اس کی سب سے پہلی نظر ڈرنیک بھلی پر پڑی اس پر فیوم پر پڑی جسے ابھی کچھ دیر پہلے ہی شمن نے یہاں رکھا تھا۔ اسے حد محسوس ہوا۔ اپنے سب تحائف اٹھا کر پیچیدگی دینے کو دل چاہا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم بیک وقت کسی سے محبت بھی کریں اور نفرت بھی؟ اسے کبھی شمن سے محبت محسوس ہوتی اور کبھی شدید نفرت۔ اس وقت وہ شدید نفرت کے حصار میں تھی۔
 ”تم یہاں پر کیوں آگئی ہو شمن لو ابس چلی جاؤ۔ خدا

کے لیے واپس چلی جاؤ۔ مجھ سے میری محبت مت چھینو۔ میں نے اس شخص سے بہت شدید محبت کی ہے اور اس کے علاوہ میں بھی کسی سے محبت نہیں کر پاؤں گی۔“



اس روز کھانے کی میز پر پایا اور ڈیڑھ ”ارٹھنی“ کے چلیان کے برنس قرب کو موضوع گفتگو بنائے ہوئے تھے۔ جس کام سے کیا تھا اسے بڑے شہادار طریقے سے مکمل کر کے آیا تھا۔ کھانے کے دوران سارا وقت یہی باتیں ہوتی رہی تھیں۔

”ارٹھنی بھائی تھے ذہین ہیں۔ میں تو ان سے بُری طرح لپیٹ رہی ہوں۔“ چائے پیتے ہوئے شمن نے اس سے کہا۔ کھانے کے بعد ظہر کی فرمائش پر شمن کچن میں چائے بنانے آگئی تھی۔ کام کرتے ہوئے وہ مسلسل ارٹھنی کی ذہانت ہی کو دیکھنے کیے جا رہی تھی۔

”ارٹھنی بھائی مجھے بتا رہے تھے کہ انہیں مختلف لپا میں سیکھنے کا بہت شوق ہے اور اس چیز نے انہیں نوکیوں میں کتنا کامیاب بنایا۔ آپ کہیں کوئی برنس لڑل کرنے گئے ہیں اور جس کے ساتھ آپ کو معلومات ملے کرنے ہیں آپ اس کے ساتھ اسی کی زبان میں بات کریں تو وہ شخص تو آپ کو فوراً ہی اہمیت دے گا۔“ وہ شمن کی تجویز پر غور کرتی رہی۔

”ابھی نہیں شاید پتا نہیں ہے شمن! کہ یہ شخص ڈرنیک کے ہر میدان میں یونہی جیتا آیا ہے اسی لیے شمنیں حیرت ہو رہی ہے۔“

”ارٹھنی بھائی تھے جیسے ہیں خاصا مجھے تو زیادہ تر ہوتا ہے اس بات پر کہ وہ ہم لوگوں کے کزن ہیں۔“ باقی سب کو لادون میں چائے دے کر وہ دونوں لائن میں آگئی تھیں۔

”اور جیسا ہے مبادا ارٹھنی بھائی جب مجھے یونہی دیکھ لیتے آتے ہیں تو میری فریڈ ڈون کے بارے میں سننے

زبردست قسم کے کھٹکس دیا کرتی ہیں۔“
 ”سیکھ، سونیا اور شسٹا تمہیں کتنی ہیں۔“

”تمہارے اس کزن میں عجیب سی کشش ہے۔ میری بعض کلاس فیلوز جن سے میری خاص دوستی بھی نہیں ان تک نے اپنی طرف سے بڑی لادوانی سے باتوں باتوں میں مجھ سے ارٹھنی بھائی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔“ جی صبا! لڑکیوں اور لڑکوں کی باتیں ہیں۔ پتا نہیں انہیں یہ بات معلوم ہے بھی یا نہیں کہ وہ لڑکیوں میں کتنے پاپو کر رہے ہیں۔ وہ چائے کے سبب لیتے ہوئے ارٹھنی ہی کو موضوع گفتگو بنائے ہوئے تھے۔

”وہ بے وقوف تو نہیں ہیں شمن! انہیں خاصے ذہن آتی ہیں۔ ظاہر ہے انہیں یہ بات ابھی طرح معلوم ہوئی۔ بلکہ دل ہی دل میں وہ اس بات پر بہت خوش بھی ہوتے ہوں گے اور کیا تاہم شمنیں یونہی دیکھ لیتے جاتے ہی اس لیے ہوں لڑکیوں کے ہاتھ بن کامیاب لینے کے لیے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ ارٹھنی بھائی اس طرح کے ہرگز نہیں ہیں۔“ شمن نے اس کے ہنسنے کو ناپسند کیا تھا۔
 ”تو تم اس مقام تک آگئیں کہ شمنیں ان کی برائی بڑی لگ رہی ہے۔“ وہ خاموشی سے شمن کی طرف دیکھتی رہی۔



”تم سو گئیں صبا!“ شمن چائے نماز نہ کر کے رکھتے ہوئے بولی۔

”فی اللیل تو جاگتی ہوئی ہوں۔“ اس نے بعد آٹھ گھنٹوں کھول کر شمن کی طرف دیکھا۔ وہ کمرے کی لائٹ آف کر کے چٹ بلب جلانے کے بعد بیڈ پر ڈھکی تھی۔

”میں تم سے ایک بات شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ بہت پر عمل بات۔ میں اس بات کا ذکر کم سے کرنا نہیں چاہتی تھی بلکہ کسی سے بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر پھر بھی میں تم سے اس بارے میں بات کرنے سے خود

کو روک نہیں پا رہی ہوں۔“ شمن کی مدھم مدھم سی آواز اس نے بڑے غور سے سنی۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھنے کے بعد اس کی طرف گروت لے گئے تھے۔

”تمہو سکتا ہے نہ نفس میرا دم ہو۔“ انہوں نے منہ سے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ شاید میں خود ہی ان کی توجہ اور التفات کے غلام بنی نکال رہی ہوں۔ مگر اس سے پہلے ایسا بھی نہیں ہوا تھا۔ انہیں کمزوریاں آسٹریلیا میں میرا ایک کلاس فیلو دل و جان سے مجھ پر فدا تھا۔ ہر وقت میرے آگے پیچھے پھرتا رہتا تھا۔ مگر مجھے اس میں کبھی کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کبھی اس کا دلچسپا اور باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ لپا کے ایک دوست کا بیٹا تھا وہ بھی بھانے بھانے سے ہمارے گھر میری وجہ سے آیا کرتا تھا۔ میں نے کبھی کسی لڑکے کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا۔ جب میں یہاں آئی تو شوروں میں ارٹھنی بھائی کی توجہ کو صرف ایک کزن کا اچھا سلوک سمجھتی تھی۔ مگر پھر پتا نہیں کیوں مجھے اہستہ اہستہ ان کا یہ انداز اچھا نہیں لگتا۔ تم جتنا صبا! ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ میرے بارے میں کچھ مختلف انداز سے سوچتے ہوں؟ کیا یہ صرف میرا وہ نام ہے یا وہ ارٹھنی مجھے غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں؟ اس نے ہچکچاہٹ کے ساتھ اپنی بات مکمل کی تھی۔

”تم آج کل سارا وقت ان ہی نظیروں کے حصار میں رہتی ہو۔ پھر بھی یہ بات پوچھ رہی ہو؟ کیا تم اس شخص کی نگاہیں بڑھانے نہیں جانتیں؟ جن میں تمہارے لیے محبت اور دلہانہ چاہت کے سوا کچھ اور ہو سکتی نہیں ہے۔“ اس نے شمن کی طرف غور دیکھتے ہوئے سوچا۔

”تم میں کس بات کی کمی ہے شمن! تم سے تو کوئی بھی محبت کر سکتا ہے۔ خوش قسمت تو وہ ہو گا جس سے تم بھی محبت کرو گی اور یقیناً وہ خوش قسمت انسان ارٹھنی بھائی ہی ہیں۔ اور جو وہ بھاگے بھاگے شمنیں یونہی دیکھ لیتے اور لے جاتے ہیں تو یقیناً ”خدا“ مت خلق کے طور پر تو وہ ایسا ہرگز نہیں کرتے ہوں گے۔“ وہ اس سے کسی بھی قسم کی غلطی اور دل توڑنے والی بات

نہیں کہہ پائی تھی۔ شمن اس کی بات سن کر بکھٹ ہی
 سکر لگی تھی۔
 ”لیکن صبا! مجھ میں اور ان میں کتنا فرق ہے۔ وہ
 کہنے کو ایسا فانی ہیں کہ سوتے بند سم اور ذہن ہیں اور میں
 نے تو بھی آرزو بھی کھل نہیں کیا۔ پھر میں ان کے
 جیسی غیر معمولی شخصیت بھی نہیں ہوں۔“
 ”تو تم ان سے کچھ سال چھوٹی بھی تو ہو۔ انہوں نے
 بہت زیادہ احکیم حاصل کی ہے تو تم بھی کر لو گی۔ اب
 تک کے ایک ملک گیر کمریس تم پیشہ پوزیشن ہولڈر میں
 ہی شامل رہی ہو اور تساری خوب صورتی کی اگر میں
 نے تقریریں کرنا شروع کیں تو تمہارا چہرہ حاکم کی۔ جو
 کہ میں چاہتی نہیں ہوں۔“ اس نے اپنے والے
 انداز میں کیا۔
 ”صبا! تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا وہ واقعی بہت اچھے
 ہیں۔ سب کا خیال رکھتے والے۔ ان کا سنیس تک
 ہیو مرن کتنا اچھا ہے۔“ شمن ’ارتضیٰ کی تقریریں کرنے
 میں مصروف تھی اور وہ خاموشی سے اسے دیکھتے ہیں۔
 ”ابھی تو تمہیں یہ بتانا چاہا ہوں گا کہ اس شخص کی
 آنکھیں بولتی بھی ہیں۔ کیا تم نے کبھی ایسی زندگی سے
 بھرپور چمکدار اور دلچسپ ہوئی آنکھیں دیکھی ہیں۔ وہ
 منکرانہ ہے اس کی آنکھیں بھی منکرانہ ہیں۔ وہ مجھے
 میں ہو تو اس کی آنکھیں بھی نفاذ خاصی نظر آتی ہیں۔
 جب وہ لکھتے لکھتے کچھ سوچنے لگتا ہے تو بے خیالی میں
 قلم اپنے لبوں میں دیا لپٹا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ کتنا
 زبردست لگتا ہے۔ اسے جتنی باتیں دیتے وقت کبھی شیشے
 کے آگے کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بغیر
 شیشے میں دیکھے بھی وہ اتنی زبردست بات کہتا ہے کہ بابا
 اور ایڈی سے بھی زیادہ اچھی۔ اسے نیویس بہت پسند
 ہیں۔ اسے وائٹ لٹی اور سفید گلاب بہت پسند ہیں۔
 ماری وینا مرغ گلابوں پر مری ہے اور اسے سفید
 گلاب پسند ہیں۔ وائٹ لٹر اس کا ہیورٹ کھرے ٹال
 اسی کے تمام میری وارڈز وہ دیکھو شمن! اس میں اکثر
 لباس تمہیں سفید رنگ کے نظر آئیں گے۔ ممانعتی
 ہیں۔

”صبا تو ہزار جا کروائٹ کھر کے ڈریسز کے ماہر
 کسی اور رنگ کے کپڑوں کو اچھے ہی نہیں لگاتی۔“
 اسے کیسے کی شاعری بہت اچھی لگتی ہے۔ اب
 سروپ کی بارش بہت پسند ہے۔ وہ اپنے خیالات سے
 کم ہونچلی تھی کہ شمن کی بات سن کر جوتی۔
 ”ہمیں ان کی سالگرہ ہے نا میں سوچ رہی ہوں
 ہم دونوں مل کر انہیں کوئی تحفہ دیں۔ وہ تو کب سے ہم
 دونوں کے لیے کچھ لائے کچھ بچے پھر ہمیں بھی تو اس
 کوئی تحفہ دینا چاہیے لیکن کچھ میں کیا چیز دیتی جا رہی
 ہے میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اتنے دنوں میں میں
 کے سب لوگوں کی پسند ناپسند سے بہت اچھی طرح
 آگاہ ہو گئی ہوں۔ کس کو کھانے میں کیا پسند ہے۔ شمن
 میں کیا پسند ہے اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں۔ لیکن
 ان کی کھانے میں پسند تک کا میں اندازہ نہیں لگا پائی۔
 وہ تو ہر اش ایک ہی جیسی ر فرمت سے کھاتے ہیں۔ چا
 ہی نہیں چلتا انہیں کیا چیز اچھی لگتی ہے اور کیا
 نہیں۔“
 ”ہاں نے بچپن میں ہم تینوں کو ایک بات سکھائی
 تھی کہ کھانے کی میز پر کچھ کبھی کھانے کی برائی مت
 کرنا۔ کبھی کسی کھانے کی چیز کو کچھ کر مہ مت دینا۔
 اللہ کی نعمت کو کچھ کر مہ نہ دینا تو اللہ ناراض ہو جاتا
 ہے۔ زندگی میں سے بہت کچھ اٹھ جاتی ہے۔ ہم تینوں میں
 سے یہ بات سب سے زیادہ اچھی طرح اس نے سمجھی۔
 لیکن پھر بھی شمن! تم نے شاید کبھی خود نہیں کیا۔ اگر
 خود کر میں تو تمہیں یہ چاہی جاتا کہ اسے پیڑ ڈال کر کھائی
 ہوئی مکسڈ سبزیں بہت پسند ہیں۔ وائٹ میٹ وہ بہت
 شوق سے کھاتا ہے۔ اسے ٹی ہوئی پھلی اور سیل
 بھری ہوئی بھنڈیاں اچھی لگتی ہیں۔ چائینڈ کھانے
 اسے بہت زیادہ پسند ہیں۔ ابھی تو اس کی بہت سی
 خوبیاں اور اچھائیاں تساری نظروں سے اوجھل ہیں
 شمن! جب تمہیں وہ معلوم ہوں گی تو تم مزید اس کی
 عاشق ہو جاؤ گی۔“
 برابر برابر وہ دونوں لڑکیاں ایک ہی شخص کے
 بارے میں سوچ رہی تھیں اس فرق کے ساتھ کہ

ایک جو سوچ رہی تھی اسے بول بھی رہی تھی اور
 دوسری جو سوچ رہی تھی اسے بول نہیں سکتی تھی۔
 ارتضیٰ کی سالگرہ کا دن تھا۔ شمن نے صبح اٹھنے کے
 ساتھ ہی اس سے پوچھا تھا۔
 ”تمہارے ذہن میں کوئی گفٹ آیا۔ میں تو کل سارا
 دن سوچتی رہی لیکن کوئی چیز میری سمجھ میں نہیں
 آئی۔“ وہ ارتضیٰ کو تحفہ دینے کے لیے بہت بے چین
 لگ رہی تھی۔
 ”میں ’وائٹ بہت دن ہوئے خرید بھی چکی۔ صبا
 کی دفعہ اس کا ارتضیٰ کو تحفہ دینے کا کھل دل نہیں چاہ
 رہا تھا لیکن اس کے تحفہ نہ دینے پر کوئی اور پوچھ لیا
 میں کم از کم ارتضیٰ تو اس بات پر نہ صرف پوچھ لیا
 بلکہ اس کے پاس آ کر تحفہ نہ دینے کی وجہ بھی
 دریافت کر لی۔“
 ”ظاہر ہے صبا! جب وہ ایک روز ماما کے ساتھ شاپنگ
 کرتے گئی تھی تو ارتضیٰ کو تحفہ میں دینے کے لیے ایک
 ٹوبہ صورت سی جلی اور وائٹ خرید کر لے گئی تھی۔
 ”تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔ پر سون رات بھی
 صبا میرا اس بارے میں بات کر رہی تھی تو میں نے
 لٹی رہی تھیں۔“ شمن نے مصنوعی فحش سے کھو رہا۔
 ”مجھے کیا پتا تھا کہ تم بھی انہیں گفٹ دینے کے لیے
 اچھی بے تلب ہو۔ میں تو شروع ہی سے ارتضیٰ بھائی کی
 برتھ ڈے پر انہیں گفٹ دیا کرتی ہوں اس میں کون
 کی خاص بات تھی تو میں تم سے ذکر کرتی۔“ اس نے
 اچھے خاصے بے موت انداز میں شمن سے کہا۔ لیکن
 شمن یہاں تک کہ لٹی کی بی بی تھی جو اسے صبا کی کوئی
 بات بری ہی نہیں لگتی تھی۔ اس نے صبا کا بچہ برا لگا اور
 شہ بات کہ صبا نے اسے بچہ لایا جا کر تحفہ خرید لیا۔
 ”میں پھر ایسا کر لی کہ جا کر ان سے پوچھ لوں گی
 کہ وہ گفٹ میں کیا لیں گے۔ صبا اتنے مشکل بندے
 کو میں خود سے کیا دوں کم از کم میری سمجھ میں تو بالکل
 نہیں آ رہا۔“ اس نے نہ شمن کی بات کا کوئی جواب دیا
 نہ اس بارے میں کوئی مشورہ کہ وہ ارتضیٰ کو تحفے میں کیا
 دے۔ شمن کمرے سے چلی گئی۔ وہ خود بھی کانچ کے

لے تیار ہو چکی تھی۔
 اپنی الماری میں رکھا ہوا گفٹ اس نے نکالا اور
 ارتضیٰ کے کمرے کی طرف آگئی کمرے کا دروازہ کھلا
 ہوا تھا۔ وہ دروازہ کھلا دیکھ کر جھلکے سے دستک دے کر
 یونہی اندر جانے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن اندر کمرے
 میں ارتضیٰ کے سامنے کھڑی شمن کو دیکھ کر اس کا
 دستک دینے کے لیے اٹھا ہوا ہاتھ بے ساختہ ہی گر گیا
 تھا۔ ان دونوں میں سے کسی کی بھی اس پر نظر نہیں
 پڑی تھی۔ ایک دوسرے کے آگے سامنے کھڑے ہو
 کر انہیں یہ حقیقت نظر اچھی کیسے لگتی تھی۔
 ”میں آپ کو سالگرہ کی مبارکباد دے رہی ہوں۔
 پوچھنے آئی ہوں کہ آپ مجھ سے گفٹ میں کیا لیں گے
۔ بہت غور و فکر کیا میں نے لیکن آپ کو دینے کے
 لیے کوئی چیز میری سمجھ میں نہیں لگتی۔“ وہ ستانہ سے
 انداز میں اس نے منکرانہ ہونے پر چما۔ وہ بال سے
 فوراً ”پلٹ جانا چاہتی تھی۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔
 ارتضیٰ نے شمن کی بات بڑے غور سے سنی کچھ دیر وہ
 یوں خاموش رہا جیسے اس بارے میں سوچ رہا ہو۔ پھر
 اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بہت
 کمرے اور گیسر کے لیے میں پوچھا۔
 ”جو میں تم سے آٹھوں کا وہ تم مجھے دو گی شمن؟“
 شمن کا اس بات پر کیا رد عمل تھا وہ کچھ نہیں پائی۔
 کیونکہ وہ وہاں رہی ہی نہیں تھی۔ تیزی سے چلتے
 ہوئے وہ لوہے اپنے کمرے میں آئی اور کرنے والے
 انداز میں وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ گفٹ اس کے ہاتھوں
 سے پھسل کر کابریٹ پر گر گیا تھا۔ وہ وہاں رک کر کیا
 کرتی؟ اقتار کا وہ اس کے لیے نہیں شمن کے لیے
 تھا۔ وہ لحد وہ اقتار اور وہ شخص شمن کے لیے تھا اسے
 دونا نہیں آ رہا تھا وہ ساکت بیٹھی اپنے دل کے کرجی
 کرتی ہو کر ٹوٹے اور بکھرے کی آوازیں سن رہی
 تھی۔
 عجب ہے در محبت کا جو مرضی پر نہیں کھتا
 نہیں پلٹا یہاں سم سم کسی کو خوش کیا دیں ہم
 ”گفٹ خائب ہو بے موت لڑکی اور اکل چھپا کر

دیکھا ہوا ہے تم نے میرا گفت؟ "شام کو ارنٹھی نے اس کی شکل دیکھنے ہی شکوہ کیا۔ اس کی طرف دیکھ کر بڑی ہنس ماری سے مسکرائی اور پھر "میں ابھی آئی ہوں کہ وہاں سے بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی اور جلدی سے تختہ اٹھا کر لے آئی۔ ارنٹھی کے ہاتھ میں اس نے تختہ پکڑا دیا جسے اس نے بخوشی "شکر" کہتے ہوئے قبول کر لیا۔ لادوچ بھی اس وقت کمرے کے سب افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ارنٹھی نے فوراً ہی تختہ کھول لیا تھا۔ خود جانی اور والٹ کا خوب اچھی طرح جاننا کرنے اور بہت ساری تعریفیں کرنے کے بعد اب وہ باقی سب لوگوں کو بھی سب کا کیا ہوا تختہ دکھانے لگا۔

"اسے کتنے جہاں جی محبت۔ کتنے چار سے جہاں سے سالگرہ کے دن سے لے کر پہلے ہی سے تختہ خرید کر رکھا ہوا تھا۔ یہ نہیں کہ وقت کے وقت اور بی بی دل سے رسم نبھانے کو بوجھ کھڑی ہو جاتی کہ ارنٹھی بھائی! آپ تختے میں کیا لکھیں گے؟" ارنٹھی کی بات سب سے زیادہ اچھی طرح پہلی ختم اور صبا ہی سمجھ سکتی تھیں۔

ختم نے ارنٹھی کی نظریں اور جیلے کی معنی خیزی محسوس کرتے ہوئے بے ساختہ اس سے نظریں چرائی تھیں۔ وہ اس کے اس انداز پر ذرا لب مسکرا رہا تھا۔ ظفر ارنٹھی کے جھٹکے سینے پر یہ سمجھا کہ وہ شاید اسے اور ختم کو مشترکہ طور پر شرمندہ کرنا چاہ رہا ہے، اسی لیے فوراً لڑنے والے انداز میں بولا۔

"بھائی صاحب! وہ دن گزر گئے جب ہم اتنے بے وقوف ہوا کرتے تھے اب ایک ہاتھ دو اور ایک ہاتھ دو کا زمانہ ہے۔ اگر گفت و مول کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر پہلے ہمیں شاندار ساؤنڈ کرانے کی بھی تم لوگوں کی پسند کی جگہ پر پھر گفت و شنود کی کوئی امید رکھیں گے۔ یہ بغیر نیت کے گفت تو آپ کو صرف تب کا چچے گروپ ہی دے سکتا ہے۔" جیلے کے انتہائی ظفر نے ایک شوخ سی نظریہ بازی ڈالی تھی۔ اسے پتا تھا چچے گروپ کھلائے جانے پر وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ یہاں اس موقع پر اس کی مشکل جھانک کر دی تھی اور محبت اس کی حالت میں بولنا شروع ہو

گئے تھے اس نے نظریہ سمیر نظریوں سے پایا کی طرف دیکھا۔

ارنٹھی بن لوگوں کو رات کا کھانا ہر کھانا لے لیا رہا تھا۔ ختم اور ظفر ساتھ چاکر ارنٹھی کے لیے ان دونوں کی طرف سے ایک مشترکہ تختہ لے آئے تھے۔ "صبا! میں کون سے کپڑے پہنوں؟" وہ بولی۔ ایک سلوہ سا سوٹ استری کر دی گئی جب ختم نے اس سے پوچھا۔

"یہ بیٹے والا یا یہ سی گرین یا پھر ایک دالا؟" وہ تین چار نظر ڈالنے کے ساتھ لگائے کھڑی تھی۔

"میں کچھ بھی پہن لوں گا۔" اس نے ان قسم ڈرامہ پر ایک لگاؤ ڈال کر سنجیدگی سے کہا۔ لیکن اس جواب سے نظریں نہیں ہوتی تھی۔ "بھائی! کیا وہاں ساپنوں؟" اس نے دوبارہ اصرار کیا۔ اس کے اصرار پر آخر کار اسے اپنی رائے دینی ہی پڑی۔ وہ آج بہت اہتمام سے تیار ہو رہی تھی۔ صبا اس کی تیاریوں کو خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ تیاری کے معاملے میں اس نے ختم کو اتنا حساس اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"سچ کچھ خاص دن ہے ختم؟ میں تو جیسے پہن کی نظریوں سے دیکھ رہی ہوں اور ظاہریات سے کچھ کم ہر طرح کی مادی لگتی ہو چاہے تم لڑان کاہر اس سبوت میں کر اور پاؤں میں نکل چپ کر لیسوں والا حلیہ بنا کر بھی میرے سامنے آؤ تو مجھے شرم تب بھی باقی ہی لگے گی۔"

(اور جن نظریوں سے آج تم خود کو جالچ رہی ہو؟ بے فکر ہو۔ وہاں تمہارے لیے سٹائش کی سٹائش ہو گی۔ وہ نظریں تمہارے چہرے کے علاوہ کسی اور کو دیکھیں گی ہی نہیں۔)

پھر جب وہ چاروں ہونٹوں میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے اپنی اپنی پینڈو ڈش سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو ختم کی طرف دیکھتے ہوئے اسے پتا چلا کہ جب کسی لڑکی کو چاہا جاتا ہے تو چاہے چالے گا تو کھانا اس احساس اسے مزید خوب صورت بنا دیتا ہے۔ ختم تقریباً "سارا وقت زیادہ تر خاموش رہی تھی۔ م

جھانکے کھانا کھا آئی اور ارنٹھی سے نظریں چرائی اور اس کے جالوں پر کھراہ لگا۔ صبا سے دیکھ کر جس حیران ہو رہی تھی۔

اس کا چہرہ کتنا دلکش کتنا من موہنا سا لگ رہا تھا۔ اس پر سے نظریں ہٹانے کو صبا کا پی نہیں چاہ رہا تھا۔ ارنٹھی ہلانے ہلانے سے اسے مخاطب کر رہا تھا اور وہ اس کی عام سی بات پر بھی بڑی طرح کنفیوز ہو رہی تھی۔

ارنٹھی بڑی مصروف زندگی گزار رہا تھا۔ اسے کبھی تقریباً "لوگوں کے ساتھ وقت گزارنے کا شوق نہیں رہا تھا۔ اس کے لہجوں سے دلچسپی آتی تھی۔ کے بعد سے لہجوں اس کے پیچھے لگی ہوئی تھیں کہ وہ شادی کے لیے کسی لڑکی کا انتخاب کرے۔ ان کی خواہشات اور خرمیوں کا احترام اپنی جگہ لیکھیں وہ اتنی جلدی شادی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ پایا اور ڈیڈی کے ساتھ مل کر اپنے بڑے کو مزید پیمانہ اور آگے بڑھانا چاہتا تھا۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ اس نے کبھی لڑکی کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ اسے وہ اپنی شریک سفر بننے کا فیصلہ کر لیا وہ خوب صورتی سے متاثر ہوا تھا کہ صرف اس سے متاثر ہو کر وہ کسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی زندگی میں آنے والی اس لڑکی کے پاس خوب صورت سوچ، خوب صورت ذہن اور خوب صورت دل ہونا چاہیے تھا۔ خوب صورت چہرہ چاہیے ہو یا نہ ہو۔ لیکن شادی سے اس کا یہ انکار اس روز دھرا کا حرا ہو گیا جب اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ ختم سے محبت کرنے لگا ہے۔ وہ لڑکی اچانک اس کی زندگی میں آئی اور بس ہر جگہ چھا گئی۔ وہ جو ہر کلمہ بہت سوچ سمجھ کر اور جذبات کو اعصاب پر سوار کیے بغیر کرتے کالو کی تھا اسے ختم سے بس ایک دم ہی محبت ہو گئی۔

وہ اچانک ہی ان سب کی زندگی میں چلی گئی تھی۔

صبا کی حیثیت سے آنے والی ابھی ہی ختم اور اس لڑکی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ تب وہ ان لوگوں کو پتا لیا سمجھ کر دور دور رہتی تھی۔ جب اس گھر کو لینا مل کر یہاں رہنے لگی تو ارنٹھی کو پتا چلا کہ ختم کا دو سرا نام محبت ہے۔ اسے خالق نے محبت کی مٹی سے تخلیق کیا ہے۔ وہ محبت کرنے اور محبت پانٹنے کے لیے بنی ہے۔ گھر والوں کی تو بات کیا تھی ان سے تو اس کا خونی رشتہ تھا۔ اسے تو راستے میں پکڑا تھتے اور بھیک مانگتے بچوں تک سے محبت ہو جایا کرتی تھی۔ وہ اپنی محبت سے سمجھ دار تھی۔ پیچیدہ تھی وہ اپنی عمر سے زیادہ ذمہ دار تھی۔ اس کی بہت سی باتیں ارنٹھی جیسی تھیں۔

ارنٹھی اس سے سب سے حد متاثر تھا۔ خود میں موجود اتنی ساری خوبیوں کے باوجود اس میں ایک بے نیازی تھی۔ اپنی خوبیوں سے بے نیازی۔ اسے جیسے اس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ وہ بہت خوب صورت ہے۔ وہ اپنے سے دوسرے لوگوں سے بہت مختلف ہے۔ اس کی خود اپنے آپ سے یہ بے نیازی اور لاسوالی ارنٹھی کی نظریوں میں اس کی خوبیوں کو کئی گنا بڑھا گئی تھی۔

پھر کچھ اور وقت گزرا تو اسے احساس ہوا کہ وہ صرف ختم کی خوبیوں سے متاثر نہیں ہے بلکہ وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ محبت کا یہ انکشاف کتنا اچانک ہوا تھا اس پر اور جب اس پر اس محبت کا انکشاف ہوا تو اسے اس محبت پر بہت حیرت محسوس ہوا۔ اس لیے کہ اس نے جس لڑکی سے محبت کی تھی وہ ارنٹھی اس قابل تھی کہ اس سے محبت کی جائے۔ ختم کے لیے ابھی کی دیوانگی خود اس کے اپنے لیے بہت حیرت انگیز تھی۔

اسے یونہی ہی سے لڑنے کی خاطر وہ اپنی ضروری سے ضروری اپائنٹمنٹ تک یکسر کر دیا کرتا تھا۔ مزید لڑکی اس کی دیوانگی سے انجان نہ ہو تو کسی ہی بے نیاز تھی۔ وہ اس کے ساتھ بڑی اچھی طرح بات کرتی تھی۔ لیکن اس میں ابھی تک وہی پہلے والا کھلف اور دوری حاکی تھی۔ کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ ختم سے پوچھے۔ "ختم! کیا تمہیں میری محبت کا احساس ہی نہیں یا

پھر تم چلوں پوچھ کر سبے نیازی غلاہر کرتی ہو۔ میری آنکھوں میں نکھار پھام تم کیوں نہیں پڑھ پائیں؟ اس کی بے قراری پر گزرتے دن کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ اس نے ارٹھنی کی آنکھوں میں منہ ہونچام پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ براہ راست اس کی نگاہوں میں دیکھنے سے گھڑانے لگی۔ اس سے بات کرتے کرتے وہ اس کی نگاہوں کی وارفتگی دیکھ کر یکتخت چپ ہو جایا کرتی۔ لیکن اس گریز اور اس خاموشی میں اس کے لیے ایک بہت خوب صورت سا اقرار چھپا ہوا تھا۔

وہ اس رات سونے سے پہلے اہل کے کمرے میں آ گیا۔ اہل اس کے لیے بالکل بال کی طرح تھیں۔ اسے ان سے بات کرتے ہوئے بھی لفظ اکٹھے کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ان سے اپنے دل کی باتیں کیا کرتا تھا۔

"اے اہل! آپ چاہتی ہیں تاکہ میں شادی کے لیے ہاں کہہ دوں؟" یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، بیٹا! تمہاری شادی تو میری زندگی کا سب سے بڑا ارمان ہے۔ جس لڑکی کو تم پسند کرو گے ہم سب اسے دل و جان سے قبول کریں گے۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ بھیرتے ہوئے پیار سے جواب دیا۔

"میری پسند وہ لڑکی ہے جو تپ سب کو بھی بہت پسند ہے۔ میں تم کی بات کر رہا ہوں اہل! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس کے منہ سے کلمہ کا ہم سن کر اہل کو بے تحاشا خوشی ہوئی۔ اس نے اس لڑکی کو پسند کیا تھا جس سے اس کی شادی اس گھر کے ہر فرد کا ارمان تھی۔ اہل! پلایا ڈینڈی اور مہا سب کے سب ارٹھنی کی تم کے ساتھ شادی کے خواہش مند تھے۔ دل کی یہ خواہش انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کے سامنے ظاہر کر دی تھی لیکن ارٹھنی سمیت بچوں میں سے کسی کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا کہ اگر ارٹھنی نے اس رشتے سے انکار کر دیا تو خواہ مخواہ آپس میں دل بردے ہوں گے۔

لیکن اس نے تو وہی بات کہہ دی تھی جو سب کی دل تھی۔ لہٰذا نے صبح کا انتظار بھی بڑی حشکوں سے کیا تھا۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے پایا ڈینڈی اور مہا کو اس بات سے آگاہ کیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں گھر کے تمام افراد کو اس بات کا پتا چل گیا۔ مہا نے تم کے لیے مندی لینے کے بعد اہل کو باقاعدہ اس رشتے کے لیے ہاں کہہ دی تھی۔ اسی دن رشتہ دیا گیا اس دن رشتہ طے ہوا اور اسی دن رٹھنی کی تائید بھی طے کر لی گئی۔ ظفر کے امریکہ جانے میں صرف چار دن رہ گئے تھے۔ اس کے جانے سے ایک دن پہلے رٹھنی کی تعزیت ہوئی تھی۔ وقت بہت کم تھا اور اہل تھوڑے دھوم دھام سے تعزیت کرنا چاہتی تھیں۔ اسی لیے کہ میں خوب بھاگ دوڑ رہی ہوئی تھی۔ ارٹھنی کے لیے سب ایک حسین خواب کی طرح تھا۔

"کون کتاب ہے محبت جگر ہے، نار سالی ہے، دھک ہے، آسو ہے۔ غلاہر بالکل غلط۔" اس نے غور سے کہا تھا۔ "محبت کرنے والوں کو بیشی تو ہی صراط کا سفر طے نہیں کرنا پڑتا۔ کبھی کبھی سب کچھ من چاہی ہو تو وہ بھلا کرنا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے میرے ساتھ ہوا ہے۔"

وہ حاسد نہیں تھی، کم ظرف نہیں تھی جو اپنی ہمن کی خوشیوں سے جلتی۔ وہ اس کی خوشی میں خوش ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے خود کو ارٹھنی کی برسرِ پہلے کی ایک سیات یاد دلانی چاہی۔ "ضروری نہیں جب جو میں چاہوں وہ مجھے مل بھی جائے۔ کبھی میرے بہت چاہتے پر بھی مجھے میری پسندیدہ چیز میں مل سکتی اور مجھے اسے نارمل طریقے سے لینا چاہیے۔"

"میں آپ بھی حقیقت پسند اور سچو ہوں۔" اس کے ہاں لوں کہ جو میں نے چاہا وہ میرے بجائے کسی اور کو مل رہا ہے۔" اس نے اس پریشانی سے ارٹھنی کی طرف دیکھا جو ہنسنے لگی تھی کہ اس نے کچھ کہہ دیا

"مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کیا محبت کرنا اور اسے پا لینا آسان ہوتا ہے؟" رٹھنی کی خوشی کی انتہا پر غور کر رہی تھی۔

"نہیں یہ سب اتنا آسان نہیں ہوتا۔ صرف چند دن کی قسمت ہوتے ہیں جنہیں محبت حاصل ہو جاتی ہے اور تم ہی چند خوش نصیب لوگوں میں سے ایک۔" وہ بے بسی سمجھ کر کہہ گئی تھی۔

رٹھنی کے پاس رتھنی پونے کے لیے بہت کچھ تھا۔ وہ بے تحاشا خوش تھی۔ رٹھنی دیر تک وہ اس کے ساتھ لڑکے اس خوشیوں بھرے یادگار دن کے حوالے سے باتیں کرتی رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے رٹھنی سو گئی لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے اس آکر کھڑی ہو گئی۔ آسمان پر جگمگا چاند اسے اس کے لیے اتنا عجیب بھی نہیں لگا تھا۔

"تم تنہا وہاں ہی لیے اسے لو اس پر۔ لو اس دست پر۔ کچھ میں بھی تمہاری طرح آج بالکل تھا ہوں۔"

وہ بے بسی کھڑکی پر کھڑی رہ گئی۔

وہ سب لوگ ایمر پورٹ پر ظفر کو سی آف کرنے آئے تھے۔

"جیسے ہی تصویریں آئیں گھبرا۔" مجھے بھیچا۔ "ظفر نے تم کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اے! تم نے دیکھا کیا کہ اس نے اس معاملے میں بھی میرے ساتھ بالائیلی کی ہے۔ ارٹھنی کے دل جانے پر یہ کیسے پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور وہ دیکھیں گئے منہ سے کھڑی ہے۔" وہ جانتے جانتے بھی اسے پیچھے رہا تھا۔ اس کے طعنہ دینے پر سب اس پر ہنسے تھے۔ یہاں تک کہ رٹھنی بھی ہنسنے لگی تھی۔

وہ سب کو خدا حافظ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ وہ آگے بڑھ اس نے گردن موڑ کر سب کی طرف دیکھا تو ظفر سب پر سے ہوتی ہوئی صبا پر جا کر ٹھہر گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ

بالکل خاموشی سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک دم پلٹ کر واپس گیا۔

"ارے صبا! میں غلط کر رہا تھا۔" وہ اس کے پاس آ کر بولا۔

"ظفر بھائی! آپ جلدی واپس آئے گا۔ اب آپ ارٹھنی بھائی کے ساتھ کوئی نیم ٹھیکس کے تو میں آپ کو سپورٹ کر لوں گی۔" وہ روتے ہوئے اسے لیٹن دلا رہی تھی۔ ظفر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

ظفر کے جانے پر اسی اور خوشی کے طے چلے جذبات لیے وہ لوگ گھر واپس آ گئے تھے۔ شام تک سب بونہی کچھ خاموش خاموش سے رہے۔ ارٹھنی، رٹھنی کو ڈر کر اپنے گھر پر جا رہا تھا۔

"مہا! تم بھی چلو۔" ارٹھنی نے آفر کی۔

"مجھے کباب میں بڑی ہنسنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

اظہاراً "مجھے ساتھ چلنے کو کہہ رہے ہیں اگر میں واقعی چلنے کے لیے تیار ہو گئی تو مل ہی مل میں مجھے گالیاں دیں گے۔ پھر مونا! آپ دو گولے مجھے یہ واشت کریں گے اور میری وجہ سے آپ لوگوں کو آپس میں اختلاف احتقان کھٹکھٹا کر پیڑے گی۔" وہ مسکراتے پھر آپ اس سے پاکستان کی غلامی اور آکرانک بالیمیزڈ سسکس کریں اور یہ آپ کو کو بھی کے پھول اور گیندے کے پھول کے درمیان، وہ خود بخود ہی فرق سمجھانے لگے۔

اس کے منہ پھٹ سے انداز پر ارٹھنی قہقہہ لگا کر ہنس رہا تھا۔ کچھ رٹھنی اہل کی موجودگی کی وجہ سے بری طرح تنجیب لگی تھی۔ خود اہل کے لبوں پر اس کی بات سن کر مسکراہٹ نہ دینی تھی۔

وہ سب لوگ ایمر پورٹ پر ظفر کو سی آف کرنے آئے تھے۔

اس نے یونیورسٹی میں ایڈ مشن لے لیا تھا۔ وہ کیمسٹری میں آنرز کر رہی تھی۔ وہ اور رٹھنی یونیورسٹی ایک ساتھ جایا کرتی تھیں۔ اس نے اپنے ذہن سے سب سوچوں کو جھٹک کر غور و برعائی میں مصروف کر لیا تھا۔ وہ اب اسکیل میں بھی نہیں روٹی تھی اس نے

جیسے اس رشتے کو قبول کر لیا تھا۔ دنیا میں ارتضیٰ غضنفر
 ہی تو ایک اچھا شخص نہیں اس جیسے بلکہ اس سے
 بھی زیادہ اچھے مرد اس دنیا میں موجود ہیں۔ اسے شرم
 پسند ہے تو ٹھیک ہے۔ وہ کیوں بیکار میں خود کو بیکار
 کرے۔ ایسے شخص کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ
 کیوں اس میں رہتی رہتی ہے اس سے بھی عجب بھی ہی
 نہیں۔ اس نے ارتضیٰ غضنفر کے ساتھ اپنی ایک طرف
 محبت کو محبت قرار دے کر خود کو مزید اس محبت میں
 جتا رہے ہیں۔ وہ کہہ دیا تھا کہ
 رات کے کھانے کے بعد وہ سب لوگ لانچ میں
 بیٹھے ہوئے تھے۔ شرم سب کے لیے کافی بنا کر لے آئی
 ۔ ارتضیٰ کا اگرچہ آج کل کراچی میں قیام بہت مختصر
 ہو تا تھا، پھر بھی اس مختصر وقت میں شرم کی کوشش
 ہوتی تھی کہ وہ اس کی پسند کی چیز بنا کر کھائے
 رات میں اسے کافی بنا کر دے۔ وہ ارتضیٰ کے پیچھے لگ
 لگ کر اس سے پوچھتی تھی کہ وہ کیا چیز کھانا چاہتا ہے۔
 صبا کو اب اس کے لیے کافی بنانے اور ناشتہ دینے کی کوئی
 ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کی اس سب ضرورتوں کا
 خیال رکھنے کے لیے شرم کافی تھی اور صبا کو اس بات
 سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تھا کہ
 ارتضیٰ نے کپ اٹھا کر پھاگھونٹ لیا اور فوراً
 پلا۔
 "کافی اچھی ہے شرم لیکن اس میں وہ بات نہیں
 ہے جو صبا کے ہاتھ کی بنی کافی میں ہوتی ہے۔" اس کے
 اس صاف کواڈاؤ کا شرم نے ذرا بھی برا نہیں مانا تھا۔
 "واقعی صبا بہت اچھی کافی بناتی ہے۔ میں کتنی بھی
 کوشش کر لیوں اس کے جیسی مزہ دار کافی نہیں بنا
 پاتی۔" اس نے بڑا اعتراف کیا تھا۔
 "اچھا کھانا بہت لوگ بنا لیتے ہیں لیکن اچھی
 چائے اور اچھی کافی بنانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔
 کیوں پایا ابھی ٹھیک کہہ رہی ہوں؟" وہ بڑے موڈ میں
 اس کی تعریف کرتے ہوئے اب پایا کی طرف سوالیہ
 نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پایا انہی انداز میں مسکراتے
 ہوئے خود بھی کچھ نئے دالے تھے۔ وہ خاموشی سے

بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ اسے اپنی اس تھوڑی سی
 خوشی نہیں ہوتی تھی۔ پتہ بچھ کر کی جانے والی اس
 طرف لوگوں پر اس لیے کوئی خوشی نہیں ہوتی تھی۔
 اس نے ارتضیٰ غضنفر کے بارے میں سوچنا
 چھوڑ دیا تھا لیکن پھر بھی وہ اس کے کراچی میں
 وجہ سے مشترب ہو جایا کرتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ
 وہ ایک دن کے لیے بھی کراچی نہ آئے۔ اس کی
 موجودگی اسے برا سکون پہنچاتی تھی۔ وہ جب بیکار
 تو اسے دیکھ کر ہر لمحہ اسے ایسا لگتا جیسے اس کی کوئی
 اپنی چیز جس کی وہ مالک تھی جیسے وہ کسی اور کو دے
 مگر بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ مسلسل اس سے
 ہوتی چلی جا رہی ہے اور وہ بے بسی سے کھڑی ہے۔
 سے دور جانا کچھ رہی ہے۔
 اپنی اس سوچ پر وہ خود کو سخت لعنت مانت رہی۔
 خود سے غصا ہو جاتی تھی۔ اسے اس شخص کے بارے
 میں کچھ نہیں سمجھتا۔ اسے اس شخص کی قطعاً
 نہیں وہ شرم سے شکایت کرے یا کسی سے بھی اس کی
 بلا ہے۔
 شرم کے اچھانوں کے فوراً بعد شادی کی کہانی
 دی گئی تھی۔ گھر میں کئی دن پہلے سے ڈھونڈ رہی
 شروع ہو گئی تھی۔ ان لوگوں کی کڑکڑ اور شرم کی
 ہیلیاں سب مل کر رات گئے تک ڈھونڈ رہی تھی۔
 گیت گاتیں۔ شرم بھی شرمائی شرمائی سی لہن لہن
 کے پاس ہی بیٹھی ہوئی۔ ماما ہر ماہ شرم کے خوشیوں
 سے جھگڑاتے اور مسکراتے چہرے کو دیکھ کر شاہد
 کہیں اس کی خوشیوں کے راکھی ہونے کی امان
 کرتیں۔
 "اماں! دعا کریں میری بیٹی کی خوشیوں کو کسی کی نظر
 نہ لگے۔" اس روز رات کو وہ اماں کے کمرے میں
 کے پاس بیٹھی پایاں کے فیکشن کے بارے میں ان کی
 مختلف باتیں سن رہی تھی جب ماما کمرے میں آئے
 اماں کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولیں۔
 "دیکھ! تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹی! آپ
 بچوں کی خوشیوں کے لیے دعا کرنے کے علاوہ

کچھ نہیں کر سکتے۔" وہ کہہ کر اس کے کمرے میں
 اٹھ اٹھ کر گئے اور کچھ دیر بعد واپس آئے۔
 "تم سوچیں نہیں ابھی تک؟" پایاں میں سے بیڑ
 میں لڑکھٹک میں پر اچھالتے ہوئے اس نے
 پوچھا۔
 "بہت دن رہ گئے ہیں تمہارے ساتھ اس کمرے
 میں گزارنے کے لیے میں ان دنوں میں سونے کے
 بے رحم سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"
 "کچھ اور اس سے بولیں۔ وہ چلی کھول کر بالوں میں
 اپنی پلائی ہوئی بند پر آئی۔
 "صبا! تمہارے اس کمرے میں میں نے اپنی زندگی
 راست خوب صورت دور گزارا ہے۔ یہاں ہے شرم
 بہت تم نے میرے آسہ صاف کر کے مجھے جینے کا
 اصل دیا اور میں میں نے اپنی زندگی کا سب سے
 میں خواب دیکھا پھر اپنے اس حسین خواب کو تعبیر
 نے دیکھا۔" اس کی آنسو سے ایک دم ہی آنسو بہنے
 لگے۔
 "پتھل ہو، تم کون سا شخص ہو کر کسی دوسرے
 کو میں جانے والی ہو کہو ہوں، دور رہی ہو۔" شرم نے یہ کہہ
 دیا تو یہ قرار ارتضیٰ بھائی لے لے اور ارتضیٰ بھائی کا
 کہہ میں لے لے رہی ہوں۔" اس نے روتے روتے صبا کو
 غور کر دیکھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے
 ہاتھ خشک کرنے چاہے تو وہ اس کے کندھے پر سر رکھ
 کر اور شدت سے روتے لگی۔
 "محبت کمرے کی نہیں ہے۔ محبت تمہاری ہے۔
 ہا شفیق کی، میری، بہن کی، میری سب سے اچھی
 محبت کی۔ میں تمہیں مس کر لی کی صبا! وہ مسلسل
 روتے چلی جا رہی تھی۔
 "تم میں کیا ہے صبا! میں تم سے کچھ بھی چھپا رہی
 ہوں۔ میرا دل خود بخود تمہاری طرف مچھلتا ہے۔"
 اس سے محبت کا وہ لہانہ انداز میں اقرار کر رہی تھی
 صبا کے اندر دور تک نہا پھیل گیا تھا۔

"میں اس محبت کےائق نہیں شرم!"
 آسمانی رنگ کا شرابہ بنے بہت نفیس سی چو لری
 اور مہارت سے کیے گئے ٹیک اپ کے ساتھ وہ بے حد
 خوب صورت لگ رہی تھی۔ اپنے لیے سلی بالوں کو
 اس نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بالوں کی بچ سے ٹانگ نکال کر
 جو نازک سا ٹیکا اس نے ماتھے پر چھایا تھا اس نے اس
 کی تیاری کو مزید نکشی عطا کی تھی۔
 "صبا! تم لڑکے والی ہو یا لڑکی والی؟" ظفر شادی سے
 پانچ دن پہلے آگیا تھا اور آتے ہی اس نے شادی کے
 بہت سے کلام اپنے ذمے لے لیے تھے۔ لیکن صبا کے
 ساتھ چھینچھان بھی جاری تھی۔
 "میں لڑکے والی بھی ہوں اور لڑکی والی بھی۔"
 "شرم! اس خدا کا خیال رکھنا۔ کیس جیسا نہ ہو
 آخری وقت میں یہ تمہیں ہری بھنڈی دکھا کر دوسا کی
 گاڑی میں بیٹھ کر بات کے ساتھ گئے۔" ماما نے
 فکشنز بڑی اچھی طرح ہو گئے تھے۔ شادی کے دن
 بھی وہ بڑی متحرک سی اوھر سے اوھر پھر رہی تھی۔
 "دھن کی بہن کو ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہیں پڑ
 رہی۔ وہ الگ ہی نظر آ رہی ہے۔" اماں نے اس کے
 گلے پر ہاتھ کرتے ہوئے تعریف کی۔
 "آج کا دن تو میں صبا کا ہے۔ اس کے آگے ہم
 سب کی تیاریاں بالکل فضاں لگ رہی ہیں۔ ویسے یہ
 سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں دھن کی بہن کیس یا
 نہ۔" اس کے کانٹنس پر بالی سب کڑکڑ رہی ہیں۔
 وہ خود بھی مسکراتے ہوئے پایا کی بات سننے چلی گئی۔ اس
 کے پاس اپنی کیفیتوں کا تجزیہ کرنے کی فرصت نہیں
 تھی لیکن اتنا انداز تو اسے تھا کہ بھری گھٹل میں تنہا
 ہونے کی یہ کیفیت توجہ سے اسے اپنی پوٹ میں
 لیے ہوئے تھی۔ اسے رونا آ رہا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا
 وہ کس چٹپ چائے اور سب سے چھپ کر بہت سا
 روئے۔ نکال کے وقت شرم کے ایک طرف لال اور
 ایک طرف مڑا بھی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی شرم کے

ہوئی تمام لڑیاں نوچ ڈالے۔ اس کمرے میں چاروں طرف بکھرے ان پھولوں کو اپنے قدموں تلے مسل ڈالے اور ان پھولوں کے درمیان بیٹھی اس حسین لڑکی کو کہیں غائب کر دے۔ آج کتنے دنوں بعد بے اختیار پھر اس کے دل سے یہی جملہ نکلا۔

”تم یہاں پر کیوں آگئیں شمن! تم یہاں نہ آئیں تو کتنا اچھا ہوتا۔“ سب کزنز، شمن کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔ وہاں اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنا لی نہیں دے رہی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ دروازہ لاک کر کے اس نے خالی کمرے کو ایک نظر دیکھا۔ آج یہاں شمن نہیں تھی۔ وہ اپنے کمرے میں بالکل اکیلی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے رو سکتی تھی۔ دل کی دنیا کے لٹ جانے کا ماتم کر سکتی تھی۔ اتنے گھنٹوں سے خود کو سنبھالتے سنبھالتے وہ تھک چکی تھی۔ خود پر سے اختیار کھوتی وہ ہلک ہلک کر رو پڑی تھی۔ جتنا وہ رو رہی تھی اتنی ہی اس کی وحشت بڑھ رہی تھی۔

”کیوں نہیں مجھے میری محبت ملی؟ جسے میں نے چاہا وہ کسی اور کو کیوں مل گیا؟ ایسا کیا ہے شمن میں جو مجھ میں نہیں ہے؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ اس شخص کو چاہتی ہے؟“

وحشت زدہ انداز میں اس نے اپنا ٹیکا نوچ ڈالا۔ پھر گلے کا ہار، کانوں کے بندے، وہ جنونی انداز میں سب کھینچ کھینچ کر اتارتی رہی۔ چند منٹوں میں اس نے اپنے روپ کو اجاڑ ڈالا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر خود کو آئینے میں دیکھا اور پھر اسی سے سرٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”ایسا کیا گناہ کیا تھا میں نے جو تو نے میرے منہ پر لکھ ڈالا؟“

”اگر وہ مجھے نہیں ملنا تھا تو پھر اس کی محبت بھی میرے دل میں نہ ڈالی ہوتی۔“ وہ روتے روتے کاہٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

”کیوں ڈالی میرے دل میں اس شخص کی محبت؟ مجھے مل نہیں سکتا تھا۔“ اس سے اپنی چیخیں دبائی نہیں

قریب ہی کھڑی ہوئی تھی۔ جس وقت شمن نے نکاح نامے پر دستخط کیے، اس نے اپنے ارد گرد سناٹا پھیلتا محسوس کیا۔ اسے ایک مرتبہ پھر ایسا لگا جیسے وہ کسی ریگستان میں تنہا کھڑی ہے۔ کہیں کوئی آواز نہیں۔ دور دور تک کوئی اپنا نہیں۔ وہ بالکل تنہا ہے۔

کوئی اس کے رونے پر متعجب نہیں تھا نہ اس کے برابر میں کھڑی کسی کزن نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ شمن کو اسٹیج پر لا کر ارتضیٰ کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا۔ ان دنوں کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر اسے آج بھی بالکل ویسی ہی تکلیف ہوئی تھی جیسی پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہونے پر ہوئی تھی کہ ارتضیٰ غضب فر جس لڑکی سے محبت کرتا ہے وہ صبا نہیں بلکہ شمن ہے۔

وہ اپنے آپ سے لڑ رہی تھی۔ خود کو سیرزش کرتے ہوئے آنسوؤں کو بار بار پیچھے دھکیل رہی تھی۔

مختلف رسموں اور تصویروں اور مووی کے لیے اسے بار بار آوازیں دی جا رہی تھیں۔ وہ اسٹیج پر گئی اور ارتضیٰ کے مسکراتے ہوئے چہرے پر اس کی نظر پڑی تو اسے بتا چلا اس شخص کی محبت اس کے دل سے کبھی نہیں نکل سکتی۔ وہ لا تعلقی اور بے نیازی کا خول جو اتنے دنوں سے اس نے خود پر چڑھا رکھا تھا یکلخت چٹخ گیا تھا۔ وہ سب کے ساتھ ساتھ خود کو بھی دھوکا دیتی رہی تھی۔

”تم نے مجھ سے میری محبت چھین لی ہے شمن! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ اسے اس لڑکی سے آج پھر شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

”صبا! شمن کو اس کے کمرے میں لے کر جاؤ۔“ گھر واپس آکر کچھ دیر رسومات کا سلسلہ چلا۔ ان سے فارغ ہو کر اماں نے اسے شمن کو اس کے کمرے میں پہنچانے کے لیے کہا تھا۔ وہ اپنی چند کزنز کے ساتھ شمن کو لے کر اس کے کمرے میں آگئی اسے اس پھولوں بھری بیج پر بٹھاتے وقت اس کے دل کو ناقابل بیان تکلیف ہوئی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا اس بچے سجائے کمرے کو اجاڑ دے۔ سرخ گلابوں اور موتیوں کے پھولوں سے مہکتی

"اس ساری کائنات میں کسی چیز کی کی تابانی مگر مجھے میری محبت حاصل ہو جائی۔ کوئی بہت اعلیٰ خواہش تو میں کی تھی میں نے لفظ ایک شخص جو جس طرح خمن کو مل گیا ہے اسی طرح مجھے بھی تو مل سکتا تھا۔" وہ روتے روتے اٹھ کر باہر نکلی میں آنکھیں میس۔

اس کا روجو شعلوں کی لہریں میں غلغلہ ران شعلوں کو باہر کی لہریں میں ڈال دیا اور بھر پور تھی۔

"بہت میں نہیں تو خمن بھی بولے۔" اس کے اللہ سے شکوے ختم نہیں ہو رہے تھے۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ خمن بھی اس روز اس باہر اور ممانی کے ساتھ اسی جگہ میں ہوئی۔ کیا فرق پڑ جاتا اگر خمن بھی ان لوگوں کے ساتھ مرنے والی تھی یہ اختیار میں تھا تو کیا کر سکتا تھا۔ اس کا ساتھ ساتھ خمن کو یہ مرنا بھی پھر سب سے ہو تا جو آج ہوا وہ آج اس شخص کی دل میں بھی تھی ہے جسے میں نے اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر چاہا ہے۔ جس کے خواب دیکھتے ہوئے میں بڑی ہوئی۔ اپنی زندگی کے اتنے برسوں تک جس شخص سے میں نے محبت کی اسے خمن نے مجھ سے جھین لیا۔ وہ آج پھولوں میں گھری اس جگہ بیٹھی ہے جس جگہ مجھنے کے میں نے خواب دیکھے تھے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں ہو چکا تھا۔ "کاش تم مر جاتیں۔ اسی روز اسی جگہ میں۔" وہ وحشت بھرے انداز میں روئے جلی جاری تھی۔



صبح ہو چکی تھی۔ اس کا رات والا جنون اور وحشت ختم ہو چکا تھی۔ اپنی محبت کے چمن جانے کو وہ بھر کر اٹھ کر چلی تھی۔ اس کا دن اس وقت بالکل خالی تھا۔ وہ بغیر کچھ سوتے مجھے خانہ دوشی سے کمرے میں اپنی رات کی دیوانگی کے سارے نشانات مٹا رہی تھی۔ رات جو کچھ ہوا اس بارے میں وہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر ہاتھ دھو کر بال بٹانے کے بعد کمرے پر ایک مطمئن سی نظر آتی وہ باہر آگئی۔ اس

کی روٹی ہوئی سرخ آنکھیں دیکھ کر کسی کو تشویش نہیں ہوئی اتنے تو اسے دھمکانا تھا کیا عجیب اتفاق تھا کہ باہر نکل کر اس کی پہلی نظر اعلیٰ پر پڑی تھی۔ وہ لہجے کے کمرے میں جا رہا تھا اس نے صبا کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"یہ ارٹھی غنیمت تمہارا ہونے ہے۔ تمہاری بہن کا شوہر۔ رشتے بدل گئے ہیں صبا شفیق! انہیں اس تبدیلی کو قبول کرنا ہی ہو گا۔" اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔

وہ ملازمین کو ساتھ رکائے گھر میں کھڑے ہوئے مسالوں کے شیشے کا انتظام کرنے میں مصروف تھی۔

اس کی کزن بھی بند کرانے لگیں میں آنکھیں میس۔

"خمن تمہارا اچھا بھلا بیوی ہے۔ وہ صبح سے خمن کے کمرے کی طرف نہیں گئی تھی۔ جبکہ اپنی سب کزنز اس سے مل کر راز و منہ دیکھتی ہیں کیللا خمن کی معلومات لے کر آ چکی تھیں۔ صبح سے خمن کے کمرے میں جانے والی ہر کزن اور ہر آنٹی نے اسے خمن کا یہ پیغام دیا تھا۔

"ذرا غصے سے فارغ ہو جائیں سب بھر جاتوں گی خمن کے پاس۔" وہ خود میں اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں دہرائی تھی۔ کیسے دیکھ جائے گی وہ اس جگہ کی وہاں پر منکر اہمیت۔ وہ مختصر کاغذیں پالنے کے بعد واپس سرخوئی اور جھگڑا تھا۔

"چھوڑو اسے یہاں اتنے کوئی خاص کام نہیں ہے۔ خمن بار بار تمہارا اچھا بھلا بیوی ہے۔ جاؤ اس کے پاس۔" شروہو ابھی ابھی خمن کا میک اپ کر کے آئی تھی اس کے ہاتھ سے مشعل کی پلیٹ لیتے ہوئے بولے ایک گہری سانس لے کر وہ جگہ سے باہر آئی اور مرے مرے قدموں سے چلتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

خمن اس وقت کمرے میں آئی تھی۔ سرخ رنگ کی پیشواڑ میوٹی وار پارہا ہے اور بہت بڑے سے سرخ رنگ کے روپے کے ساتھ وہ پیشہ سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ خاموشی سے بیٹھ رہی تھیں وہ بالکل لگ رہی تھی جیسے کوئی ملک اپنے تخت پر بیٹھی ہو۔ اس کی چوٹی

آگے بڑی ہوئی تھی اور اس میں اندھنی سی سیٹ لگی تھیں۔ کس اندر خوب صورت لگ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر خمن کی طرف سے ایک چپ بیٹھی رہی۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ رہی تھی۔ وہ دونوں خاموش تھیں۔ لیکن اس خاموشی کو خمن نے ہی توڑا تھا۔ اس کی نظر اس کی روٹی ہوئی آنکھوں پر پڑی تو وہ بے چین ہو کر بولی۔

"میا تم روٹی تھیں؟" خمن تشویش اور پریشان تھی اس کے انداز میں کہ وہ ایک نکل اس کی طرف دیکھتی ہی رہی۔

"بے وقوف میں کوئی تم سے دور تو نہیں جا رہی جو تم اتنے روٹی ہو۔ میں نہیں تو یوں تمہارے پاس۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر مجھنے ہوئے اسے اپنے بالکل قریب بٹھایا تھا۔ (خمن اگر خمنیں میرے روئے کی اصل وجہ بنا چلی جائے تو تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گی۔ اسے اس بل خمن سے بہت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ فوس اس سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہیں کر رہی تھی۔

"میں صرف میرا کمرہ دلا ہے اور تو کوئی فرق نہیں پڑا۔" وہ اسے کلی دیتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"خمن! تم خوش ہو نا؟" اس کی وہ تسلیاں اسے چاہکے کی طرح لگ رہی تھیں اسی لیے گہرا آواز اس نے موضوع بدل دیا۔ اور خمنی کا ذکر آجائے پر اسے کوجا اور کوئی بات یاد نہیں رہتی تھی۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

"ہاں صبا میں بہت خوش ہوں۔ اتنی خوش ہوں کہ اپنی کیفیت کا اظہار لفظوں میں کر ہی نہیں سکتی۔ بعض دفعہ لفظ کہتے بھولے لگتے نکلتے ہیں۔ میں خوش ہوں بہت خوش ہوں۔ بس تم خوشی سے پہلے بہت کا لفظ چھٹی مرتبہ بل چاہ لگاؤ۔" بڑی خوب صورت سی منکر اہمیت اس کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔

"تم اتنی دیر سے کیوں آئیں؟ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" اسے اچانک ہی غلغلہ کرنے

"یار میں بڑی تھی۔ گھر میں اتنے سارے عرصہ ہیں۔ ماما کہیں سے ہے نا کہیں کسی چیز میں اتنا سونے ذرا ہی بھی لگی ہوگی تو مجھو میری شامت کی ہے۔ تو کوئی پروا نہیں بخرو سہی نہیں ہے۔" وہ غصیل سے جواب دیتے ہوئے اس کا غلغلہ دور کرنے لگی۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ ارٹھی نے مجھے منہ دکھائی میں کیا رہا ہے؟" اس کے شکوے ابھی ختم نہیں ہوئے تھے لیکن خمن اپنا بہت تھیں ان شکووں میں۔

"کوئی تو میں اپنے سب لوگوں سے سن چکی ہوں لیکن چلو تم وہاں سے تیار۔ بلکہ دکھاؤ۔" خمن جواب میں ہلکے بولنے کے بجائے اس کی گردن کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"سچے جوت کیسے لگی صبا؟" اس کے لیے میں فکر مند ہی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر خمن سے نظریں چرانے پر مجبور ہوئی تھی۔

"چاہ نہیں لگتی ہوگی کیسے۔ میں نے تو ابھی منہ دھوئے ہوئے اسے دکھا تھا۔" اس نے اپنے جھوٹ کو بے نیازی کے پردے میں چھپا کر آہستہ سے کہا۔

"دیکھ لیا تھا اور پھر بھی کوئی دوا نہیں لگائی۔ وہ ناراضی سے اس کو گھورتے ہوئے اٹھنے لگی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" تمہارے لیے دوا لینے جا رہی ہوں۔ حد سے بے نیازی کی کہ اس نے خمن کا ہاتھ پکڑ کر ابھی بٹھالیا۔

"بیٹھی رو۔" اشارے ہاں ایک دن کی دلہن سے کام نہیں کر لیا جائے میں ابھی جا کر خود لگاؤں گی۔"

"انگلوں کی نہیں ابھی خورا" جا کر لگاؤ۔" وہ ناراضی سے بولی تو وہ خورا اٹھ گئی۔ اپنی اس جوت پر دو انگلے ہوئے اسے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا جسے وہ کوئی نام نہیں دے رہی تھی۔ کیا وہ شرمندہ تھی؟ اسے غراست ہو رہی تھی؟ مگر کس سے؟ کیا خمن سے یا پھر خود اپنے آپ سے؟

ولیم کے بعد ظہر ایک دفعہ ان لوگوں کے ساتھ

وہ کر دلیس چلا گیا۔ ارنلٹی نے اس کے جانے سے پہلے اپنے تمام قریبی کزنز کو شاوی کی خوشی میں ڈنڈا دیا تھا۔ اس ڈنڈے کو سب نے خوب انجوائے کیا تھا۔ نظری نے ارنلٹی اور شمن کی دعوت کرنے کی خاطر ایک چنگ ارنلٹی بھی۔ اس چنگ میں ہونڈا لالا گا اور بنگلہ بہت یادگار تھا۔ شاوی کے بنگلے سرخ رہے تھے۔ ارنلٹی اور شمن یعنی مولن کے لیے ہوائی چاہئے تھے۔ اس نے خود کو پہلے سے بھی زیادہ مصروف کر لیا تھا۔

شمن اور ارنلٹی نے ہوائی سے تین چار گھر پر فون بھی کیا تھا کہ وہ ان لوگوں سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی مگر چار بار اسے ان لوگوں سے بات کرنی پڑی تھی۔ اس کی ہنسی اور کھٹکی ہوئی آواز سن کر اس کے دل کو برا نہیں کیا ہونے لگا تھا۔ اس سے وہ ہنسی برداشت نہیں ہوا کرتی تھی۔

میں نے بھر کا تھی مولن نہپ انجوائے کر کے وہ دونوں واپس آچکے تھے۔ شمن کے پاس بیٹھ کر اس سے سنانے کے لیے وہاں کی ڈیجیٹل ساری باتیں سمجھیں۔

”ہمت سے لوگ ہوائی کو زمین پر جنت قرار دیتے ہیں اور واقعی صبا وہاں کی تحریکیں اگر اس قدر کی جاتی ہیں تو زمین کو وہ جگہ ایسا ہی ہے کہ اس کی اس درجہ تحریکیں کی جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ بے تحاشا حسن تعمیر رکھا ہے۔ وہاں کے اونچے پھاڑ خوب صورت سمندر، حسین ساحل، چاروں طرف چوٹیوں کی دلگربہ رنگ۔ کون سی ایسی خوب صورتی ہے جو وہاں نہیں۔“ وہ اسے وہاں کی تصویریں دکھاتے ہوئے مسلسل بات کرتی جا رہی تھی۔ ان دونوں نے وہاں پر پہلے جمنا تصویریں لی تھیں اور ان تمام تصویروں میں وہ دونوں کس قدر خوش نظر آ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے ان تصویروں کو دیکھ رہی تھی۔

”ہمارے ہونٹ سے سمندر اتنا نزدیک تھا۔ لٹا خوب صورت لٹا تھا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے کھڑے ہو کر سمندر کو دیکھنا۔“ شمن بڑے خوشگوار انداز میں بولی رہی تھی۔

وہ سمجھ سکتی تھی کہ شمن کو وہ جگہ اتنی زیادہ خوب صورت کیوں لگی ہے۔ وہ جس کے ساتھ وہاں گئی تھی اس کے ساتھ ڈاکٹر اسے کسی صحران میں بھی بھیج دیا جاتا تو وہ اتنی ہی خوش خوش ہوتی۔ محبت ایسی ہی زور زور ہوتی ہے۔ چاہے جانے کا احساس اتنا ہی سرشار کر دینے والا ہو تا ہے۔ وہ کہیں نہ خوش ہوتی آخر وہ جس کے ساتھ وہاں گئی تھی وہ اس سے بے تحاشا پیار کرنا تھا۔ وہ درحقیقت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے چلی جا رہی تھی اور شمن جیسے ابھی ان ہی حسین لکڑوں میں کمری بیٹھی تھی۔

”میں نے اس ایک مہینے میں زندگی سے اپنے حصے کی ساری خوشیاں سمیٹ لی ہیں۔ زندگی اس قدر خوب صورت تھی ہو سکتی ہے یہ بات تو بھی میں سنا سوچتی ہی نہیں تھی۔ مجھے تو ساری دنیا ہی بدلی بدلی کی محسوس ہو رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے دنیا میں نہیں کوئی غم ہے ہی نہیں۔ ارنلٹی کے بارے میں میں تم سے کیا کہوں صبا! اس میں تو کسی دعا کرنی ہوں کہ تمہیں بھی اتنا ہی محبت کرنے والا شوہر ملے۔“ شمن کی یہ بات اسے ایسی لگی جیسے بچہ نے ڈنگ مار دیا ہو۔

”ست اعلیٰ تم میرے لیے کوئی دعا۔ تمہاری یہ دعا میں میرا سحر اڑاتی ہیں۔ مجھے نہ اب محبت چاہیے اور نہ ہی محبت کرنے والا کوئی نقص۔ جب وہ نہیں تو پھر کوئی بھی نہیں۔ میں نے اس سے محبت کرنے کے علاوہ زندگی میں کچھ بھی نہیں کیا اور اس کی زندگی سے اٹھ جانے کے بعد اب بھی کسی کی نہ محبت پانا چاہتی ہوں اور نہ کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ سوچتے ہوئے الیم ہند کر کے ایک دم وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایسا ہوا تمہیں؟ باقی تصویریں نہیں دیکھو گی؟“ شمن اسے پوچھتا تھا کہ کچھ سے ہوتی۔

”میں پورا دن میں ایک نظر ڈال آؤں۔ مگر کہیں کی ڈنڈی کوئی فکر نہیں ہے اس لڑکی کو۔ فراغت سے چند کر پوس مار رہی ہے۔“ وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی اور پھر فرما کر سے باہر نکل گئی۔ وہ جگہ میں

کر کوئی مصوبیت ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی کہ شمن بھی وہیں آگئی۔ ابھی اس کے تھے ختم نہیں ہوئے تھے اور جب تک وہ انہیں صبا کو سنا نہیں لیتی اسے چھین نہیں سکتا تھا۔ اس کی بعد وہ پچھلی بھی اس کے جوش و خروش کو کم نہیں کر رہی تھی۔ وہ لاشعری کا مظاہرہ کرتی اپنے کلم میں مصروف تھی اور وہ مسلسل بولنے میں۔

”ہر روز صبح جب میری آنکھ کھلتی تو میں اپنے سر پہلے ڈیڑھ سارے پھول پاتی۔ اتنے دنوں میں کبھی ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ میری آنکھ کھلے اور مجھے اپنے پاس پھول رکھے ہوئے نظر نہ آئیں مجھے بھی چاہیے تھا کہ ارنلٹی پھول کس وقت لاتے تھے اور کس وقت میرے پاس رکھتے تھے۔ کتنی مرتبہ میں نے ارنلٹی سے پوچھا لیکن انہوں نے بتایا نہیں۔“ وہ اس کے ساتھ مل کر سنا رہی تھی۔

”کتنی مرتبہ ہم نے ایک ہی کپ میں چائے اور کافی شیمز کی۔ ایک ہی کون آؤں کریم کھائی۔ اور ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھایا۔“ وہ اچانک ہی شمن کی بات کاٹ کر بولی۔

”مالی سوٹ سسٹا جیسے کپ محبت سمجھ رہی ہیں میرے خیال سے۔“ ارنلٹی بھلتی کی خرچا پھیلنے کی ایک کامیاب کوشش تھی۔ ایک ہی پلیٹ میں کھانا، ایک ہی کپ میں چائے، کافی، وہ کامیاب بڑس میں ایسے ہی ہوتے ہیں، تمہاری جیسی، احمق لڑکیاں اسے محبت کا خوب صورت سا اظہار سمجھ کر خوش اور ان جیسے چلاک بڑس میں کی جیب پر جو بھی کپ۔“ شمن کو اس کی بات سن کر بھی کاہلہ سا لگا تھا۔ سب کام پھر ڈکھ رہی طرح سے چلی جا رہی تھی۔

”کس قدر ان دو مینٹک ہو گئے صبا! آپ ہے۔“ شمن کی زبان پر بعد میں جا کر وہ اپنی انسی دھنکے میں کامیاب ہوئی تھی۔

”بے چارہ تمہارا شوہر جو دو مینٹک ہوا تو تم تو اس کی ساری دو مینٹک سوچوں پر اسی طرح پانی پھیر دیا کر گئی۔ ہر وقت اسے شک کی نظر سے دیکھو گی کہ

ضرور اس بات کے پیچھے خرچا پھیلنے کی کوئی نہ کوئی کوشش کر رہا ہے۔“ وہ من کو ہنسا دیکھ کر ہنسنے لگی تھی۔

”آج کل کہاں پائی جاتی ہیں آپ؟“ ارنلٹی نے اسے دیکھتے ہی دیکھتے سے لی دی آف کر دیا تھا اور اب پورا کاپور اس کی طرف متوجہ تھا۔

”نہیں پر ہوں۔ کپ کے سامنے۔“ وہ بیک کندھے پر لٹکائے کہیں باہر جانے کے لیے تیار نظر آ رہی تھی۔ بڑے سرسری سے انداز میں اس نے ارنلٹی کو جواب دیا تھا۔

”سچا حیرت ہے۔“ میںیں پر ہو پھر بھی مجھے دکھائی نہیں دیتیں۔ یا تو پھر نظری نہیں آتیں اور اگر آج بھی جاؤ تو کسی نہ کسی مصوبیت کے ساتھ ارنلٹی اور شمن کو واپس آنے چار روز ہو گئے تھے اور فن چار دنوں میں اس کی ارنلٹی سے رائے نامہ بات چیت ہوئی تھی۔

شاوی سے پہلے وہ کراچی میں نہیں تھا پھر شاوی کے بنگالوں کے دوران اسے لٹا دقت نہیں لگتا تھا کہ کسی بات پر کچھ سوچتا لیکن اب چار دن سے وہ کراچی میں تھا اور وہ بھی گھر، پائل فائر۔ ایسے جیسے اسے صبا کا اپنے ساتھ زیادہ بات چیت نہ کرنا پڑے گا کھاتا۔

”کتنے عرصے سے تم نے مجھے نہ فارغ نہ کاکوئی قصہ سنایا ہے اور نہ حرا اور شاوی کے گروپ کے ساتھ ہونے والی لڑائیاں۔“

”وہ سب تو میری کلج کی فرینڈز تھیں۔“ وہ اسے باتوں کے مٹا میں دیکھ کر سامنے والے صبر سے پریشان ہو گئی تھی۔

”تو کیا کلج اور اسکول کے دوستوں سے پوچھ رہی جا کر دہشتی ختم ہو جاتی ہے؟“ ارنلٹی نے بحث کرنے والے انداز میں کہا۔

”دہشتی ختم تو نہیں ہو جاتی۔ لیکن اب ان لوگوں کا فائر ٹمٹ الگ ہے۔ وہ لوگ فرس میں ہیں سب سے کم ان لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ میں نے بہت سارے نئے دوست بنائے ہیں۔ فارغ نہ دیکھو کے ساتھ تو بس صرف شرارتیں اور احمقانہ حرکتیں ہی کیا

کرتی تھی۔ اب ان لوگوں کے ساتھ دوستی ہوئی ہے تو میرا غصہ پڑھائی میں پہلے سے بھی نواہ ہو گیا ہے۔ سب بچے زہارے گروپ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ تو خیر بہت اچھی بات ہے کہ تم نے پڑھا کو قسم کے لڑکوں کو اپنا دوست بنایا ہے۔ لیکن پرانے دوستوں کو کبھی چھوڑنا بہت صواب بات پرانے دوستوں کی ہوتی ہے وہ نئے دوستوں میں نہیں ہو سکتی دوستی پہنچی ہوئی ہو آئی ہی خوب صورت اور مضبوط بھی ہوتی ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کسی ایک اضافی بات تھی تم کہیں جا رہی تھیں میں نے تمہیں روک لیا۔ جو تمہیں دیر ہو رہی ہوگی۔" بیٹھ کی طرح اس نے ہر گز انداز میں اسے نصیحت کی تھی وہ صوفے سے اٹھی تو ارٹھی نے پوچھا۔

"تم جاؤ گی کیسے آج کل میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔" میں ڈرا کر میرے ساتھ چلی جاؤں گی قریب ہی تو ہے سر امتیاز کا گھر۔ ہمارا گروپ انٹران کی بلا میری میں جرح ہونا رہتا ہے۔" وہ اسے خدا حافظ کہتے ہوئے لاؤنج سے باہر نکلتے گئی تو ارٹھی پیچھے سے بولا۔

"لگتے دنوں سے تم نے مجھے کافی بنا کر نہیں پلائی ہے۔ آج رات مجھے تمہارے ہاتھ کی کافی پینی ہے۔"

"میں کیوں بچوں؟" میں صاحبہ کس مرض کی دوا ہیں۔ آپ کی کافی ناشتہ دیکھو سب اب اس کی قدر داری ہے۔" لاؤنج میں آتے ہوئے شمن نے اس کی بات سن لی تھی۔

"اسماء صبح کہہ رہی تھی کہ تمہیں ہسپتال میں اور نئے دونوں رشتہوں کے مزے کروانے لگی۔ کیسا اندول کی طرح آج کل میں ارٹھی کے کان بھرے جا رہے ہیں۔" ارٹھی شمن کے طعن دینے پر ہنس پڑا تھا اس نے مزے کرار لٹھی کی طرف سے کھانا منگوا کر دے کے شمن سے کہنے کہ رہا تھا۔

ہوائی سے آنے کے بعد ارٹھی پور شمن ایک ہفتہ کراچی پر کے اس کے بعد وہ دونوں لاہور پہنچ گئے تھے ارٹھی لاہور میں اپنے شمس پر جیکٹ میں ان دونوں مصروف تھا اس کے لیے اسے ابھی کچھ عرصہ

وہیں قیام کرنا تھا۔ شادی سے پہلے ہی اس نے وہاں اپنی ذاتی مکان خرید لیا تھا۔ لاہور میں اس کے بعض بہت قریبی دوست بھی رہتے تھے۔

گھر میں سب کو شمن کی کئی بہت محسوس ہو رہی تھی۔ ظفر کے بعد اب ارٹھی اور شمن بھی پہلے نہیں تھے۔ گھر کے سب ہی افراد کو ان دونوں کے بغیر گھر بہت مونا سونا لگ رہا تھا سوائے اس کے کہ وہ اس گھر کی واحد فرد تھی تو ان دونوں کے جانے پر بہت خوش تھی۔ وہ خود کو سمجھانے میں بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ کتنی مرتبہ اس نے خود کو سمجھایا تھا تقدیر کے اس فیصلے کو تسلیم کر لینے پر خود کو آمادہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دشت کو قبول کرنے کے شمن کیسے تھے لیکن اس کا خدو کو سمجھانا صرف اس ایک لمحے میں ہرگز ہو جاتا تھا۔

اب جب وہ دونوں یہاں نہیں تھے تو اسے بڑا اطمینان تھا وہ اس بلاؤج کی مشقت سے بچ گئی تھی۔ ارٹھی سے پرانے بے تکلفانہ انداز میں بات کرنے کی مشقت۔ شمن کے ساتھ محبت بھرے انداز میں بات کرنے کی مشقت۔

شمن کراچی پڑی ہندی سے فون کرتی تھی۔ وہ وہاں بہت خوش تھی۔ وہ اپنے منہ سے اپنی خوشیوں کا ذکر نہ بھی کرتی تب بھی اس کی گواہی سے ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ ارٹھی کے ساتھ بے حد خوش ہے۔ حیرت انگیز طور پر اسے شمن کے ساتھ فون پر باتیں کرنا برا نہیں لگتا تھا، بلکہ اگر بھی اسے فون کیے دو تین دن ہو جاتے تو وہ بے چین ہی ہو جاتی تھی۔ خود وہ اسے بہت کم فون کرتی تھی شمن اس کے فون نہ کرنے پر شکوکہ کرتی تو وہ پر بحالی کی مصروفیت اور وقت کی کمی کا حوالہ دیتی۔ کبھی یوں لگتا کہ جیسے اس کا دل دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ایک حصہ شمن سے محبت کرتا ہے اور ایک نفرت۔ وہ شاید وہ پوری شخصیت کی ایک کٹی چھری رہی تھی۔ کبھی اس کا موڈ خراب ہوتا تو وہ بڑی بے مروتی سے شمن سے فون پر بات کرنے سے انکار کر دیتی

"ہمارا شمن اس وقت بہت ہی ہوں۔ آپ شمن کو پتا نہیں ہیں اس سے بعد میں بات کر لوں گی۔" مہما سے اس بو قیڑی پر گھومتے ہوئے دوبارہ شمن سے باتیں شروع کر دیتیں۔

اگلی بار جب اس کی شمن سے بات ہوتی تو وہ وہاں ہی دل میں یہ توقع کرتی کہ شمن کچھ بار کی اس کی بد قیڑی کا ذکر ضرور کرے گی مگر وہ اس بات کا کوئی ذکر کیے بغیر مصروفی کے انداز میں باتیں کرتی۔

"شمن! تم اتنی اچھی کیوں ہو؟" اچھی کہ میں یہاں میں تمہارے لیے نفرت رکھنے کے باوجود بھی تم سے نفرت کر نہیں پاتی۔ تمہاری اچھانیاں تمہارا پیار مجھے تم سے محبت کرنے پر مجبور کرنے لگتے ہیں۔ لیکن میں تم سے محبت نہیں کرنا چاہتی۔" شمن کے غلوں اور اس کی محبت اسے ایک نامحسوس سی جھجھک سے دوچار کر دیتے تھے۔

شمن کو گھر والوں کی یاد بے چین کرنے لگی تو وہ باج چھ دن کے لیے کراچی آگئی۔ وہ پونہ دہائی سے آئی تو شمن کو گھر میں دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی۔ وہ اپنا خوشی پر حیران ہوئی اس سے گلے ملنے لگی۔

"مجھے سب لوگ بہت یاد آ رہے تھے۔" وہ اسے استیلاں بٹھاتے ہوئے بولی۔

شمن اب تھوڑے دن نہیں رہتا۔ چند دن میں دن سے پہلے میں تمہیں واپس جانے نہیں دے دوں گی۔" ان دنوں میں شمن کی طرف دیکھا جو اس کے احترام میں کچھ بولی تو نہیں تھی لیکن اس کے تاثرات ہی ظاہر کر رہے تھے کہ وہ اتنے دن رکتا نہیں چاہتی۔ مگر آج عیش سے بھی بڑھ کر خوش نظر آ رہی تھی۔ اتفاقاً خوش تو اس نے انہیں بھی نہیں دیکھا تھا اور پھر اس خوشی کی وجہ اسے بھی پتا چلی ہی تھی۔

"وہ اٹھی؟" اس نے تصدیق جانے والے انداز میں شمن کی طرف دیکھا جس نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ اس بات کو سن کر اسے بے تحاشہ خوشی کا احساس ہوا تھا۔

"اف! کتنا مزہ آئے گا مجھے تو سوچ سوچ کر خوشی ہو رہی ہے۔ اب اس گھر میں کوئی مجھ سے چھوٹا آنے والا ہے۔" شمس پر شمر عجب جواؤں کی ضمانت دیت کر رہی گی۔ وہ خوشی میں اوٹ پڑا لگ باتیں کرنے لگی تھی۔

"تم عجب جواؤں کی پہنچ کر ہو گی،" گورو ہم لوگ کہاں ہوں گے جو اسے تم سے ڈانٹیں گے لے لیے تھا چھوڑ دیں گے۔" مہما نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے خوشی سے کہا۔ اس سارے دن اس کے پاس شمن کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے اس موضوع کے علاوہ وہ سوا کوئی موضوع نہیں تھا۔

شمن کو آئے تیس دن تھا بہت ارٹھی نے فون کر کے اس سے باتیں آنے کے لیے کہا۔ وہ خود وہاں جانے کے لیے بیٹی بے تاب تھی۔ جتنے شوق اور بے چینی سے وہ سب سے ملنے آئی تھی اب اتنی ہی بے چینی اسے وہاں کے لیے تھی لیکن اہل اور مہما سے کسی بھی قیمت پر اتنی جلدی ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا موڈ دیکھ کر انہوں نے دھنکے کے لیے اصرار نہیں کیا تھا۔ گورو شمن تو ہر کسی کا خیال رکھنے کی عادی تھی۔ پھر ماں تو اہل تھیں۔ ان کی کسی بات سے اختلاف کرنے یا منہ پر انکار کرنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی لیکن پھر بھی اس نے وہی لفظوں میں اہل سے یہ ضرور کہا تھا۔

"میں پہلے رک گئی تو ارٹھی کو مشکل ہو جائے گی۔"

"کوئی مشکل نہیں ہو رہی اسے اسے عادت ہے۔" اپنے سارے کلمہ وہ خود کر لیتا ہے۔ لندن پر رہنے گیا تھا تو کون سا وہاں اس کے پاس بلاؤ شمن کا ناہار تھا۔ وہ لے گا وہ مزے میں۔" انہوں نے تقصیر بھرے انداز میں اس کا اعتراض رد کر دیا تھا۔ مہما سامنے والے صوفے پر بیٹھی صبا کے پاؤں میں تیل کا مساج کر رہی تھیں۔ انہوں نے بغور شمن کی طرف دیکھا وہ مزید کسی بحث اور اختلاف کے بغیر ہوں خاموش ہو گئی تھی جیسے ماں

کی بات سے متعلق ہو گئی ہو۔ انہیں بے اختیار اپنی اس
جہتی پر یاد تھا۔ ابھی اس کی جگہ صباہی تو املان سے
خوب بحث کرتی، خدا کرے اپنی بات منوائے۔ اس
وقت تو انہوں نے املان اور شمن کی گفتگو میں دخل دینا
مناسب نہیں سمجھا لیکن اسی روز انہوں نے املان کو برا
عمیں کس انداز میں قائل کیا تھا کہ وہ خوشی خوشی اسے
والیں بھیجے پر تیار ہو گئی تھیں۔ شمن کو یہ بات معلوم
نہیں تھی رات ارٹھی سے فون پر بات ہوئی تو اس
نے کہہ دیا۔

"میں املان کو ناراض کر کے نہیں آسکتی۔ جب تک
وہ خوشی سے اجازت نہیں دیں گی، میں نہیں آؤں
گی۔" مگر جب املان نے اسے اس کی صحت اور
خود رک کے حوالے سے ایک طویل ہدایت نامہ دیتے
ہوئے واپس جانے کی اجازت دی تو اس کی خوشی دیکھنے
سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن کے سامنے اس نے کسی
قسم کی خوشی اور ایک اسٹنٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔
لیکن رات میں صبا کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس
نے اپنی بے تحاشا خوشی کا بڑا اظہار کیا تھا۔

"جب وہاں تھی تو سب لوگ بہت یاد آتے تھے۔
سب یہاں آئی ہوں تو ارٹھی کی کمی بڑی شدت سے
محسوس ہو رہی ہے۔ میں کسی کے بغیر بھی نہیں رہ
سکتی۔ مجھے وہ سب لوگ ایک ساتھ چاہئیں جن سے
میں بنا کر کرتی ہوں۔ میرے سب پیارے میرے پاس
ہوں۔ میرے بالکل قریب۔ سب گاہے تھٹھا پیار ہو
اور میں ہوں۔ سچ کہتی ہوں صبا! عجیب سی ایک ہوس
ہے میرے اندر۔ اپنے جیسے کی ساری عینیں جلدی
جلدی صحت لینے کی۔"

شمن اس کے یہ روز واپس چلی گئی تھی۔ املان اور ماما
آج کل اس کی فکر پہلے سے بھی زیادہ رہنے لگی تھی۔
بعض مرتبہ وہاں میں وہ دو تین تینا مرتبہ شمن کو فون کیا
کرتیں۔ شمن کو واپس گئے وہ کہتے ہوئے تھے کہ
اپنے اچھاؤں کی تیاری میں مصروف تھی جب شمن
نے اس سے اسٹینڈس لاء ہو کر آئے کے لیے کہا۔
"پچھلوں میں تم یہاں آ جاؤ صبا! بہت مزہ آئے
گا۔" اس کا ان دونوں کے پاس جانے کا قطعاً کوئی

ارادہ نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے فوراً ہی اسے منع کر
دیا۔
"آنا تو تمہیں پڑے گا۔ اب دیکھو میں کیا کرتی
ہوں۔" اس نے چٹخ کر بولنے والے انداز میں کہا اور پھر
جو اس نے کہا وہ واقعی کر بھی دیکھا۔ وہ احتمالات کی
مصوفیت میں شمن کا چٹخ بھول بھی چکی تھی، لیکن
اسے معلوم نہیں تھا کہ شمن "املان اور ڈیلی" سے
بعد لے چکی ہے کہ وہ مسٹر ریک میں صبا کو اس کے
پاس لاء ہو رہی ہیں۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ میرا اکل دل نہیں چاہا جانے
کہ یہ اچھی ضرورتی ہے۔" وہ اپنے جانے کی بات من
کر چلی۔
"اتنے پیارے، مہن باری ہے اور تم غمے دکھا
رہی ہو۔ تمہارے جانے سے اس کا دل بھل جلتا
گا۔ یہاں پر بھی تو فاسد ہی ہو۔ ذرا سا دین کا خیال کرو
گی تو اس میں تمہارا کیا نقصان ہے۔" املان کو اس کا
انکار سخت ناگوار گزرا تھا۔

"ارٹھی بھی بڑے اصرار سے کہہ رہا تھا کہ صبا کو
بھیج دیں اور شمن بھی تمہیں بہت مس کر رہی ہے۔"
ڈیلی نے بھی سمجھا۔

"کہو کسی رہی؟" ڈیلی نے اس کی فلاح کا نام
بٹلے کے لیے لاء ہو کر فون کیا تو شمن نے اس سے بھی
بات کی۔ وہ اپنی حیثیت پر بہت خوش تھی۔

"بہت ڈیل ہو تم تم سے تو اب میں وہیں آکر
عینوں گی۔" اس نے اسے دھمکی دیتے ہوئے فون بند
کر دیا۔

"ساری دنیا کی فکر رہتی ہے اس لڑکی کو سوائے
اپنے مجھے نہیں لگا۔ وہ اپنے کھانے پینے کا کچھ خاص
دھیان رکھتی ہوگی۔ اب تم جا رہی ہو تو مہن کا اچھی
طرح خیال رکھنا۔ چھپا لیں ختم ہونے سے پہلے واپس
آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" املان جانتے جانتے
بھی اسے سمجھانا نہیں بھولیں۔ ارٹھی اسے
ایز پورٹ پر لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔

"وہ محترمہ کہاں ہیں جنہوں نے تار شامی حکم
جاری کر کے مجھے یہاں بلوایا ہے؟"

"وہ محترمہ تمہارے استقبال کا خاص اہتمام کر رہی
ہے۔ بہت ذہن پرست قسم کی ڈشز تیار کی گئی ہیں
تمہارے لیے صبح سے یہاں میں مہمی ہوئی ہیں
محترمہ۔" ارٹھی نے مسکراتے ہوئے اسے شمن کی
مصوفیت سے آگاہ کیا۔ وہ لوگ گھر پہنچے تو شمن پہلے ہی
سے اس کے استقبال کے لیے کھڑی نظر آئی۔ بڑی
بے ساختگی میں اس نے صبا کو گلے لگایا۔

"کتنی خوشی ہو رہی ہے مجھے تمہیں یہاں دیکھ کر۔"
میں قیامتیں مکتی۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے
آئی تھی۔

"مہمانوں کی طرح بیٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں
ہے۔" اسے صوفے پر بٹھو دیکر اس نے نو کا اور پھر
اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"پہلے سارا گھر تو دیکھ لو۔ تم دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔
میں نے اسے اتنی اچھی طرح سجایا ہے۔ ارٹھی کہتے
ہیں کہ تمہیں تو انیسویں صدی کا گھر بنا چاہیے تھا۔" وہ اسے
ڈائمنڈ روم کی طرف لے آئی پھر وہاں سے بیکن گلان
ڈرائنگ روم کی طرف دوڑا۔ وہ اسے وہاں موجود ایک ایک
چیز کی تفصیل بتاتے گئے۔

وہ اس گھر کی جگہ سے زیادہ شمن کے چہرے کی
طرف دلچسپی رہی تھی۔ جس پر پتی خوشی روشنی بن کر
جگمگا رہی تھی۔

اس کمرے کی کسی بھی دوسری چیز پر نظر پڑنے سے
پہلے اس کی نظر اس تصویر پر نظر پڑی تھی جو بہت
خوب صورت سے فریم میں جڑی بند کے پیچھے واپس
دروازہ پر لگی ہوئی تھی۔ ان دونوں نے کمرے میں لگانے
کے لیے اپنی شادی کے دن کی تصویر کی جگہ بنی مہون کی
اصوریوں میں سے ایک تصویر کا انتخاب کیا تھا۔ وہ
اصوری بہت خوب صورت تھی۔ ارٹھی اور شمن دونوں
ہی اس تصویر میں بہت خوب صورت اور خوش نظر آ
رہے تھے۔ ان دونوں کا انتخاب بہترین تھا۔ اس نے
ایک دم ہی تصویر پر سے اپنی نظریں ہٹا کر گردن گھما لی
تو آنکھوں کے سامنے وہی منظر آیا جس سے اس نے
نظر ہٹائی تھی۔ ارٹھی اور شمن ساتھ ساتھ کھڑے

تھے۔ اسے ہی خوش اور اتنے ہی خوب صورت جتنے کہ
تصویر میں رنگ رہے تھے۔
"مہو کیا گھر کا معائنہ؟" اس سے مخاطب ہوا۔ اس
نے بولا "مسکراتے ہوئے سر ملا دیا۔ اسے خود اس
بات کا احساس ہوا کہ اس وقت وہ منافقانہ انداز میں
مہن رہی ہے۔

"میرا خیال ہے" اب کھانا کھانا چاہیے۔ دیکھیں
تو سہی کہ شمن صاحبہ صبح سے یہاں میں عینیں کر رہی
تھیں اس لیے یہاں کر رہی ہیں یا واقعی کچھ ڈھنگ کی ڈشز
تیار بھی کی ہیں۔" ارٹھی کی مخاطب دوبارہ وہی تھی۔
"کھانا بالکل تیار ہے۔ آپ دونوں حیران رہ جائیں
گے" میں نے اتنی مزے مزے کی چیزیں بنائی ہیں۔"
شمن نے ارٹھی کو خوب دینی تیزی سے کمرے سے نکل
گئی تھی۔ وہ دونوں بھی کمرے سے باہر نکل گئے۔
"بہت خوش ہے شمن تمہارے آنے پر۔"
بیز بیوں کی طرف آتے ہوئے ارٹھی نے اس سے
کہا۔

"بب سے تمہارے کتے کا کنفرم ہوا" اس نے
اسی وقت سے تمہارا انتظار شروع کر دیا تھا کل کتے
گھنٹوں تک اس نے میرا سر کھلیا ہے صبا آ رہی ہے۔"
اس سے یہ بات کہی گئی اسے وہ بات بتائی جاے
یہ کھانا ہے اس کے لیے وہ پکا ہے۔ تمہارا ڈاکٹر کر
گئے اس نے مجھے اچھا خاصا چڑا دیا تھا۔"

"آپ کو میرے ذکر سے چڑھتی ہے؟" ارٹھی کی
خوشی سے کی گئی بات کے اختتام پر اس نے ایک دم
پوچھا۔ ارٹھی کو اس کے سوال پر پچھنے کا یہ انداز بڑا
اجنبی سا لگا اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ
بڑی سمجیدگی سے بیڑ بیوں سے نیچے اتر رہی تھی۔ اس
کی توجہ ارٹھی کی طرف نہیں بلکہ بیڑ بیوں کی طرف
تھی۔ اس کی خوشی سے کہی گئی ایک بات کو اس نے
کس طرح اپنا تھا اس کے منہ سے کہانی سارے مجھے کو
نظر انداز کر کے اس نے صرف آخری بات پر توجہ دی
تھی۔ (باقی آئندہ)

پوچھا۔

”کیوں خواہنا خواہ میں، میری ار تفضی بھائی کے ساتھ لڑائی کروانا چاہ رہی ہو اور اللہ نہ کرے کہ کبھی ایسی نوبت آئے جو مجھے آپ دونوں میں سے کسی ایک کا ساتھ دینا پڑے۔“ ار تفضی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”صبا واقعی بڑی ہو گئی ہے ثمن! اسے سیاسی قسم کے بیانات دینے آگئے ہیں۔“ ثمن بھی اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔

”میں سمجھتی تھی مردوں کی محبت بس شادی سے پہلے تک ہی ہوتی ہے۔ بیوی بننے کے بعد تو انہیں اپنی پسندیدہ ترین لڑکی میں بھی عیب نظر آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسا ہے نہیں صبا! کم از کم میرے ساتھ تو ایسا ہرگز نہیں ہے۔“ وہ لاؤنج کے کارپیٹ پر ویکيوم کلیئر چلاتے ہوئے ثمن کی باتیں سن رہی تھی۔ ار تفضی کے آفس چلے جانے کے بعد ثمن کارپس کی صفائی کے لیے ویکيوم کلیئر لگانے لگی تو اس نے ویکيوم کلیئر اس کے ہاتھ سے چھین کر اسے صوفے پر بٹھا دیا تھا۔

”مجھے نوکروں کا کیا کام پسند نہیں آتا۔ جس محبت سے میں اپنے گھر کا خیال رکھوں گی ایسے کوئی نوکر تو کبھی نہیں رکھ سکتا۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے ایسی عورتوں پر جو اپنے گھروں کو ملازمین کے سپرد کر کے خود بے فکر ہو جاتی ہیں۔“ وہ اس کے ڈانٹنے اور یہ کہنے پر کہ یہ کام اسے خود کرنے کے بجائے کسی ملازم سے کروانا چاہیے بہت سنجیدگی سے بولی۔

”اچھا جب تک میں ہوں تب تک تم یہ سارے کام میرے سپرد کر دو۔ میرے جانے کے بعد شوق سے اپنا گھر خود اپنے ہاتھوں سے سجا، سنوار لیا کرنا۔“ ڈرائنگ روم کی صفائی کے بعد وہ اب لاؤنج میں آگئی۔

”ار تفضی کو جتنا اچھا میں شادی سے پہلے سمجھتی تھی وہ حقیقت میں اس سے بھی زیادہ اچھے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے خود اپنے آپ پر رشک آتا ہے۔ اتنی شدید محبت مجھ سے؟ ایسا غیر معمولی کیا ہے مجھ میں کبھی کبھی مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔ محبت کے کھو جانے کا ڈر، اس کے چھین جانے کا ڈر۔ پتا نہیں محبت اتنی دہمی کیوں ہوتی

رد کیا ہوا آپ چپ کیوں ہو گئے؟ میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔ مجھے پتا ہے آپ کبھی کبھی مجھ سے چڑ نہیں سکتے۔“ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ وہ ثمن کے پاس کچن میں چلی گئی تھی جبکہ ار تفضی ابھی وہیں کھڑا ہوا تھا۔ صبا کے بچے میں ایسی کیا بات تھی جو اسے اجنبی لگی تھی؟

”ویسے تو میں پلین میں بھی کھانا کھا چکی ہوں۔ لیکن اب تم نے اتنی مزے مزے کی ڈشز بنائی ہیں تو دوبارہ کھانے میں بھی کچھ حرج نہیں۔“ اس نے اپنی پلیٹ میں رشین سلاؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

”تمہاری بہن صاحبہ خود تو چٹوری تھیں ہی مجھے بھی اپنا جیسا بنا دیا ہے۔ روز ناشتے میں یہ پراٹھا کھلاتی ہے، مجھے آج کل پہلے سے بھی زیادہ پابندی سے ایکسرسائز اور جوگنگ کرنی پڑ رہی ہے۔“ ار تفضی اپنی کچھ دیر پہلے کی حیرت کو نظر انداز کر کے بڑے خوشگوار سے موڈ میں کھانا کھا رہا تھا۔

”تم بتاؤ صبا! یہ کوئی انصاف تو نہیں ہے۔ شوقین خود ہیں کھانے کے اور الزام مجھے دیتے ہیں۔ اب ناشتے کی میز پر میں نے ٹوسٹ، آلیٹ، مکھن اور جیم بھی رکھا ہوا ہوتا ہے، لیکن یہ اپنی مرضی سے اسے چھوڑ کر پراٹھا کھاتے ہیں تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔“ ثمن — مصنوعی غصے سے بولی۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے ثمن! آپ نہ کھلایا کریں۔ یہ کہیں کہ اصل میں خود ہی کا دل چاہ رہا ہوتا ہے۔“ ثمن اس کے اپنی حمایت میں بولنے پر بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”ظفر بھائی اور آپ کے مقابلوں میں ضرور صبا آپ کا ساتھ دیا کرتی تھی۔ لیکن اگر بات میری اور آپ کی ہو تو صبا صرف اور صرف میرا ساتھ دے گی۔ ہے نا صبا؟“ ار تفضی سے کہتے کہتے اس نے ایک دم اس سے

ہے۔ لیکن صبا! مجھے واقعی ڈر لگتا ہے۔ ایسا کیوں لگتا ہے جیسے یہ محبت ایک روز مجھ سے چھن جائے گی۔ وہ دشمن کی بات پر کھل کر ہنسی تھی۔

”تم میری سوچ سے بھی زیادہ جذباتی ہو۔ ارے احمق اگر کچھ نہ کچھ سوچنا بہت ہی ضروری ہے تو بجائے ان بے سرو پا باتوں کے اس کے بارے میں سوچ لیا کرو۔ جو ہم لوگوں کی زندگیوں میں آکر ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں بکھیر دے گا۔“ دشمن کا موڈ ایک دم ہی بدل گیا وہ اب چہرے پر خوب صورت سی مسکراہٹ لیے شاید اسی کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

”اماں نے تو نام بھی سوچ لیا ہے۔ اگر لڑکا ہو تو معاذ اور لڑکی ہوئی تو ماہم۔ ویسے تمہیں کس کا انتظار ہے معاذ کا یا ماہم کا؟“

”میں دعا مانگتی ہوں کہ اللہ مجھے بیٹا دے، بالکل ارضی جیسا ہو وہ۔ اس کی شکل صورت عادتیں سب ان کے جیسی ہوں۔“

”پھر ارضی بھائی یہ دعا مانگتے ہوں گے کہ بیٹی ہو اور بالکل دشمن جیسی خوب صورت ہو اسی کے جیسی اچھی اور محبت کرنے والی ہو۔“ اس نے جواب میں فوراً اور بڑی بے ساختگی سے کہا تھا۔

”ہاں واقعی وہ یہی کہتے ہیں۔ حیرت ہو رہی ہے مجھے تمہارے درست انداز پر ویسے ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے اپنی ماں کی طرح بچپن ہی سے سنجیدہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ خالہ کی طرح شوخ و شریر ہونا چاہیے۔ اب تو تم ایسی نہیں ہو بچپن میں تم کتنی شریر اور باتونی تھیں صبا! مجھے ابھی بھی یاد ہے میں جب بھی تم لوگوں کے پاس کراچی آتی تو تمہیں اتنا زیادہ اور مسلسل بولتا دیکھ کر مجھے کس قدر حیرت ہوتی تھی۔ ارضی کہتے ہیں ہمارے گھر میں ساری رونق صبا کی وجہ سے تھی۔ اس کی شرارتیں اتنی معصومانہ اور پیاری ہوتی تھیں کہ اس کی کسی بھی حرکت پر غصہ نہیں آتا تھا۔“ زندگی کا جو دور وہ اسے یاد دلانا چاہ رہی تھی اسے وہ یاد کرنا نہیں چاہتی تھی اسی

لے اس بات پر کوئی تبصرو کیے بغیر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”بس تو پھر میں یہ دعا مانگنا شروع کر دیتی ہوں کہ۔ پیارے اللہ میاں آپ ارضی بھائی اور دشمن میں سے جس کی بھی چاہیں دعا قبول کر لیں۔ اس لیے کہ میرا بھانجا ہو تو وہ ارضی بھائی جیسا اچھا ہو گا اور بھانجی ہوئی تو دشمن جیسی۔“

”ہاں یہ دعا ٹھیک رہے گی۔“ دشمن نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ صفائی کے اس کام سے فارغ ہو چکی تو دشمن سے بولی۔

”جب اپنے گھر کی صفائیاں تم خود کرتی ہو تو پھر کھانا تو لازمی خود ہی پکاتی ہو گی۔ مجھے بتاؤ کیا پکاتا ہے۔ تمہارے جیسا مزے کا تو نہیں پکا سکوں گی لیکن یقین کرو میں نے بہت سی چیزیں ماما اور اماں سے پکائی سیکھ لی ہیں۔ اچھی خاصی کلنگ کرنا آگئی ہے مجھے۔“

”میں نے تمہیں اس لیے نہیں بلایا تھا کہ مجھے ایک نوکرانی کی ضرورت تھی۔“ اس نے منہ بنا کر کہا تھا۔

”تم نے تو اس لیے نہیں بلایا لیکن اماں نے مجھے یہاں اسی لیے بھیجا ہے تمہاری خدمت کرنے کے لیے۔ ابھی تو میں تمہیں وہ سب چیزیں بتا بنا کر کھلاؤں گی، بلکہ ٹھنساؤں گی جو اماں نے تمہیں کھلانے کے لیے مجھے خاص تاکیدیں کی تھیں۔“ اس کا انداز ڈرانے والا تھا۔ ”اور تمہیں یہ تو پتا ہی نہیں ہے کہ وہ چیزیں کیا کیا ہیں۔ ان میں سے اکثر چیزیں ویسی گھی میں تیار کی جائیں گی۔“ اس نے اسے مزید ڈرایا تھا۔

”خدا کے لیے صبا! اتنی ڈراؤنی باتیں مت کرو۔ میں تو کھانے میں کارن آئل بھی اتنا تھوڑا سا ڈالتی ہوں ویسی گھی کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”یہ بحث تم اماں سے کرنا۔ مجھے تو جو کام کرنے کو کہا گیا ہے میں وہی کروں گی۔ باقی تم جانو اور اماں۔“ وہ اسے ڈرا کر بچن میں چلی گئی تھی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد آئس کریم کا پروگرام

کے ساتھ
ایسی
ایک

ی قسم
طرف

سے
اپنی
ع ہو
ساتھ

لبوم
رضی
غالی

سیر

ت

تو

ی

ود

بر

ے

ے

ے

ے

ے

ے

ے

ے

ے

ے

بن گیا تھا۔ وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر لے آیا تو وہ دونوں بھی اس کے پیچھے پیچھے پوربچ میں آ گئیں۔ وہ ثمن سے ایک قدم پیچھے تھی۔ ثمن کو گاڑی کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے بڑی حسرت سے دیکھا۔ کتنا مالکانہ انداز تھا اس کا اور کیوں نہ ہوتا۔ اسے حق تھا اس جگہ بیٹھنے کا اور یہ حق اس گاڑی کے مالک نے اسے دیا تھا۔ اپنی لمحہ بھر کی اس سوچ پہ وہ شرمندہ ہو گئی۔ خود کو ملامت کرتے ہوئے وہ پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”ساری دنیا کے بچے آئس کریم کے شوقین ہوتے ہیں لیکن صبا تو آئس کریم کی دیوانی تھی۔ کچھ مت دو، بس اسے آئس کریم کھلائے جاؤ۔ میری پاکٹ منی کا بڑا حصہ اس کی آئس کریمز کی نذر ہو جایا کرتا تھا۔“ آئس کریم کھاتے ہوئے ارتضیٰ نے ثمن سے کہا۔

”کتنا اچھا وقت آپ لوگوں نے ساتھ گزارا ہے۔ آپ صبا اور ظفر بھائی۔ افسوس میں نے وہ خوب صورت وقت مس کر دیا۔ اتنا اچھا لگتا ہے مجھے جب آپ تینوں اپنے ایک ساتھ بتائے بچپن کی باتیں بتاتے ہیں۔“ ثمن کے لہجے میں بڑی حسرت سی تھی۔

”تم ہوتیں بھی تو الگ تھلگ بیٹھ کر نخرے ہی دکھایا کرتیں۔ کیوں صبا! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“ ارتضیٰ اسے ستا رہا تھا۔ وہ اپنی آئس کریم ختم کر چکی تھی۔

”صبا! اور آئس کریم منگواؤں تمہارے لیے؟“ ارتضیٰ کے پوچھنے پر اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

”کل رضا کے ہاں ڈنر پر جانا ہے، یاد ہے نا تمہیں؟“ واپسی میں گاڑی اشارٹ کرتے ہوئے ارتضیٰ نے ثمن سے کہا۔

”ہاں یاد ہے۔“ اسے جواب دے کر وہ صبا سے ناطب ہوئی۔

”ارتضیٰ کے دوست ہیں رضا بھائی۔ ہماری شادی بھی آئے تھے۔ ہو سکتا ہے تم نے انہیں دیکھا ہو؟“ ان کی مسرت ان سے بھی زیادہ بااخلاق اور ملنسار تھی۔ تم ان سے ملو گی تو تمہیں بھی وہ دونوں بہت پسند

آئیں گے۔“ اسے ارتضیٰ کے کسی دوست اور ان کی بیگم کے قصے میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ ثمن کی باتوں پر اس نے محض سر ہلا دیا۔

”کل صبا، ہم لوگوں کے ساتھ جائے گی تو ملے گی ان دونوں سے۔“ ارتضیٰ نے کہا تو ثمن سے تھا، لیکن ثمن کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ فوراً بولی۔

”آپ دونوں جائے گا۔ مجھے ایسے بن بلائے ساتھ لٹک کر جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں آرام سے گھر پر کوئی شاندار سی مووی دیکھوں گی، کافی پیوں گی اور ڈرائی فوئس کھاؤں گی۔“

”بن بلائے کیوں؟ رضائے خاص طور پر تمہارا نام لے کر تمہیں انوائٹ کیا ہے۔“ ارتضیٰ نے بیک ویو مرر میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج صبح آفس میں میری اس سے فون پر بات ہوئی تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ صبا آئی ہوئی ہے اور“ اور انہوں نے کہا کہ اتنی مشہور و معروف شخصیت کو آپ ضرور ان کے گھر لے کر آئیں۔“ اس کے تسخرانہ انداز پر ارتضیٰ اور ثمن دونوں ہنس پڑے۔

”دیکھا کیسے قینچی کی طرح زبان چلتی ہے اس کی۔“ ارتضیٰ نے ہنستے ہوئے ثمن سے کہا۔ مگر اگلے روز ثمن ارتضیٰ بھی اسے ساتھ لے جانے پر بضد ہو گیا۔ ان دونوں کے اصرار پر اسے اٹھنا پڑا تھا۔ زبردستی جاری تھی اس لیے تیار بھی بے دلی سے ہوئی تھی۔ ثمن البتہ خوب اچھی طرح تیار ہوئی تھی۔ رضا اور مسر رضا دونوں اس سے بڑی گرم جوشی سے ملے تھے۔

”ثمن نے تمہاری کم تعریفیں کی تھیں۔ تم اس کی تعریفوں سے زیادہ خوب صورت ہو۔“ فائزہ رضائے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔ فائزہ کے کمشنس ان لوگوں سے کچھ فاصلے پر کھڑے ایک اور شخص نے بھی سن لیے تھے۔ بے ساختہ گردن موڑ کر اس نے پہلے فائزہ کو اور پھر اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ فائزہ کے بلند آواز میں دیے جانے والے ان کمشنس پر اچھی خاصی شرمندہ ہو گئی تھی۔ اس وقت صبا، ثمن اور فائزہ ایک ساتھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ارتضیٰ ان دونوں کو فائزہ کے

ساتھ چھوڑ کر اپنے دوستوں میں جا کر بیٹھ گیا۔
 ”السلام علیکم بھابھی! کیسی ہیں آپ؟“ وہ چلتا ہوا
 ان لوگوں کے پاس آکر رک گیا تھا۔ اس کی مخاطب
 ثمن تھی۔ یقیناً وہ لوگ ایک دوسرے کو پہلے سے
 جانتے تھے۔ ثمن نے اس کے سلام کا بڑے پر تپاک
 انداز میں جواب دیا تھا۔

”میں بالکل خیریت سے ہوں عامر! آپ کیسے
 ہیں؟“ آپس میں رسمی قسم کے جملوں کے تبادلے کے
 بعد ثمن کو اس کا تعارف کروانے کا خیال آیا تھا۔
 ”یہ صبا ہے میری چھوٹی بہن۔ کراچی سے آئی ہے
 یہاں پر ہم لوگوں سے ملنے کے لیے۔“ عامر نے
 مسکراتے ہوئے ہیلو کہا اس نے بھی جواباً ”رسمی سے
 انداز میں مسکراتے ہوئے ہیلو کہہ دیا۔

”صرف ثمن کی بہن نہیں ہے بلکہ ارتضیٰ بھائی
 کی فرسٹ کزن بھی ہے۔“ فائزہ نے اس کی معلومات
 میں مزید اضافہ کیا۔

”اور صبا! یہ عامر ہے۔ میرا خالہ زاد بھائی۔“ فائزہ
 اس سے بولی۔ اس رسمی سے تعارف کے بعد وہ وہاں
 سے چلا گیا۔ فائزہ اپنے باقی مہمانوں سے ملنے چلی گئی تو
 ثمن اسے وہاں پر موجود اپنے باقی جاننے والوں سے
 متعارف کروانے لگی۔

”مجھے امید ہے کہ تمہیں ہم لوگوں سے ملنا اچھا لگا
 ہو گا۔“ واپسی میں ان لوگوں کو خدا حافظ کہتے ہوئے
 فائزہ نے اس سے کہا تھا۔

”مجھے آپ لوگوں سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوئی
 ہے۔“ اب کی بار اس نے رسماً ”نہیں بلکہ دل سے یہ
 بات کہی تھی۔ یہاں وہ بے دلی سے آئی تھی لیکن رضا
 اور فائزہ کا رخصتوں کا انداز اسے اچھا لگا تھا۔

”صبا تم بور تو نہیں ہوئیں؟“ گاڑی ڈرائیو کرتے
 ہوئے ارتضیٰ نے اس سے پوچھا۔

”بور تو نہیں ہوئی لیکن آپ ثمن صاحبہ کی خوش
 اخلاقی اور مروت بگھارنے والی عادتوں کو تھوڑا کم
 کروائیں۔ خدا جانے کون سی مسز تھیں۔ مجھے نام یاد
 نہیں آ رہا۔ اتنا پوز کر کر کے اپنے آسٹریلیا جانے کا ذکر کر

رہی تھیں اور یہ اتنے سکون اور خاموشی سے ان کا
 اترایا ہوا انداز دیکھ رہی تھی۔ اس سے یہ نہیں ہوا کہ
 انہیں بتائی کہ میں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ وہیں
 گزارا ہے۔“ ارتضیٰ اس کے شکایتی انداز پر قہقہہ لگا
 کر ہنس دیا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا اگر میں انہیں یہ بات بتا دیتی
 اور اچھے لوگ کرتے ہیں اس طرح شو آف۔“ ثمن نے
 بدبرانہ انداز میں کہا۔ ارتضیٰ دونوں بہنوں کی بحث و
 تکرار سے محظوظ ہوتا خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ گھر
 آکر جب وہ لوگ گاڑی سے اترے تو لاؤنج کی طرف
 قدم بڑھاتے ہوئے ارتضیٰ اس سے بولا۔

”صبا! مجھے ثمن کی سب سے پیاری عادت یہی لگتی
 ہے۔ اس کی سادگی۔ آپ بہت کچھ ہوں اور پھر اتنے
 ہی سادہ بھی ہوں۔ ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔
 کتنی خوب صورت ہے اس کی یہ بے نیازی اور سادگی
 مجھے بے حد عزیز ہے۔“ ارتضیٰ نے ایک محبت بھری
 نگاہ ثمن پر ڈال کر کہا۔ ثمن کے چہرے پر فخریہ
 مسکراہٹ بگھڑ گئی۔ وہ ان دونوں کو شب بخیر کہہ کر اپنے
 کمرے میں آکر لیٹی تو اسے نیند نہیں آئی۔

اسے یہاں آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اس دوران
 اس نے ثمن کا بالکل اسی طرح خیال رکھا تھا جیسا اماں
 نے اسے ہدایتیں دے کر بھیجا تھا۔ وہ اسے مختلف
 چیزیں پکا پکا کر کھلاتی اور ثمن ہزار خرے دکھا کر انہیں
 کھاتی۔ اس روز ارتضیٰ کے آفس سے آنے کے بعد
 وہ عینوں ساتھ بیٹھ کر شام کی چائے پی رہے تھے جب
 ارتضیٰ ثمن کو بتانے لگا۔

”آج عامر کا فون آیا تھا۔ اپنے گھر ڈنر پر انوائٹ کیا
 ہے اس نے۔“

”ڈنر اور وہ بھی عامر کنجوس۔ خیریت تو ہے آپ نے
 پوچھا نہیں یہ ڈنر کس خوشی میں دیا جا رہا ہے؟“ ثمن
 اس اطلاع پر اچھی خاصی حیران نظر آ رہی تھی۔

”میں نے بھی بالکل اسی طرح اس سے حیرت کا
 اظہار کیا تھا۔ کہہ رہا تھا تم لوگوں نے بلا وجہ مجھے بدنام کر
 رکھا ہے۔ خود پر لگے اس ”کنجوس“ کے الزام سے

نجات حاصل کرنے ہی کے لیے ڈنر دے رہا ہوں۔“
ار تفضی نے مسکراتے ہوئے عامر سے ہونے والی گفتگو
کے بارے میں بتایا۔

”ویسے ڈنر کی وجہ کوئی خاص نہیں ہے۔ بس قریبی
دوستوں کو انوائٹ کیا ہے اس نے۔“

”یہاں سب ملنے والوں میں عامر کی کنجوسی مشہور
ہے۔ رضا بھائی تو اسے اس کے منہ پر کنجوس کے لقب
سے نوازتے ہیں۔ مگر وہ مجال ہے جو کوئی اثر لے اس
بات کا۔ آج تک کبھی اس نے باقاعدگی سے اپنے گھر پر
کسی کو کھانے پر انوائٹ نہیں کیا۔ ایسے ہی کوئی چلا
جائے تو بڑی اچھی خاطر تواضع کرتا ہے۔“ ار تفضی کی
بات سننے کے بعد ثمن اسے اس گفتگو کے پس منظر
سے آگاہ کرنے لگی تھی۔ وہ چائے کے سبب لیتے
ہوئے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”پھر آپ لوگ مجھ سے چلنے کے لیے اصرار کرتے
ہیں۔ اس لیے میں ابھی سے بتا رہی ہوں کہ میں آپ
لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ اس نے حفظاً مقدم
کے طور پر پہلے ہی دو ٹوک انداز میں ان دونوں کو اپنے
انکار سے آگاہ کیا۔ ار تفضی نے اس کا موڈ دیکھ کر چلنے پر
اصرار نہیں کیا تھا۔ لیکن ثمن نے اگلے روز اسے
ساتھ لے جانے کی بہت کوشش کی تھی۔ اسے یقیناً
اس بات کی فکر تھی کہ صبا گھر پر اکیلی بور ہوگی۔

”بہت سے بہت آپ لوگ ڈھائی تین گھنٹوں میں
واپس آجائیں گے۔ اس سے زیادہ دیر تو لگتی نہیں ہے
اور اتنی تھوڑی سی دیر میں مجھے بور ہونے کا ذرا بھی تاہم
نہیں ملے گا۔“ اس نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش
کی تھی۔ ان دونوں کی واپسی اس کی توقع سے بھی
جلدی ہو گئی۔

”اتنی جلدی آگئے۔ ابھی تو میں نے بور ہونا اور
آپ لوگوں کا انتظار کرنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔“ ثمن
اسے گھورتے ہوئے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی
تھی۔

”آپ کی ہی وجہ سے جلدی آئے ہیں۔ حالانکہ
ابھی اٹھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اتنا مزہ آ رہا تھا باتوں

میں۔ رضا بھائی اتنے مزے مزے کے قہقہے سنا رہے
تھے۔ چلتیں تو تم بھی انجوائے کرتیں۔“ ار تفضی بھی
ثمن کے برابر میں بیٹھ گیا۔

”عامر نے بھی تمہارا پوچھا تھا۔“ ثمن کی اس بات
پر اسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

”انہوں نے پوچھا ہو گا کہ صبا کیوں نہیں آئی؟ اسی
کے اعزاز میں تو میں نے یہ ڈنر دیا تھا۔“ اس کا انداز
مذاق اڑانے والا تھا۔

”تمہارے سرخاب کے پر نہیں لگے جو وہ خاص
طور پر تمہیں پوچھتا۔ یہ کہو کہ ہمارے سب جاننے
والے بہت مہمان نواز اور بااخلاق لوگ ہیں اسی لیے
تم جیسی سڑیل لڑکی کو اہمیت دیتے ہیں۔ جیسے ہی ہم
لوگ اندر داخل ہوئے، سلام دعا کے بعد عامر نے اگلی
بات یہی کہی تھی کہ ”بھابھی“ میں نے ار تفضی سے کہا
تھا کہ آپ سب لوگ آئیے گا۔ یقیناً ”سب لوگوں سے
مراد تم تھیں۔ خواہ مخواہ مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔ سچی بات تو
بتا نہیں سکتی تھی کہ میری بہن صاحبہ خود کو بڑی اونچی
شخصیت سمجھتی ہیں۔“ ثمن اس کے استہزائیہ انداز پر
چڑ گئی۔

”اچھی لگ رہی ہو، دونوں بہنیں لڑتے ہوئے۔“
ار تفضی بیوی آف کر کے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔
”دیکھا ثمن، انہیں کتنی تمنا ہے، ہم دونوں کو لڑتے
ہوئے دیکھنے کی۔“

”تمہاری حرکتیں یہی رہیں تو بہت جلدی یہ تمنا
پوری بھی ہو جائے گی۔“ ثمن غصے سے کہتے ہوئے
وہاں سے اٹھ گئی۔ اس کا یہ غصہ کتنی دیر کا ہو گا یہ وہ
جانتی تھی۔ اس لیے اطمینان سے سونے کے لیے
کمرے میں آگئی۔

اس روز جب عامر ان کے گھر چلا آیا تو وہ خود اور اس
کے گھر ہونے والی دعوت ایک مرتبہ پھر موضوع گفتگو
بن گئے۔

”میں یہاں سے گزر رہا تھا، سوچا آپ لوگوں سے
بھی مل لوں۔“ اس کے آنے سے پہلے وہ تینوں لان
میں بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے، ار تفضی نے اسے بھی

وہیں بٹھالیا۔
”بہت اچھا سوچا آپ نے عامر! اور اب کھانا آپ
ہم لوگوں کے ساتھ کھا کر جائے گا۔“ کچھ دیر بعد شمن
نے اندر آکر خانا ماں سے کھانا لگانے کے لیے کہا۔

”اگر آپ کو سبزیاں پسند نہیں بھی ہیں۔ تب بھی
میا کے ہاتھ کی بنی یہ ڈش ترائی ضرور کیجئے گا۔ اس نے
مجھے اس کی ریسپی نہیں بتائی پتا نہیں کس طرح یہ چیز
اور سبزیاں مکس کر کے اتنے مزے کی ڈش تیار کر لی
ہے۔“ کھانے کی میز پر شمن کی یہ تعریف تو اسے زہر
لگی ایسی تھی مزید غصہ اس وقت آیا جب عامر نے شامی
کبابوں کی ڈش کی طرف بڑھایا ہوا ہاتھ پیچھے ہٹا کر
سبزی کا باؤل اپنے سامنے کر لیا تھا۔ اس نے نہ براہ
راست اسے مخاطب کیا تھا نہ کسی خاص توجہ سے اس
کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن پھر بھی اسے اس شخص سے
چڑی ہو رہی تھی۔

”صحیح تعریف کر رہی تھیں آپ یہ ڈش واقعی بہت
مزے کی ہے۔ اگرچہ میں وہ بجٹیرین نہیں لیکن یہ
سبزیاں مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔“ اس ڈش کے
نصیدے بھی شمن نے ہی پڑھے تھے چنانچہ جوابی
تریف بھی اسی سے کی گئی۔

کھانے کے بعد وہ لوگ ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ
گئے وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ کتنی دیر بیٹھا اور پھر
کب واپس آگیا اسے بالکل پتا نہیں تھا وہ میگزین
پڑھتے پڑھتے ہی سو گئی۔

صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔

”آج خوب سوئیں تم۔“ وہ منہ دھو کر نیچے آئی تو
شمن نے اس سے کہا۔ وہ دودھ کا گلاس لے کر شمن کے
ہاں واپس لاؤنج میں آگئی تھی۔

”کل رات تم اتنی جلدی کیوں سو گئی تھیں؟“

”ایک تو مجھے نیند آرہی تھی اور دوسرے تمہارے
نہان آئے ہوئے تھے بلاوجہ اجنبی آدمی کے ساتھ
بیٹھ کر گفتگو کرنے کا میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔“
اس نے اخبار پڑھتے ہوئے جواب دیا۔

”ویسے صبا! مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ عامر سے

ار تفضی کی اچھی دوستی ہے مگر وہ اتنا فاسخ نہیں کہ یونہی
گزرتے گزرتے خواہ مخواہ ہمارے گھر آجائے جبکہ
پرسوں رات ہی تو ہم لوگوں کی ملاقات ہوئی تھی۔“ وہ
دودھ کا گلاس خالی کر چکی تھی۔ گلاس سینٹر میل پر رکھ
کر اس نے دوبارہ اخبار پر نظریں جمادیں اس نے شمن
کی بات ان سنی کر دی تھی۔

”رات عامر کے جانے کے بعد میں نے یہی بات
ار تفضی سے کہی تو وہ ہستے ہوئے کہنے لگے

”تم اب چونکی ہو۔ میں پرسوں رات عامر کے گھر
ہی چونک گیا تھا۔ ہم دونوں گاڑی سے اترے تو وہ کتنے
پر جوش طریقے سے ہمارا استقبال کرنے آیا تھا۔ لیکن
پھر ایک دم اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی تھی۔ کتنے
مایوس سے انداز میں اس نے تم سے کہا تھا کہ میں نے
سب لوگوں کو انوائٹ کیا تھا۔“ وہ اخبار پر سے نظریں
ہٹانے اور شمن طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ شمن یہ
سمجھ کر کہ اسے اس ذکر میں دلچسپی پیدا ہو رہی ہے مزید
تفصیل کے ساتھ ار تفضی کی کہی باتیں بتانے لگی۔



ار تفضی فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔ ”پروگرام تو
بہت اچھا ہے۔ اچھا چلو میں شمن سے بات کر لوں پھر
تمہیں کتنفرم کر دوں گا۔“ پھر الوداعی کلمات کہنے کے
بعد اس نے فون بند کر دیا تھا۔

”کس کا فون تھا؟“ شمن نے اس سے پوچھا۔

”عامر کا تھا۔“ ار تفضی نے اسے بتایا۔ پھر ایک
شرارتی سی نگاہ صبا پر ڈال کر شمن سے کہنے لگا۔

”پکنک کا پروگرام بنایا ہے اس نے کہہ رہا ہے دو
چھٹیاں اکٹھی آرہی ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر
کہیں گھومنے چلنا چاہیے۔ رضا اور فائزہ ہوں گے ہم
لوگ ہوں گے اور وہ خود۔“ اس کی بات سن کر شمن
کے چہرے پر بھی شوخ سی مسکراہٹ ابھری۔

”پھر کیا خیال ہے صبا! چلو گی پکنک پر؟“ وہ
مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے اس سے پوچھ رہا تھا۔
اسے اس شخص کے چہرے کی مسکراہٹ بھی اتنی بری

نہیں لگی تھی جتنی اس وقت لگ رہی تھی۔

”بے چارہ نوکری پیشہ آدمی ہے۔ میرے اور رضا کی طرح بزنس میں نہیں۔ مہینے میں ایک ہی بار تنخواہ ملتی ہے غریب کو۔ اب اگر تم پکنک پر نہیں گئیں تو لامحالہ اسے کوئی تیسرا پروگرام ترتیب دینا پڑے گا اور یہ اضافی بوجھ اس کی جیب برداشت نہیں کر پائے گی۔“ وہ نگاہوں میں شوخی اور شرارت لیے اسے چھیڑ رہا تھا۔ وہ پلیٹ میز پر بیٹھ کر ایک جھٹکے سے صوفے پر سے اٹھ گئی۔

”کیا ہوا صبا؟“ ثمن اسے یوں غصے سے اٹھتا دیکھ کر حیران ہو گئی۔ اس کے چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور ارتضیٰ بھی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ شوخی اور شرارت کی جگہ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی تھی۔

”میں تمہارے بلانے پر یہاں اس لیے نہیں آئی تھی ثمن! کہ تم لوگ میرے لیے کوئی بندہ ڈھونڈو اور پھر زبردستی اس کے ساتھ میرا تعلق جوڑنے کی کوشش کرو۔“ اس کی آواز اچھی خاصی بلند تھی۔

”کیا ہو گیا ہے صبا تمہیں۔ ارتضیٰ تو یونہی مذاق کر رہے تھے۔ کیا تمہیں مذاق سمجھنا بھی نہیں آتا؟“ ثمن کے چہرے پر ناگواری پھیلی۔ اسے صبا کا یہ بدتمیز انداز بہت برا لگا تھا۔

”اس قسم کا مذاق میں کسی کا بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ارتضیٰ بھائی کا بھی نہیں۔ آپ دونوں میاں بیوی کو رشتے کروانے کا اتنا ہی شوق ہے تو کوئی میرج بیورو کھول لیں۔ اپنے لیے اپنی پسند کا بندہ میں خود ڈھونڈ لوں گی۔“ اس بار اس کی آواز تو بلند نہیں تھی لیکن لہجہ ہنوز بدتمیز اور گستاخ تھا۔ وہ ان دونوں پر نظر ڈالے بغیر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ کتنی دیر تک وہ غصے سے کھولتی رہی تھی۔ بہت دیر تک بیڈ پر بیٹھے رہنے کے بعد وہ خود کو پرسکون کرنے کے لیے واش روم میں آگئی۔ کافی دیر تک چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتے رہنے کے بعد جب اس نے محسوس کیا کہ اس کا اشتہار

کم ہو گیا ہے تو وہ واپس کمرے میں آگئی۔ ارتضیٰ نہیں لیکن وہ توقع کر رہی تھی کہ وہ اس کے پیچھے ضرور آئے گی۔ لیکن اب جبکہ کئی گھنٹے گزر چکے تھے اور وہ نہیں آئی تو اسے یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ثمن اس سے ناراض ہے۔ اس نے کچھ دیر پہلے کا سارا واقعہ یاد کیا۔ اسے خود پر سے یوں اختیار کھودینے پر سخت تاسف ہوا۔

اس نے کبھی ارتضیٰ سے مس لی ہو نہیں کیا تھا پھر آج کیوں؟ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے بہت رونا آ رہا تھا۔ ساری رات وہ تکیے میں منہ دے کر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی آنکھ نہیں لگی تھی۔ صبح ہو چکی تھی۔ بستر سے اٹھ کر وہ کھڑکی کے پاس آئی تو نظریں لان میں ایک سرسبز کرتے ارتضیٰ سے ٹکرائیں۔ وہ دوپٹہ اوڑھ کر کمرے سے باہر نکلی۔ ثمن شاید ابھی جاگی نہیں تھی۔ وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ وہ لان میں آگئی۔ ارتضیٰ کی اس کی طرف پشت تھی اس لیے اس نے اسے آنے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

”السلام علیکم ارتضیٰ بھائی!“ اسے ارتضیٰ کا سامنا کرنے کے خیال سے شرمندگی ہو رہی تھی اسی لیے پیچھے سے ہی آہستگی سلام کیا تھا۔ وہ اس کی آواز سن کر چونکنے والے انداز میں بے ساختہ مڑا۔

”وعلیکم السلام۔“ اس کے چہرے کے تاثرات نارمل تھے۔ سلام کا جواب اس نے معمول کے انداز میں دیا تھا۔

”سوری ارتضیٰ بھائی! میں نے رات آپ کے ساتھ بہت بدتمیزی کی۔ مجھے اس طرح مس لی ہو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ثمن ٹھیک کہہ رہی تھی مجھے واقعی مذاق سمجھنا نہیں آتا، اتنی معمولی سی بات پر میں خواہ مخواہ چڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں دوبارہ سے آنسو آنے لگے۔ ارتضیٰ نے اس کی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے اس کی بات سنی۔ پھر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لان چیمبرز کی طرف آگیا۔

”بیٹھو“ اس نے کہا۔

کئی وہ خود بھی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔
 ”مما کہتی ہیں صبا! بعض دفعہ بہت بد تمیز اور منہ
 بٹ ہو جاتی ہے۔ پھر اسے اس بات کا بھی احساس
 نہیں رہتا کہ جس سے وہ بات کر رہی ہے وہ عمر اور
 رشتے میں اس سے بڑا ہے۔“ وہ اس سے نظریں
 ڈالتے بغیر سر جھکا کر بول رہی تھی۔ اس کے لہجے میں
 دکھ اور خود اپنے لیے بہت سا غصہ تھا۔

”مجھے رات کو ہی اپنی بد تمیزی کا احساس ہو گیا تھا۔
 ہر اہل چاہ رہا تھا میں اسی وقت آپ سے آکر معافی
 مانگوں۔ لیکن میری ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ آپ بھی
 جوتے ہوں گے کہ۔“ اس کی آنکھوں سے ہتے
 آنسو اس کی گود میں گر رہے تھے۔ اس نے ایک بار
 بھی ارتضیٰ کی طرف نہیں دیکھا۔

”میں نے کچھ نہیں سوچا صبا! مجھے نہ تم پر غصہ آیا
 اور نہ ہی میں تم سے ناراض ہوں۔ ہاں مجھے حیرت
 ہوئی تھی۔ میں تمہارے رویے پر حیران ہوا تھا اور
 ابھی بھی میری حیرت دور نہیں ہوئی ہے۔“ اس نے
 ہلکی سنجیدگی اور بردباری سے اسے جواب دیا۔

”تمہیں کیا بات بری لگی میں سمجھ نہیں پایا۔“
 ”بس مجھے وہ اچھے نہیں لگتے۔ اس دن جب وہ گھر
 آئے تھے تب شمن نے اسی طرح کی باتیں کی تھیں
 جیسی کل آپ کر رہے تھے۔ یہی کہ وہ میری وجہ سے
 گھر آئے تھے انہوں نے میری وجہ سے اپنے گھر پر
 زور دیا تھا۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ آپ کے
 دوست بہت اچھے ہیں ارتضیٰ بھائی! لیکن ضروری تو
 نہیں کہ وہ مجھے بھی اچھے لگیں۔“ ارتضیٰ کے چہرے پر
 سنجیدگی غائب ہو گئی۔ اس کے بولنے کا انداز اتنا
 ہلکا اور معصومانہ تھا کہ وہ اپنی بے ساختہ مسکراہٹ
 بالکل چھپا پایا۔

”تمہیں وہ اچھے نہیں لگے تو پھر وہ کون ہے جو
 نہیں اچھا لگتا ہے؟“ اس نے گھبرا کر ارتضیٰ کی طرف
 دیکھا۔ وہ اس کی بوکھلاہٹ کو محفوظ نگاہوں سے دیکھ
 رہا تھا۔

”بلکہ وہ تو کوئی برا نہیں لگتا۔ اس برا لگنے کے پیچھے

کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں
 کہ وہ وجہ کہاں پائی جاتی ہے؟“
 ”ایسی کوئی بات نہیں ہے ارتضیٰ بھائی! آپ بالکل
 غلط سمجھ رہے ہیں۔“ اس نے اپنے ایک ایک لفظ پر
 زور دیتے ہوئے اسے یقین دلانا چاہا۔

”بات تو کچھ ایسی ہی لگ رہی ہے مس صبا شفیق!
 چلو تم نہیں بتانا چاہ رہیں تو رہنے دو۔ اب کی بار کراچی
 آؤں گا تو خود ہی وجہ ڈھونڈ نکالوں گا۔ میرا خیال ہے وہ
 وجہ تمہاری یونیورسٹی میں پائی جاتی ہوگی۔ تب ہی میں
 سوچا کرتا تھا کہ صبا یونیورسٹی جا کر اتنی بدل کیوں گئی
 ہے۔ اتنی کھوئی کھوئی اور الگ الگ کیوں رہنے لگی
 ہے۔“ وہ اب کی بار کھل کر ہنس دیا۔ اس نے کچھ کہنے
 کے لیے لب و لہجے تو وہ اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔

”اب تم خواجہ خواہ اپنی انرجی ضائع کرو گے۔ جھوٹ
 بولو گے اور میں یقین نہیں کروں گا۔ تمہاری انرجی بھی
 ضائع ہوگی اور جھوٹ بولنے پر گناہ الگ ملے گا۔ ایسا
 کرتے ہیں اس بات کو ہمیں ختم کر دیتے ہیں۔ کسی اور
 ٹاپک پر بات کرتے ہیں؟“

”آپ نے مجھے معاف کر دیا نا؟ سچ بتائیں ارتضیٰ
 بھائی! آپ کے دل میں میری طرف سے کوئی بدگمانی تو
 نہیں؟“ ارتضیٰ نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا
 دیا۔ اسی وقت شمن لان میں چلی آئی۔ ان دونوں کو
 ساتھ بیٹھا دیکھ کر اسے بہت تعجب ہوا۔ رات صبا کے
 رویے پر غصہ آنے کے ساتھ ساتھ اسے ارتضیٰ کے
 سامنے سخت شرمندگی بھی ہوئی تھی۔ رات اسی
 شرمندگی میں وہ اس سے کوئی بات کہے بغیر ہی سو گئی
 تھی۔ وہ ان دونوں کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

”آپ کے کپڑے میں نے نکال دیے ہیں۔“ وہ
 ارتضیٰ سے مخاطب تھی۔ ارتضیٰ نے جواب میں
 ”چھا“ کہا تو وہ فوراً واپس مڑ گئی۔ اس نے صبا کی
 طرف بالکل بھی نہیں دیکھا۔ اسے مکمل طور پر نظر
 انداز کر کے اپنی ناراضی کا اظہار کرتی وہ اندر چلی گئی
 تھی۔

”شمن مجھ سے بہت زیادہ خفا ہے۔ آپ اس سے

”جی ار تفضی بھائی! میں دیکھ رہی ہوں ابھی۔“ اپنی آواز میں بے شاشت اور تازگی پیدا کرنے کی کوشش کرنے کے باوجود اسے ایسا لگا جیسے اس کے لفظ رور ہے ہیں۔
”یہ پنک سوٹ دیکھو کیسا الگ رہا ہے؟“ ثمن نے اسے اشارے سے ایک سوٹ دکھایا۔

”ہاں واقعی! یہ بہت پیارا الگ رہا ہے۔ بہت خوب صورت اور منفرد پرنٹ ہے۔“ اس نے فوراً ”ثمن سے اتفاق کرتے ہوئے سیلز مین سے وہ پنک سوٹ نکالنے کے لیے کہا۔ کوئی فرق نہیں پڑتا اگر وہ واسٹ سوٹ کی جگہ پنک لے لے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا اگر جو چیز اس نے پسند کی وہ ار تفضی، ثمن کو دے رہا ہے۔ اس کی تو زندگی کا سب سے اولین خواب سب سے بڑی خواہش، ار تفضی نے اس سے چھین کر ثمن کو دے دی تھی۔ وہ جب اتنی بڑی بات پر سمجھوتا کر سکتی ہے تو اس معمولی سے سوٹ پر کیوں نہیں۔ اس نے خوشی خوشی وہ شار اپنے ہاتھ میں لیا۔ جس میں وہ پنک سوٹ رکھا ہوا تھا اور جسے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آگ لگا دے۔ اس کے بعد بھی وہ لوگ کافی دیر تک شاپنگ کرتے رہے تھے۔



”اب کتنے دنوں تک میں تمہیں یاد کر کر کے اداس ہوا کروں گی۔“ ایمر پورٹ پر اسے رخصت کرنے ار تفضی کے ساتھ ثمن بھی آئی تھی۔ وہ اس کے جانے پر بہت اداس نظر آرہی تھی۔

”اتنی جلدی تمہاری چھٹیاں ختم ہو گئیں، پتا ہی میں چلا۔ دل چاہ رہا ہے ابھی بھی تمہیں جانے نہ دیں۔“ ثمن اس کے گال چومتے ہوئے بولی۔

”اتنی میری یاد آتی ہے تو کراچی آ جاؤ۔ ار تفضی بھائی! جب لاہور میں کام مکمل ہو جائے گا وہ تب واپس جائیں گے۔“ اس نے بظاہر بڑی سنجیدگی اور اپنائیت سے اسے مشورہ دیا۔ اس بات پر ثمن کی خاموشی لازمی تھی۔ ار تفضی اسے خاموش دیکھ کر ہنس پڑا تھا۔

”دیکھا ار تفضی بھائی! یہ پکڑی گئی میرا نمبر اس نے

آپ کے بعد رکھا ہے۔ آپ کے بغیر یہ کبھی کراچی نہیں آئے گی، مگر منہ سے یہ بات قیولے کی نہیں۔“ ثمن نے ہنستے ہوئے ار تفضی سے کہہ رہی تھی۔ انداز سراسر ثمن کو چھیڑنے والا تھا۔

”ہر محبت کی اپنی الگ جگہ اور الگ مقام ہوتا ہے۔ جو ار تفضی ہیں وہ کوئی نہیں ہو سکتا اور جو تم ہو وہ بھی کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔“

”صبا تیار رہو۔ بس اب رونے دھونے کا سیشن شروع ہونے والا ہے۔“ ثمن کو آنسو روکتے دیکھ کر ار تفضی نے اس سے کہا۔

”جی نہیں، میں کوئی نہیں رورہی۔“ اس نے غفل سے ار تفضی کی طرف دیکھا۔

”اپنا خیال رکھنا صبا!“ اس نے دوبارہ صبا کی طرف دیکھا۔

”میں تو اپنا خیال رکھ ہی لوں گی۔ تم اپنا خیال ذرا اچھی طرح رکھنا۔ نہیں تو اب کی بار میرے بجائے اماں آئیں گی تمہارا خیال رکھنے کے لیے۔“ اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔



وہ ماما کی گود میں سر رکھے انہیں اپنے لاہور کے قیام کی تفصیلات سنارہی تھی۔

”کتنے دنوں بعد آج آپ نے مجھے اس طرح اپنے پاس لٹایا ہے ماما!“ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹی ہوئی تھی۔ ماما اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے ہنسنے لگیں۔

”اتنی بڑی ہو گئی ہو۔ ابھی تک ماما کی گود چاہیے۔ کل کو تمہاری شادی کروں گی پھر ماما کی گود کہاں سے آئے گی؟“

”مجھے تو میری ماما کی گود ہمیشہ چاہیے۔ ساری زندگی۔ جب میں بوڑھی ہو جاؤں گی نا تب بھی۔“ اس نے شادی کے ذکر پر برا سامنہ بنا کر کہا۔

”ماما! ثمن نے اپنا گھراٹا خوب صورت سجایا ہے۔“ ثمن، ار تفضی بھائی کے ساتھ بہت خوش ہے ماما

چومتے ہوئے بے ساختہ کہا۔

”یہ تو بالکل ارتضیٰ کا بچپن ہے مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے وقت پیچھے کی طرف سفر کر گیا ہے اور ارتضیٰ پھر سے میری گود میں آ گیا ہے۔“ اس نے دُرتے دُرتے معاذ کو اپنی گود میں لیا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اتنے چھوٹے بچے کو اٹھایا تھا اس کے چھوٹے چھوٹے اور نازک سے ہاتھ پاؤں اسے کنفیوز کر رہے تھے بڑی احتیاط سے اس نے اسے گود میں لیا تھا۔ ماما اس کے دُرتے ہوئے انداز پر ہنس دیں۔ پھر مسکراتے ہوئے وہ اسے سمجھانے لگیں کہ اتنے چھوٹے بچوں کو کس طرح اٹھایا جاتا ہے۔

بہت آہستگی سے اس نے معاذ کا ہاتھ چوما تو وہ ایک بہت ہی مختلف سے احساس سے دوچار ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس ننھے سے وجود میں سے محبت کی بہت طاقت ور شعاعیں نکل رہی ہیں اور وہ طاقت ور شعاعیں سیدھی اس کے دل پر پڑ رہی ہیں۔ اس کا دل چاہا وہ اسے خوب بھیج کر پیار کرے۔ محبت کا یہ کیسا احساس جاگا تھا اس کے دل میں۔ کیا اس لیے کہ وہ ارتضیٰ کا بیٹا تھا یا پھر اس لیے کہ وہ شمن کا بیٹا تھا اس کی بہن کا بیٹا تھا؟ اس کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔



وہ یونیورسٹی سے آ کر بیگ اور دوپٹہ کمرے میں اچھالتی سیدھی شمن کے کمرے میں آ گئی تھی۔ ارتضیٰ عقیقہ کے اگلے روز واپس چلا گیا تھا جبکہ شمن ابھی یہیں تھی۔ معاذ جاگا ہوا شمن کے پاس لیٹا تھا۔ وہ خاموشی سے لیٹی ایک ٹک اسی کو دیکھ رہی تھی۔

”ایسے نکٹکی باندھ کر کیوں دیکھ رہی ہو میرے بھانجے کو۔ کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟“ وہ دوسری طرف سے آ کر بیڈ پر چڑھ گئی اور فوراً ”ہی معاذ کو گود میں اٹھالیا۔ شمن جواباً ”صرف مسکرائی تھی۔

”تم ابھی اتنی خاموشی سے لیٹ کر معاذ کو دیکھتے

ارتضیٰ بھائی اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔“ اس کی بات سن کر ”ہاں“ مجھے بتا ہے یہ بات۔“ اس کی بات سن کر سرشاری سے مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

اس لیے تو میں اس کی دوری خوشی خوشی برداشت کر رہی ہوں ورنہ اسے خود سے دور بھیجنے کا اب مجھ میں حوصلہ نہیں مگر جب بیٹی اپنے گھر میں اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہوتی ہے نا پھر چاہے وہ ماں کو مہینوں اپنی شکل نہ دکھائے ماں کا دل مطمئن رہتا ہے۔ شمن یہاں میرے پاس رہتی میری خواہش تو یہی تھی۔ پھر اب جبکہ وہ پریگنٹ ہے اس وقت تو میری شدید خواہش ہے کہ وہ میرے پاس رہے اور میں خود اس کا خیال رکھوں۔

جن سے بہت محبت ہوتی ہے نا صبا! پھر ان کی خوشی ہی میں ہم اپنی خوشی ڈھونڈتے ہیں۔ چاہے ان کی اس خوشی میں ہمارے لیے کوئی تکلیف اور آزمائش ہی کیوں نہ ہو۔ ”محبت کی جو تعریف ماما سے سنا رہی تھیں وہ اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟ محبت میں اتنا حوصلہ اور اتنا صبر کیسے آ سکتا ہے؟ اس کی سوچ شاید ابھی خام ہے۔ وہ ابھی امیجیور ہے۔ اس نے دنیا کو صحیح سے دیکھنا اور سمجھنا شروع نہیں کیا۔ شاید آنے والے وقت میں وہ محبت کی اس تعریف کو سمجھ جائے۔ محبت اسے ضد کے بجائے صبر کرنا سکھاوے۔



وہ ایک بہت ہی روشن اور چمکیلی صبح تھی جب معاذ پیدا ہوا۔ کتنا پیارا تھا وہ۔ گول مٹول سا خوب صحت مندان کے گھر میں خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔

اللہ کے خوشی کے مارے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ بابا سارے خاندان میں مٹھائی تقسیم کر داتے پھر شمن شمن ماں بن کر اور بھی بروقرار اور حسین رہی تھی۔ اللہ نے اس کی دعا قبول کر لی تھی۔ اسے بیٹا دے دیا تھا جو شکل و صورت میں بالکل اپنے باپ جیسا لگ رہا تھا۔ اماں نے معاذ کو گود میں لے کر

میری دوستی کروادیں۔ "تمن کو اس نے بھی غصے میں نہیں دیکھا تھا اور اب جب وہ پہلی مرتبہ غصے میں نظر آ رہی تھی تو وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔

"جا کر سوری بول دو۔ وہ تم سے زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہ سکتی۔" ار تفضی کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔ میں نے اس سے بد تمیزی کی ہوتی تو وہ بہت آسانی سے مجھے معاف کر دیتی۔ لیکن میں نے تو آپ سے بد تمیزی کی ہے اور اس بات پر وہ مجھے اتنی آسانی سے معاف نہیں کرے گی۔" وہ ار تفضی سے براہ راست یہ نہ کہہ سکی کہ وہ تم سے اتنی شدید محبت کرتی ہے کہ ہر اس شخص سے نفرت کرتی ہے جو تمہارے خلاف بولے جو تمہارے خلاف سوچے۔ لیکن ار تفضی اس کی بات میں چھپی یہ بات سمجھ چکا تھا۔ اسی لیے مسکراتے ہوئے بولا۔

"او تمہاری بہن صاحبہ سے صلح کروادوں۔" وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے اندر آ گئے۔ تمن کچن میں تھی۔ ار تفضی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی تھی جو اس کے پیچھے کچن میں آتی صبا کو دیکھ کر فوراً ہی غائب بھی ہو گئی تھی۔

"تم کچن میں کیوں آ گئیں۔ ہم نے کراچی سے یہ جو ملازمہ بلوایا رکھی ہے اس سے کام کراؤ۔" تمن نے ایک نظر ار تفضی کو دیکھا اور پھر ایک نظر اس کے پیچھے خاموش کھڑی صبا کو پھر کچھ کہے بغیر اس نے اپنی نظریں ان دونوں پر سے ہٹالیں اور دوبارہ انڈے پھینکنے لگی۔ ار تفضی نے اسے اشارے سے اس کے پاس جانے کو کہا تو وہ فوراً اس کے پاس آ گئی۔

"لاؤ تمن! آلیٹ میں بنا دوں۔" تمن نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔ "بہت شکریہ میں خود بنا لوں گی۔ آپ زحمت نہ کریں۔"

"آئم سوری تمن! پلیز مجھے معاف کر دو۔" وہ ملتجیانہ انداز میں بولی مگر تمن پر بظاہر اس سوری کا کوئی اثر ہوتا نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے بے چارگی سے ار تفضی کی طرف دیکھا۔

"تمن میرا خیال ہے تمہیں صبا کے ساتھ مزید

ناراضی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ وہ پہلے ہی زیادہ شرمندہ ہے۔ میرے حساب سے اس قہر کو ختم کر دیا جانا چاہیے۔" وہ سنجیدگی سے بولتا ہوا ار تفضی کے پاس آیا تھا۔

"میں اس سے ناراض نہیں ہوں۔ بس مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میری بہن اتنی بد تمیز ہے۔" اس نے ایک تاسف بھری نگاہ صبا کی طرف ڈالتے ہوئے کہا۔ صبا کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر بھینکنے لگیں۔ جو کبھی ناراض نہ ہوتے ہوں وہ اگر کبھی ناراض ہو جائیں تو انہیں منانا اس قدر مشکل ہوتا ہے یہ بات اسے پہلی مرتبہ چلی تھی۔

"کون کہتا ہے صبا بد تمیز ہے۔ تھوڑی سی آؤٹ اسپو کن اور جذباتی ہے، مگر بد تمیز ہرگز نہیں ہے۔" ار تفضی نے ہمیشہ کی طرح جھٹ اس کی طرف واپس کی۔

"آپ بلا وجہ اس کے حمایتی مت بنیں۔" ار تفضی کے ساتھ خفگی کا اظہار کرتے کرتے اس کی صبا پر نظر پڑی تو ایک دم ہی سارا غصہ اور ناراضی بھول گئی۔ اس کی آنکھیں جو آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں انہوں نے اس کا غصہ لکھت ہی ختم کر دیا۔

"صبا! تم رو کیوں رہی ہو۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔

"ناراض نہیں ہو۔ پھر اتنی دیر سے اس طرح سپاٹ انداز میں اسے اسے کر کے کیوں بات کر رہی ہو؟" اس کے شکوہ پر ار تفضی کا ہنسنے کا لہجہ تھا۔

"چلو دونوں بہنوں کی صلح تو ہوئی۔ اب تم دونوں آپس میں گلے شکوے کرو۔ میں تیار ہونے جا رہا ہوں۔" اس کے کچن سے نکل جانے کے بعد ان دونوں نے دوبارہ ایک دوسرے کی طرف بغور دیکھا۔

"خود ہی بد تمیزی کرتی ہو۔ پھر مظلوم سی شکل بنا کر رونے بھی کھڑی ہو جاتی ہو۔" وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرنے لگی۔

"میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی صبا! اگر

چاہوں تو بھی نہیں۔" کچھ پل وہ اس طرح اس کے کندھے پر سر رکھ کر کھڑی رہی۔ چند لمحوں کے بعد وہ خود ہی اس کے کندھے پر سے سر اٹھا کر اس سے الگ ہو گئی۔

پھر صرف اسی دن نہیں بلکہ آنے والے دنوں میں بھی ثمن اور ارتضیٰ نے اس رات کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ اس روز کے بعد ان دنوں میں سے کسی نے بھی عامر کے بارے میں بھی اس سے کوئی بات نہیں کی۔



اس کے واپس جانے سے دو دن پہلے ارتضیٰ اور ثمن اسے شاپنگ کروانے لے گئے تھے۔
 "ہم دنوں نے آپس میں طے کیا تھا کہ صبا کو جاتے وقت کوئی زبردست سا گفٹ دیں گے۔ پھر ثمن کہنے لگی کہ بجائے خود خریدنے کے اگر ہم صبا کو اس کی مرضی کی چیز دلوائیں تو زیادہ اچھا رہے گا۔ چنانچہ تمہیں شاپنگ کے لیے لے کر جایا جا رہا ہے اور اس بات کی میری طرف سے تمہیں کھلی اجازت ہے کہ تم جو دل چاہے خرید لینا۔" گھر سے نکلتے وقت ارتضیٰ نے اس سے کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے ارتضیٰ بھائی! میں تو اتنی دیر سے یہی سمجھ رہی تھی کہ ہم لوگ کہیں گھومنے جا رہے ہیں۔ پلیز آپ یہ شاپنگ واپنگ رہنے دیں۔" اس نے منع کرنا چاہا۔

"تو صبا شفیق اتنی بڑی ہو گئی ہیں کہ انہیں مجھ سے تکلف کرنا آگیا ہے۔" ارتضیٰ نے بیک ویو مرر میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کتنی بھی بڑی ہو جاؤ۔ میرے لیے تو وہی چھوٹی سی صبا ہی رہو گی وہ صبا جو مجھ سے پوچھ پوچھ کر اپنا اسکول کا کام کرتی تھی۔" ثمن جو اس کی باتوں کو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی اچنبھے سے بولی۔

"روزانہ آپ اسے ہوم ورک کراتے تھے؟"

اور ثمنیں تو کیا پوچھو اس سے ارتضیٰ بڑے مزے سے کہنے لگا۔

"ہمیشہ پچی ہی تو سمجھا مجھے۔ کبھی سوچا ہی نہیں کہ وہ لڑکی جسے آپ اب تک پچی سمجھتے ہیں وہ بڑی ہو چکی ہے۔ کھلونوں سے بھلنے والا وقت تو کب کا بچپن رہ گیا زندگی میں اس نے کچھ خواب دیکھے تھے۔ اس کے وہ سارے خواب تنکا تنکا کر کے آپ ہی نے یکجہریے ہیں۔" وہ خاموشی سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

ارتضیٰ، ثمن کو اس کے بچپن کے مختلف واقعات مزے لے لے کر سنا رہا تھا اور وہ بڑی اشتہاک سے انہیں سن رہی تھی۔ ساتھ ہنستی بھی جا رہی تھی۔ یقیناً وہ ان باتوں کو بہت انجوائے کر رہی تھی۔ پھر شاپنگ سینٹر سے مختلف چیزوں کی شاپنگ کرتے وہ لوگ اب ایک کپڑوں کی دکان میں کھڑے تھے۔

"کوئی خوب صورت سا سوٹ پسند کرو اپنے لیے۔" ثمن کے کہنے پر اس نے ادھر ادھر نظریں گھمائیں تو خود بخود ہی اس کی نگاہیں ایک سفید رنگ کے لباس پر جا کر ٹھہر گئیں۔

"ثمن! یہ سوٹ تم خرید لو۔" قبل اس کے کہ وہ اس سوٹ کی طرف اشارہ کرتی ارتضیٰ نے اسے ہاتھ میں لیتے ہوئے ثمن سے کہا۔

"لیکن میں اپنے لیے تو شاپنگ کرنے نہیں آئی تھی۔" ثمن ایک قدم آگے بڑھا کر ارتضیٰ کے برابر جا کر کھڑی ہو گئی اور سوٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"بس تم یہ لے لو۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔" وہ قطعیت بھرے انداز میں بولا پھر اس پر سے نظریں ہٹا کر صبا سے پوچھنے لگا۔

"کیوں صبا! پسند آیا تمہیں کوئی سوٹ؟" ارتضیٰ نے جیسے ہی سوٹ کو ثمن کے لیے پسند کیا اس نے فوراً اپنی نظریں اس سوٹ پر سے ہٹا لی تھیں وہ اب غائب دماغی سے ارد گرد نظریں دوڑاتی جیسے کوئی سوٹ پسند کرنا چاہ رہی تھی۔

ہوئے کیا سوچ رہی تھیں؟

”بتاؤں گی تو تم ہنسو گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں معاذ کے بارے میں سوچ رہی تھی صبا! وہ جب چلنا شروع کرے گا تو کیسا لگے گا اس کا وہ چھوٹا سا سہلا قدم کیسا ہو گا۔ وہ تھوڑا سا چل کر لڑکھڑا کر گرنے لگے گا میں جلدی سے اسے تھام لوں گی، گرنے سے بچا لوں گی، پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ لے کر اسے چلاتے ہوئے اس کا چلنے کا شوق پورا کراؤں گی۔“ اس کے تصورات کی دنیا صبا کے بے ساختہ سے قہقہے نے ختم کر ڈالی۔

”پھر وہ اور بڑا ہو گا اسکول سے کالج اور پھر کالج سے یونیورسٹی میں پہنچ جائے گا۔ اپنی کسی خوب صورت سی کلاس فیلو کے ساتھ اس کا زبردست قسم کا انیسٹر چلے گا۔ تم روایتی ماؤں کی طرح ولن کا کردار ادا کرتے ہوئے یہ شادی نہیں ہو سکتی“ کا اعلان کر دی۔ میں ایسے موقع پر اپنے بھانجے کی حمایت کر دیں گی۔ پھر اگر تمہاری مخالفت کے باوجود بھی یہ شادی ہو گئی تو تم اپنی بہو کا جینا دو بھر کر دو گی۔ ثمن تم ظالم اور خطرناک قسم کی ساس بن کر کتنی پیاری لگو گی۔“ وہ اپنی باتوں کو انجوائے کرتے ہوئے بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ ثمن بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”حد ہے صبا! میں اتنی سنجیدگی سے بات کر رہی تھی اور تم کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔“ وہ دونوں مل کر ہنس رہی تھیں۔



”صبا! یہ سوپ ثمن کو دے آؤ۔“ ممانے ثمن کے لیے سوپ تیار کر کے اس سے کہا تھا۔ وہ خود اب رات کے کھانے کے لیے ڈیڈی کی پسندیدہ فروٹ سلاڈ بنانے میں مصروف ہو گئی تھیں۔

”اس سے کہنا بغیر خرے دکھائے سارا سوپ پینا ہے۔“ ٹرے ہاتھ میں اٹھا کر کچن سے نکلتے ہوئے اس نے ممانے کی بات سنی اور سر ہلاتے ہوئے ثمن کے کمرے میں آ گئی۔ وہ کمرے میں آئی تو ثمن کسی سے

فون پر باتیں کر رہی تھی۔

”بہت مزہ آرہا ہے مجھے یہاں پر۔ سب ایسے نخرے اٹھا رہے ہیں میرے جیسے میں کوئی وی آئی لی ہوں۔ ابھی ابھی صبا کمرے میں آئی ہے، میرے لیے ٹرے میں کچھ لے کر۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”ابھی ایک ہفتہ تو ہوا ہے آپ کو گئے ہوئے رہیں تھوڑے دن کے لیے، اچھا ہے میری اہمیت بتا چل رہی ہو گی۔ میرا فی الحال واپسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں یہاں بہت انجوائے کر رہی ہوں۔“ اس نے ثمن کے سامنے لا کر ٹرے رکھ دی پھر ایک نظر معاذ پر ڈالی وہ کٹ میں لیٹا بے خبر سو رہا تھا۔

”اچھا اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ مجھے سوپ پینا ہے۔“ پھر خدا حافظ کہتے ہوئے ثمن نے فون بند کر دیا۔

”ار تھنی کا فون تھا۔ مجھ سے واپس آنے کے لیے کہہ رہے تھے۔“ ثمن نے سوپ کا پیالہ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس سے کہا۔

”دیکھو ذرا مجھے گھر کی سجاوٹ اور شاہنگز کا لالچ دے کر بلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی اس نے بہت خاموشی سے ثمن کے خوشی سے جھلملاتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

”تم سوپ پیو ثمن! ممانے کہا ہے سارا سوپ پینا ہے تمہیں۔ میں کچن میں جا رہی ہوں۔ ممانے ڈیڈی کے لیے فروٹ سلاڈ بنا رہی ہیں، تھوڑی ان کی ہیلپ کراؤں۔“ ثمن نے چیخ منہ میں لے جاتے ہوئے سر ہلا کر گویا اسے جانے کی اجازت دی۔ وہ کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آ گئی۔

”ثمن! آج دوپہر میں جب تم مجھ سے اپنے خواب شیئر کر رہی تھیں تو میں انہیں اتنے ہی پیار سے سن رہی تھی جتنے پیار سے تم انہیں سنارہی تھیں۔ مجھے ایک پل کے لیے بھی تمہارے خوابوں سے حسد محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ میرے بسن کے خواب تھے، پھر تم نے میرے خوابوں کے ساتھ ایسا کیوں کیا ثمن؟

اجاڑ ڈالے ناں تم نے میرے وہ سارے خواہ وہ خواب جو میں اپنی زندگی کے سترہ سالوں تک دیکھتی

رہی۔ مجھے یہ بات یاد آتی ہے کہ تم ہی وہ لڑکی ہو جس نے میرے خواب مجھ سے چھین لیے، تو پھر مجھے تم سے نفرت بھی محسوس ہوتی ہے اور تم سے تمہارے خواب چھین لینے کا دل بھی چاہتا ہے اور جب تمہیں اپنی بہن کی نظر سے دیکھتی ہوں تو تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو، تم پر پیار آتا ہے اور ار تفضی غضنفر کے ساتھ دیکھتی ہوں کہ اس کے حوالے سے دیکھتی ہوں، تم اس کی محبوبہ ہو، اس کی بیوی ہو، اس کے بچے کی ماں ہو۔ تو مجھے تم سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ دیکھ کر اس کے بارے میں اتنے استحقاق کے ساتھ بولتا دیکھ کر آج بھی مجھے اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے۔ اتنی ہی اذیت جتنی اول روز ہوئی تھی۔ وہ ماما کے پاس کچن میں آگئی تھی۔



شمن ار تفضی سے آنے کے لیے منع کرنے کے باوجود دو دن بعد ہی لاہور چلی گئی تھی۔ اماں، شمن کے ساتھ گئی تھیں۔ پہلے اگر انہیں صرف شمن کی فکر رہا کرتی تھی تو اب فکر کرنے کے لیے معاذ کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد گھر میں ہر طرف سناٹا پھیل گیا تھا۔



ار تفضی کالاہور میں کام ختم ہو گیا تھا۔ وہ لوگ کراچی واپس آ گئے۔ معاذ اب گیارہ ماہ کا ہو چکا تھا۔ اس کی پہلی سالگرہ آنے میں صرف ایک مہینہ رہ گیا تھا۔ بلا کا ضدی اور شرارتی تھا وہ۔ سب گھر والوں کو نیچائے رکھتا تھا۔ اس کی شرارتوں اور شور شرابے سے گھر میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی تھی۔ وہ ایک اکیلا بچہ تھا اور لاڈ اٹھانے والے بہت۔ اماں خوش ہو ہو کر اپنے بچوں کو دیکھتی تھیں۔ ان کا خاندان مکمل ہو گیا تھا،

صرف ظفر کی کمی تھی۔ باقی ان کے سب بچے ان کی نگاہوں کے سامنے تھے۔

”عامر کی شادی ہو گئی، پچھلے مہینے۔“ معاذ کو کچھڑی کھلاتے ہوئے شمن نے اسے مخاطب کیا۔ وہ معاذ کے ساتھ بلا کس سے کھیلنے میں مصروف تھی۔

”کون عامر؟“ اسے واقعی یاد نہیں آیا تھا۔

”زیادہ بنو مست۔ وہ فائزہ کا کزن۔ اب یہ مت کہنا کہ کون فائزہ۔“ شمن نے کسی قدر ناراض لہجے میں کہا۔

”اچھا وہ ہاں یاد آ گیا مجھے بہت مبارک ہو۔“ اس کے لیے جیسے اس بات میں کہیں افسوس کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ ”کس سے ہوئی اس کی شادی۔ وہ جو لڑکیاں اس کے پیچھے قطار لگائے کھڑی رہا کرتی تھیں ان ہی میں سے کسی سے ہوئی ہے یا کوئی اور ہے۔“ اپنی اسی مصروفیت کے ساتھ اس نے بغیر سرائٹھائے پوچھا۔

”کزن ہے اس کی بہت پیاری ہے۔ فائن آرٹس میں گریجویشن کر رہا ہے اس نے۔ اسلام آباد میں ہوا تھا اس کا ولیمہ، ہم لوگ بھی گئے تھے۔ اتنا شاندار پل ہے ان دونوں کا۔ ولیمہ والے دن عامر گرے سوٹ میں بے حد ہینڈ سم لگ رہا تھا حالانکہ کسی سے جیلس ہونا اچھی بات نہیں لیکن پھر بھی مجھے اس کی بیوی سے اتنی جیلسی ہو رہی تھی۔“ شمن نے بہت دکھ بھرے انداز میں اسے تفصیلات سنائیں۔

”تم کیوں جیلس ہو رہی تھیں؟۔ وہ ار تفضی بھائی سے زیادہ ہینڈ سم تو نہیں لگ رہا ہو گا۔“

”بلا وجہ اتراؤ مت۔ سب پتا ہے تمہیں۔ اتنا اچھا لگتا تھا عامر مجھے تمہارے لیے فائزہ نے مجھ سے تمہارے اور عامر کے رشتے کے بارے میں ایک بار بات بھی کی تھی۔ جب تم لاہور ہم لوگوں کے پاس رہے واپس آ گئی تھیں اس کے کچھ دنوں بعد ظاہری بات ہے عامر نے اس سے یہ بات کرنے کے لیے کہا ہر گاہ۔“

میرے ہاں کرنے کی دیر تھی، عامر فوراً ”اے“

پیرس کو یہاں کراچی رشتہ مانگنے کے لیے بھیج دیتا۔
اتنا دل دکھا میرا اس کو منع کرتے ہوئے۔ مگر تم جو اتنی
شدت کے ساتھ اس کے بارے میں ناپسندیدگی ظاہر
کر آئی تھیں تو میں بات آگے کیسے بڑھا سکتی تھی۔
شمن نے بہت غصے سے اسے گھورتے ہوئے ساری
بات بتائی۔ وہ شمن کی باتیں سن تو رہی تھیں مگر کسی
خاص توجہ کے بغیر۔

”صبا! تم مجھے سچ سچ بتاؤ۔ عامر کو ناپسند کرنے کی
اصل وجہ کیا تھی؟ تمہارا اس رات کا رد عمل میرے
لیے بہت حیرت انگیز تھا۔ اتنی شدت سے تم نے اس
بارے میں اپنی ناگواری کا اظہار کیا تھا کہ مجھے یوں لگا
جیسے تم کسی کو پسند کرتی ہو۔ تب اس بارے میں مزید
بات کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ارتضیٰ سے
بھی میری کبھی اس بارے میں بات نہیں ہوئی۔ شاید
میری طرح انہوں نے بھی دانستہ اس بات کو انکسور
کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ میں نے سوچا تھا کچھ دنوں
بعد تم سے پوچھوں گی۔ لیکن پھر معاذ کے ہونے کے
بعد تو میں ہر بات ہی بھول گئی۔ یہ تو پچھلے مہینے جو اس
کے ولیمہ کا کارڈ آیا اور پھر ہم لوگ وہاں گئے تو مجھے وہ
بھولی ہوئی بات یاد آئی۔“ وہ معاذ کو کھانا کھلا چکی تھی۔
نیپکن سے اس کا منہ صاف کرنے کے بعد اب وہ
مکمل توجہ کے ساتھ اسی کو دیکھ رہی تھی۔

”کیا واقعی کوئی ہے جسے تم پسند کرتی ہو یا پھر یہ محض
میرا وہم ہے؟۔ دیکھو سچ سچ بتانا۔ اگر تم نے مجھ سے
جھوٹ بولا اور پھر بعد میں مجھے صحیح بات کہیں اور سے
پتا چلی تو میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں میں نے تم سے
ارتضیٰ کے بارے میں ہر بات شیئر کی تھی۔ کی تھی کیا
ابھی بھی کرتی ہوں۔ جب میں تمہیں اپنی ہر بات بتاتی
ہوں تو پھر یہ میرا حق ہے کہ تم بھی مجھ سے کچھ مت
چھپاؤ۔“

”تم مجھے ہر بات اس لیے بتاتی تھیں کیونکہ
تمہارے پاس بتانے کے لیے بہت ساری باتیں
تھیں۔ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ کاش تمہاری طرح کی

کوئی لواشتوری میری بھی ہوتی۔ ایک ہینڈ سم سب بندہ جو
دل و جان سے مجھ پر فدا ہو رہا ہے اور جسے دیکھ کر میرا
دل تیز تیز دھڑکنا شروع کر دیتا ہو۔ افسوس میرے پاس
تمہیں سنانے کے لیے کوئی حسین اور رنگین کہانی
نہیں ہے۔“ وہ شگفتگی سے ہنس دی۔

”پھر وہ تمہیں اتنا برا کیوں لگا تھا؟ وہ ہینڈ سم بندہ دل و
جان سے فدا ہو تو رہا تھا تم پر۔“ شمن نے جرح کی۔

”تمہیں سڈنی میں اپنا کلاس فیلو جو بہت جینٹل
تھا، بہت ہینڈ سم تھا اور تمہیں بہت پسند بھی کرتا تھا
کیوں اچھا نہیں لگتا تھا؟ اور وہ تمہارے انکل کا بیٹا جو
صرف تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے تم لوگوں کے
گھر آیا کرتا تھا، کتنا کوالیفائیڈ تھا وہ، پھر کیوں تم نے
اسے ناپسند کیا، کیوں نہیں تم نے اس کی محبت قبول کر
لی تھی شمن؟“ وہ بہت مدلل انداز میں بولی۔ شمن
لا جواب ہو جانے والے انداز میں خاموشی سے اسے
دیکھ رہی تھی۔

”ہر اچھا شخص جو مجھے پسند بھی کر رہا ہو ضروری
نہیں کہ میں بھی اسے پسند کرنے لگوں اور یہ بھی
ضروری نہیں کہ اس ناپسندیدگی کے پیچھے کوئی نہ کوئی
وجہ بھی ہو۔ ایسے ہی میرے پاس بھی اسے ناپسند
کرنے کی کوئی وجہ نہیں سوائے اس کے کہ وہ وہ نہیں
جسے دیکھ کر میرا دل تیز دھڑکنے لگے یا شاید کچھ بل کے
لیے دھڑکنا ہی بھول جائے۔“ شمن کے پاس اب بحث
کرنے کے لیے کوئی پوائنٹ نہیں بچا تھا۔

معاذ کی پہلی سالگرہ آنے میں چند دن رہ گئے تھے۔
گھر میں سب کی خواہش تھی کہ سالگرہ کی تقریب
خوب شاندار طریقے سے منعقد کی جائے۔ گھر میں کئی
دن پہلے سے فنکشن کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔
شمن کو ظفر کے اس موقع پر دور ہونے پر بہت رنج تھا۔
”وہیے فرمائشیں کر کر کے معاذ کی تصویریں اور
مووی منگواتے رہتے ہیں۔ دیکھوں تو سہی میرا بھانجا
کتنا بڑا ہو گیا اور اب جب اسی لاڈلے بھانجے کی

سالگرہ ہے تو انہیں تحفہ بھیجنا تو دور کی بات فون پر مبارک باد دینا بھی یاد نہیں رہا۔ ”وہ ماما سے ملنے ٹکڑے کرنے میں مصروف تھی۔

ان دونوں سے کچھ فاصلے پر بیٹھا، ارتضیٰ بظاہر معاذ کے ساتھ کھیلتا ہوا اس گفتگو کو لاپرواہی سے سن رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک شوخ سی مسکراہٹ چھپی ہوئی تھی۔ ظفر نے اپنے آنے کی اطلاع صرف اس کو دی تھی۔ یقیناً ”وہ اس طرح اچانک پہنچ کر سب کو سررازدینا چاہتا تھا“ تھوڑی دیر بعد جب وہ معاذ کو ثمن کی گود میں دے کر یہ کہتا ہوا کہ ”میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ گھر سے گاڑی لے کر نکلا تو کسی کے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ظفر کو لینے ایرپورٹ جا رہا ہے۔

ظفر کو ایک دم سے اپنے سامنے دیکھ کر سب ہی بہت خوش ہوئے، مگر ثمن کی خوشی تو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ گھر میں پہلے ہی سے خوشیوں نے قدم جما رکھے تھے، ان خوشیوں اور رونقوں کو ظفر کی آمد نے کئی گنا بڑھا دیا تھا۔

وہ تیار ہو کر ثمن کے کمرے میں آئی تو وہ بھی تیار ہو چکی تھی۔ پریل کلر کی خوب کام سے بھری ہوئی قیمتی ساڑھی پہنے وہ ہمیشہ سے بھی بڑھ کر حسین لگ رہی تھی۔

”بہت خوب صورت لگ رہی ہو تم۔ یہ سیٹ اس ساڑھی کے ساتھ بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ اندر آکر اسے دیکھتے ہوئے اس نے بے ساختہ تعریف کی۔

”تم بھی تو بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ لیکن تم نے بال کیوں نہیں کھولے۔ ان کپڑوں کے ساتھ بال کھولتیں تو زیادہ اچھا لگتا۔“ وہ معاذ کو تیار کرنے میں مصروف تھی۔ اس کی تیاری کو غور سے دیکھنے کے لیے اس نے سر اوپر اٹھایا تھا۔

”اماں نے منع کر دیا یار! انہیں لگتا ہے کہ کہیں میرے حسیں بالوں کو کسی کا نظر نہ لگ جائے۔“

”لوگوں کو اور کوئی کام تھوڑی ہے دنیا میں۔ وہ بے چارے اتنے فارغ ہیں کہ میرے بالوں کی خوب صورتی پر خوب غور و فکر بھی کریں گے اور پھر انہیں نظر بھی لگائیں گے۔“ معاذ، ثمن کی گود میں اچھل کود رہا تھا، اسے ثمن کی تیاری کی فکر لاحق ہوئی، لیکن وہ اپنی تیاری کے خراب ہو جانے کے بارے میں ذرا بھی متفکر نہیں تھی۔

”میرا بیٹا میری گود میں آکر خوش ہو رہا ہے اور میرا یہ سوچ کر اسے خود سے دور کر دوں کہ کہیں میری ساڑھی خراب نہ ہو جائے۔“ اس نے معاذ کے ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

معاذ کے لیے وہ ہمیشہ ایسی ہی دیوانگی دکھاتی تھی، آج تو یہ دیوانگی ہمیشہ سے بھی بڑھ کر نظر آرہی تھی۔ بہت دلچسپی سے ماں بیٹے کی محبت دیکھ رہی تھی۔ کبھی اس کے ہاتھ چومتی، کبھی گال، کبھی ماتھا اور اسے جیسے ماں کے اس لمس سے بہت تسکین مل رہی تھی۔ خوب کھلکھلا کر ہنستے ہوئے وہ اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔

”تم تو ایسے پیار کر رہی ہو ثمن جیسے یہ تم سے کہیں دور جانے والا ہے۔“ وہ اس کی بے تابی اور اہمانہ انداز دیکھ کر کہے بنا رہ نہ سکی۔

”اللہ نہ کرے جو کبھی معاذ مجھ سے دور ہو۔“ ثمن کو اس کی بات پسند نہیں آئی۔

”میں اپنے بیٹے کو کبھی خود سے دور نہیں جاؤں گی۔ اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گی۔ پڑھنے کے لیے بھی باہر نہیں بھیجوں گی۔“ وہ اسے اسی انداز سے

پیار کرتے ہوئے اس سے بولی۔ اسی وقت کمرے دروازہ کھول کر ارتضیٰ اندر آیا۔ ایک بہت ہی بھرپور نگاہ اس نے ثمن پر ڈالی، صبا کی موجودگی کی وجہ سے منہ سے تو کچھ نہیں بولا، لیکن اس کی نگاہوں کی ستارے

چمک جتا رہی تھی کہ وہ اسے اس روپ میں بہت پیار لگ رہی ہے۔

بالکل شہزادہ لگ رہا ہے۔" اس نے ارضی کی توجہ بیٹے کی طرف مبذول کروائی وہ اس کے کہنے سے پہلے ہی معاذ کو دیکھ چکا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر اس کے گل چومے۔

"میں اپنی ماما کو بتاؤ کہ وہ خود بھی بالکل شہزادی لگ رہی ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ ثمن ان کنکشنز پر بری طرح جھینپ گئی تھی۔

"صبا! تم ہم تینوں کی ایک تصویر تو کھینچو ذرا جلدی سے پھر میں کیک لینے جاؤں گا۔" اس نے سائنڈ ٹیبل پر رکھا کیمرو اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ایک ساتھ کھڑے ہو گئے، معاذ کو ثمن نے گود میں اٹھالیا۔

"صبا! تصویر بہت اچھی آئی چاہیے۔ تمہاری فوٹو گرافی کا امتحان ہے آج۔" اس نے کیمرو آنکھ سے لگایا تو ارضی بولا۔ ثمن اور ارضی کے چہروں پر تو مسکراہٹ تھی ہی، معاذ بھی خوب کھلکھلا رہا تھا۔ اس نے تصویر کھینچ لی۔ ارضی رنگ نیل سے گاڑی کی چالی اور والٹ اٹھانے لگا تو ثمن بولی۔

"میں بھی چلوں آپ کے ساتھ۔ مجھے ماما کے اور اپنے لیے گجرے خریدنے ہیں۔" ارضی نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"تم بھی آ جاؤ صبا! ابھی تو کوئی بھی مہمان نہیں آیا فنکشن شروع ہونے میں خاصا وقت ہے ابھی۔"

معاذ کو گود میں اٹھا کر ارضی کے پیچھے جاتے ہوئے وہ اس سے بولی۔ معاذ کے لیے وہ بہترین سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوتی تھی۔ ارضی کے ساتھ مل کر اس نے خوب ساری بیکریز چھانی تھیں، اپنی پسند کا کیک بنوانے کے لیے۔

"تم لوگ بیٹھو میں کیک لے کر آتا ہوں۔" بیکری کے پاس لا کر گاڑی روکتے ہوئے وہ ان لوگوں سے بولا پھر وہ اندر چلا گیا اور یہ دونوں اس کا انتظار کرنے لگیں۔

"صبا! دیکھو وہ سامنے جو لڑکا گجرے بیچ رہا ہے اس کے گجرے کتنے خوب صورت اور بالکل فریش لگ

رہے ہیں۔" ثمن نے اسے وہ لڑکا دکھایا جو سگنل بند ہونے پر ہر گاڑی کے پاس جا کر اس میں بیٹھے لوگوں سے اپنے گجرے خریدنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"میں اس سے گجرے لے کر آتی ہوں۔ اتنے خوب صورت گجرے کسی دوکان پر ملنے مشکل ہیں۔" ان لوگوں کی گاڑی سروس روڈ پر بیکری کے سامنے پارک ہوئی ہوئی تھی اور وہ لڑکا سامنے روڈ پر ادھر سے ادھر بھاگتا گجرے بیچ رہا تھا۔

"ابھی ارضی بھائی آجائیں گے، تم ان سے منگوا لینا۔ خود کہاں جاؤ گی اس کے پیچھے۔" اس نے اسے منع کرنا چاہا۔

"دو منٹ لگیں گے یار۔ یہ گئی اور یہ آئی۔" وہ اس کی بات ان سنی کر کے گاڑی سے اتر گئی۔ وہ کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فٹ پاتھ سے اتر کر روڈ کے کنارے پر کھڑے ہو کر ہی ثمن نے اس لڑکے کو آواز دی تھی۔ اس نے ثمن کی آواز سن لی تھی، وہ روڈ کے دوسری طرف تھا۔ وہ ثمن کی طرف آنے لگا مگر اس کے پیچھے سے پہلے سامنے سے ایک انتہائی تیز رفتار بس ثمن تک پہنچ گئی۔ وہ بس اسٹاپ نہیں تھا، بس اس جگہ لا کر روکنے کا کوئی جواز نہیں تھا اور وہ بھی اتنی تیز رفتاری سے۔ اس نے ثمن کو روڈ پر گرتے دیکھا، بس کے ٹائر اسے کھلتے ہوئے کچھ دور جا کر رکے تھے۔

"ثمن۔" اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ اس کا بیگ اس کی گود سے پھسل کر سیٹ پر گر گیا۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر دیوانہ وار اس کی طرف بھاگی۔ صرف اسی نے یہ منظر نہیں دیکھا تھا، بیکری سے کیک کاؤبہ ہاتھ میں لے کر نکلتے ہوئے ارضی نے بھی اسے گرتے اور بس کے نیچے آ کر کھلے جاتے دیکھا تھا۔ کیک کاؤبہ اس کے ہاتھوں سے گر گیا تھا۔ وہ اندھا دھند بھاگا۔ صبا سے بھی پہلے وہ اس تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے کہاں کہاں سے خون بہہ رہا تھا پتا نہیں چل رہا تھا مگر وہ پوری کی پوری خون میں نہائی ہوئی تھی۔

”ٹمن آنکھیں کھولو دیکھو کچھ نہیں ہوا۔ ابھی ہم ہسپتال پہنچ جائیں گے۔“ وہ پاگلوں کی طرح اسے لہجھوڑ کر بولا پھر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر تیزی سے واپس گاڑی کی طرف آیا۔ اس کے جسم سے بے غشا بہتا خون اسے ہر اسٹاپ کر رہا تھا۔ اس کی قمیص اور اس کے ہاتھ ٹمن کے خون سے پورے پورے رنگ گئے تھے۔ اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر اس نے بہت تیز رفتاری سے گاڑی دوڑائی تھی۔ اس رفتار سے اس نے زندگی میں کبھی گاڑی نہیں چلائی تھی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر وہ ٹمن کا سراپنی گود میں رکھ کر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”آپ گاڑی تیز کیوں نہیں چلا رہے۔“ وہ روتے ہوئے چلا رہی تھی۔

”ٹمن! آنکھیں کھولو پلیز۔“ وہ اس کی بند آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”یہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہی ار تفتی بھائی! اس سے کہیں یہ آنکھیں کھولے۔“ وہ اپنے حواس کھو رہی تھی۔

”ٹمن! پلیز آنکھیں کھولو۔ دیکھو ابھی ہمیں معاذ کی رائیگرہ کافٹکشن کرنا ہے۔ گھر پر مہمان آنا شروع ہو گئے ہوں گے۔“ اس کا ہاتھ ٹمن کے سینے پر بالکل دل کے پاس رکھا تھا۔ اسے وہاں خاموشی کا احساس کیوں ہوا تھا۔ گھبرا کر اس نے اپنا ہاتھ وہاں سے اٹھالیا۔

”یہ کچھ بولتی کیوں نہیں ہے۔“ اس نے اپنے دل میں بھگے ہاتھوں کو خوفزدہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی گود میں سر رکھے وہ بالکل خاموش تھی، آنکھیں بند کیے جیسے اب کبھی کچھ نہیں بولے گی۔

وہ لوگ ہسپتال پہنچ گئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح بڑھڑکھڑکھ رہی تھی۔ اسے نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ کچھ سنائی دے رہا تھا۔ ڈاکٹر نے آکر ٹمن کو دیکھا۔ وہ منتظر تھی کہ ابھی وہ اسے ٹرٹمنٹ دینا شروع کرے گا۔ ان لوگوں سے کہے گا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ مگر وہ اسے ٹرٹمنٹ نہیں دے رہا تھا۔ وہ ان لوگوں سے ”فکر نہ کریں“ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔

وہ کہہ رہا ہے کہ ٹمن مر چکی ہے۔ وہ راستے ہی میں مر چکی تھی۔

اس کی گود میں سر رکھے رکھے ہی وہ مر چکی تھی۔ ار تفتی نے خالی خالی نگاہوں کے ساتھ بڑی بے یقینی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اسے قدموں چلتی ٹمن اور ار تفتی سے بہت دور ہٹ گئی تھی۔ پھر اس نے ار تفتی کو ٹمن کے اوپر جھک کر پیچ جھک کر روتے سنا۔ اس نے بھیج کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اسے لگا کہ ابھی وہ آنکھیں کھولے گی تو سب ٹھیک ہو گا۔ ٹمن اس کے پاس کھڑی مسکرا رہی ہوگی۔

”دیکھا کیسا ڈرایا میں نے تم لوگوں کو۔“ اس کے پاس آکر کوئی کچھ بولا تو تھا مگر وہ ٹمن نہیں تھی۔ پتا نہیں وہ کون تھی شاید کوئی نرس، وہ اس کے ہاتھوں میں بہت سے زیورات پکڑا رہی تھی۔ جڑاؤ ہار، سونے کے کنگن، انگلیٹھیاں، سونے کی چین پتا نہیں کیا کیا چیزیں تھیں۔ اس نے ان سب چیزوں کو تعجب سے دیکھنے لگی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے معروف ناول

- * دل پہلوں کی بستی ————— نکیت عبد اللہ ————— 400/-
- * جو پہلے تو جہاں سے گزرتے ————— ماہا ملک ————— 150/-
- * وہ خنجر سی دیوانی سی ————— آبیہ سلیم زیدی ————— 400/-
- * ملک انرا ہوئی ————— رفعت سراج ————— 550/-
- * ایمان امید اور محبت ————— عبیدہ احمد ————— 180/-
- * خواتین کا گھریلو انسائیکلو پیڈیا ————— 600/-

خوبصورت سڈ رق، آفٹ پیپر، خوبصورت چھپائی، دیدہ زیب منسلک جلد

شائع ہو گئے ہیں

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی

لاہور میٹ

- لاہور اکیڈمی • سلطان نیوز ایجنسی
- عظیم اینڈ سنز • اسلامیہ کتب خانہ

حیدر آباد میٹ

مہران نیوز ایجنسی

راولپنڈی میٹ

اشرف بک ایجنسی

اس نے ڈیڈی اور بابا کو لوریوں میں انا دیکھا تو بھاگتی ہوئی ان کے پاس آگئی۔

”ڈیڈی! شمن کو یہاں سے لے چلیں، یہ ہاسپٹل بالکل اچھا نہیں ہے۔ یہاں کے ڈاکٹر پتا نہیں کیسے ہیں۔ وہ شمن کو ٹریٹمنٹ نہیں دے رہے۔“ ڈیڈی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، وہ زار و قطار رو رہے تھے۔ بابا نے آگے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ لیکن بولے وہ بھی کچھ نہیں۔ ”چلو صبا۔“ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں سے لے آیا۔ وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ راستے بھر وہ خاموش رہی۔ گاڑی ان کے گھر کے پاس آکر رکی تو باہر سے ہی اسے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ اسے گھر کے اندر قدم رکھتے خوف آیا۔ وہ گاڑی سے اتر گئی مگر گھر کے اندر جانے کے بجائے لان کے آخری کونے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن یہاں پر بھی رونے کی بہت تیز آوازیں اس کے کانوں میں آرہی تھیں۔ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں، تھوڑی تھوڑی دیر بعد گاڑیوں سے اتر کر مختلف لوگ ان کے گھر میں آ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ لان میں بھی بہت سے لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔

مما فون پر شمن کے ایکسیڈنٹ کا سن کر ہی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اماں غم سے ندھال ایک طرف ساکت بیٹھی تھیں۔ ان کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور لبوں پر مسلسل بس ایک ہی جملہ تھا۔ ”شمن! یہ وقت تو میرے جانے کا تھا نا۔ پھر تم نے ایسا کیوں کیا۔ تمہیں اپنی بوڑھی دادی پر ذرا رحم نہیں آیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ اس صدمے کو سہہ بھی سکتی ہے یا نہیں۔“ ڈیڈی ایک طرف بیٹھے بلک بلک کر روتے بیٹی کے آخری سفر کی تیاریاں دیکھ رہے تھے۔ بابا ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ان کے کندھے کے گرد اپنا ہاتھ رکھ کر انہیں دلاسہ دینے کی کوشش کرتے وہ خود بھی روئے چلے جا رہے تھے۔

ایر تفضی ضبط کی آخری حد پر پہنچا خاموشی سے لوگوں کے عزتی جملے سن رہا تھا۔ اس کے لب بالکل خاموش

تھے اور اس کی آنکھیں بالکل دیران اور خیر۔ ظفر آج صبح جس بہن کو خوش کرنے کے لیے اسے سربراہ دینے اچانک یہاں پہنچا تھا، اس وقت اسی بہن کو آنکھیں بند کر کے گہری نیند سو تا دیکھ رہا تھا۔

کیا تقدیر اتنی سفاک ہوتی ہے۔ بہتے چہلوں سے یوں لمحہ بھر میں مسکان چھین لیتی ہے۔

کیا تقدیر اسے آج یہاں اس لیے لائی تھی کہ وہ بہن کے مرجانے پر لوگوں کی ہمدردانہ نظریں دیکھے، عزتی الفاظ سنے اور اپنے ماں باپ اور دادی کو عمر کی ان انتہاؤں پر سنبھالے۔ یہ سوچے کہ اسے رونا نہیں، اسے سب کو سنبھالنا ہے۔ بابا کو، ڈیڈی کو، ماما کو، دادی کو، ایر تفضی کو اور صبا کو۔

لیکن صبا وہ کہاں ہے؟ اسے اچانک صبا کا خیال آیا۔ ماما کے پاس ڈاکٹر اور اپنی چند رشتے دار خواتین کو چھوڑ کر وہ صبا کی تلاش میں آیا۔ یہاں وہاں اس کی تلاش میں نظریں دوڑا تا وہ گھر کے پچھلے حصے میں آگیا تھا۔ صبا اسے وہاں نظر آگئی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ خود بھی اسے آتا دیکھ کر اس کے پاس آگئی۔

”ظفر بھائی! شمن اپنے اور ماما کے لیے گھر لے گئی ہے۔“

”اسے گجروں نے نہیں، موت نے بلایا تھا صبا!“ ظفر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بے اختیار اس نے صبا کو گلے سے لگا لیا۔

”صبا! شمن چلی گئی ہمیں چھوڑ کر۔“ وہ ٹپ کر اس کے بازوؤں میں سے نکلی اور بھاگتی ہوئی وہیں پچھل طرف سے کھانے والا دروازہ کھول کر گھر کے اندر آگئی۔ ظفر بھی اس کے پیچھے اندر آگیا۔

وہاں بہت سے لوگ تھے، لاؤنج لوگوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا ظفر، ماما کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہے، مگر وہ اس سے سنبھالی نہیں جا رہی تھیں۔ ان کی چیخیں گھر کے در و دیوار کو ہل رہی تھیں۔ اور لاؤنج کے بچوں بیچ وہ لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند کیے وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ، ملکی سی آہٹ سے

سوتے سوتے اٹھ جلیا کرتی تھی اور آج اتنے شور میں وہ اتنے سکون سے سو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئی تھیں۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ شمن بھی اس روز اس ہاؤس اور ممانی کے ساتھ اسی پلین میں ہوتی۔“

وہ مرجاتی پھر یہ سب نہ ہوتا جو آج ہوا۔ وہ آج اس شخص کی دلہن بنی بیٹھی ہے جسے میں نے اپنی زندگی سے بھی پرہ کر چاہا ہے۔ ”اس کے منہ سے سچ نہیں نکل سکی تھی۔“

وہاں جتنے لوگ رو رہے تھے، بہن کر رہے تھے، ان کی وہ سب آوازیں اس روتی ہوئی آواز کے آگے دب گئی تھیں۔ اسے اب لاؤنج میں سوائے شمن کے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں وہاں تنہا تھیں۔ اسے اب کہیں پر بھی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی سوائے اپنی اس روتی ہوئی آواز کے۔ وہ شمن کے بالکل پاس آگئی تھی۔ پھر اس نے دیکھا سوتے سوتے ایک دم شمن نے اپنی آنکھیں کھول دی ہیں۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی ہے۔

”تمہیں میرا آنا برا لگا تھا نا!۔ تم سوچتی تھیں کہ شمن یہاں پر کیوں آگئی ہے اس کے آنے سے پہلے ہم سب کتنے خوش رہا کرتے تھے، میں جا رہی ہوں صبا! اب تم لوگ دوبارہ سے خوش رہنے لگو گے۔ میں تو بس اپنی زندگی کے یہ چند آخری سال تم لوگوں کے ساتھ گزارنے آئی تھی۔ تم لوگوں کے درمیان تھوڑا سا رات گزارنا چاہتی تھی میں۔ اتنی سی بات پر تم اتنا دکھی ہوئی تھیں۔“

میں اس محبت سے دستبردار ہو گئی ہوں۔ اب میں کبھی تمہاری بچپن کی محبت پر اپنا حق نہیں جتاؤں گی۔ تمہاری محبت صرف تمہاری ہے۔“

اس نے رونا چاہا مگر اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں نکل سکا۔ وہ جس طرح بول نہیں سکتی تھی، اسی طرح رو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے دیکھا چند لوگ شمن کے پاس آئے، وہ اسے وہاں سے اٹھانے لگے۔ اس نے آگے بڑھ کر ان لوگوں کو روکنا چاہا۔ مگر اس کے

پاؤں زمین کے اندر دھنس چکے تھے، وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتی تھی۔

وہاں موجود ہر فرد کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس کی آنکھیں رونا ہی بھول چکی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جم گئے تھے۔ آنسو بن کر بہنے والا پانی برف بن کر اس کی آنکھوں میں جم گیا تھا۔

”میرے اللہ، کس کی نظر کھا گئی میرے بچوں کی خوشیوں کو۔ میرے دل کو چین نہیں آتا مولا۔ کتنی دعائیں مانگی تھیں میں نے اپنے بچوں کی خوشیوں کے لیے۔ کیا میری کوئی دعا بھی قبول نہیں ہوئی تھی۔“ اماں اپنا کلیجہ پیٹ پیٹ کر روئے چلی جا رہی تھیں۔ ڈیڈی ان کے پاس بیٹھے سر جھکائے آنسو بہا رہے تھے۔

”اماں! آپ کی پیاری شمن کی خوشیوں کو میری نظر لگی ہے۔ ہاں اماں! میری، میں اپنی بہن کی خوشیوں سے جل گئی تھی۔ کم ظرف اور حاسد ہو گئی تھی۔ اسے میری آہ لگی ہے۔ جس رات اس نے اپنی نئی زندگی کا آغاز آپ سب کی دعاؤں کے ساتھ کیا تھا، اس رات میں سارا وقت اپنی بہن کو یہ دعائیں دیتی رہی تھی۔ اللہ سے شکوے کرتی رہی تھی۔ میرے آنسو اور میری آہیں کھا گئیں اس کی خوشیوں کو۔ شاید اس رات میرے لیے در قبولیت کھلا ہوا تھا اور میں نے قبولیت کی گھڑی میں اپنی بہن کے لیے موت مانگی تھی۔ میرا دل چاہا تھا میں اسے اس کی سچ سے اٹھا کر کہیں غائب کر دوں اور خود اس کی جگہ وہاں بیٹھ جاؤں۔ آپ لوگوں کی دعاؤں میں وہ اثر نہیں تھا جو میری بد دعاؤں میں تھا۔ دیکھیں وہ واقعی غائب ہو گئی ہے۔ اب مجھے کبھی بھی یہ نہیں کہنا پڑے گا کہ شمن تم یہاں پر کیوں آگئی ہو۔ اس رات میری سب بد دعائیں عرش پر اٹھالی گئی تھیں، دیکھیں ان کی قبولیت میں دو سال کا عرصہ بھی نہیں لگا۔ پندرہ دن باقی ہیں نا ابھی اس کی شادی کی دو سہری سالگرہ ہیں۔ کتنے تھوڑے سے دن کی خوشی ملی تھی اسے۔ میں اپنے ہر عمل اور ہر بات کا جواز ڈھونڈ کر لے آؤں۔ مگر اس بات کا کیا جواز ڈھونڈوں؟“

اس کی آنکھوں سے ایک آنسو نہیں گر رہا۔

سوئم والے دن قبرستان سے فاتحہ پڑھ کر آنے کے بعد ار تفضی نے اپنی تین دنوں کی خاموشی توڑ دی تھی۔ وہ اماں کی گود میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح ہلک ہلک کر رونے لگا۔

”وہ کہتی تھی میں زندگی کے ہر دکھ اور ہر سکھ میں تمہارا ساتھ نبھاؤں گی۔ ساری دنیا تمہارا ساتھ چھوڑ دے میں نہیں چھوڑوں گی۔ آج ساری دنیا میرے ساتھ ہے اور وہ ہمیشہ ساتھ نبھانے کا وعدہ کرنے والی نہیں ہے۔ کتنی جھوٹی تھی شمن، کتنے جھوٹے وعدے کیے تھے اس نے مجھ سے۔“ اماں اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے خود بھی رو رہی تھیں۔

”میرے بیٹے کی قسمت بھی میری جیسی ہے۔ میں بھی بن ماں کے پلا تھانا اماں! دیکھیں وہ بھی بن ماں کے پلے گا۔ اس نے کہا تھا ہم معاذ کو پہلے دن اسکول چھوڑنے ایک ساتھ جائیں گے۔ اب جب وہ پہلے دن اسکول جائے گا تو اس کا وہ سراہا تھا کون پکڑے گا؟“

”بن ماں کا بچہ!“ معاذ کے لیے یہ لفظ سننا کتنا ازیت ناک تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہوا، وہ ار تفضی سے کہنا چاہتی تھی۔

”نمت بولو معاذ کے لیے یہ لفظ۔“ اسے اچانک ہی معاذ کا خیال آیا تھا۔ اسے وہ تین دنوں سے بھولی بیٹھی تھی۔ ان تین دنوں میں کس نے اس کا خیال رکھا۔ کون اس کی دیکھ بھال کرتا رہا، اسے بالکل نہیں پتا تھا۔ وہ بابا کی گود میں بیٹھا بڑے مزے سے ان کے گانز سے کھیل رہا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ اس کا کتنا بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ تقدیر نے اس معصوم سے وہ چیز چھین لی جس کی اسے سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

ار تفضی کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ کچھ تین راتوں سے نہیں سویا۔ وہ آج پہلی مرتبہ ار تفضی غصہ کو سو فیصد شمن کے حوالے سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی بہن کا محبوب ہے اس کا شوہر ہے۔ اس کے

غم کی جو یہ سفاک اور ہولناک آندھی چلی تھی اور جو اس گھر کے سب سکھ اور ساری خوشیاں اڑا لے گئی تھی۔ ان میں کسی کو کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

ار تفضی نے تو کمرے سے ہی نہیں نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ بابا اور ڈیڈی تعزیت کے لیے آنے والوں سے مل رہے تھے۔ ظفر، ماما کے ساتھ ہاسپٹل میں تھا۔ اس کی کزنز نے دو تین بار اسے مخاطب کرنے اور وہاں سے اٹھانے کی کوشش کی، مگر وہ جیسے انہیں سن ہی نہیں رہی تھی۔ ماما شام کے وقت ہاسپٹل سے واپس آئی تھیں۔ ظفر انہیں سہارا دے کر اندر لایا تھا۔ صرف ایک دن میں وہ بہت بوڑھی اور بہت کمزور ہو گئی تھی۔

ڈیڈی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھایا تھا۔

”سب مجھ سے کہہ رہے ہیں صبر کرو، مگر میں کیسے صبر کروں شفیق! میری کم عمر اور معصوم بیٹی منوں مٹی تلے جاسوئی ہے۔ میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں۔ وہ میرے وجود کا حصہ تھی۔ کسی کے جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر پھینک دو اور اس سے کہو کہ اسے بھول جائے، صبر کر لے۔ اولاد کیا بھول جانے والی چیز ہوتی ہے کہ کچھ عرصہ بعد صبر آجائے۔“ وہ ڈیڈی کے کندھے پر سر رکھ کر سسک رہی تھیں۔

اسے ایسا لگا جیسے شمن کے ساتھ ساتھ ماما اور ڈیڈی بھی مر گئے ہیں۔

اس کے ساکت وجود میں یک دم حرکت پیدا ہوئی تھی۔ وہ اٹھی اور بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی۔ وضو کر کے اس نے جائے نماز چھائی۔

جب میری بد دعاؤں میں اتنا اثر ہے تو دعاؤں میں کیوں نہیں؟

”شمن کو واپس بھیج دے میرے اللہ، اس کی جگہ مجھے بلا لے۔ موت کے فرشتے کو اس گھر سے ایک زندگی چاہیے تھی نا۔ تو میری زندگی شمن کو دے دے۔ اور اس کی موت مجھے۔“ دعا مانگتے مانگتے اسے احساس ہوا کہ اس کے لفظ بالکل بے جان سے ہیں۔

بیٹے کا باپ ہے۔ ار تفضی سے اس کا ہر رشتہ صرف اور صرف دشمن کے حوالے سے ہے۔ اگر دشمن کو بیچ میں سے ہٹا دو تو اس کا اس شخص سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ آج اسے دیکھ کر نہ کھو دینے کا دکھ ہوا تھا اور نہ حاصل کر لینے کی جستجو۔ وہ اسے یاد کر کے اس قدر سوگوار تھا۔ وہ اس شخص کے دکھ کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کر سکتی تھی۔ اسے پتا تھا یہ شخص اس کی بہن سے کتنی بے تحاشا محبت کرتا تھا۔

وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آگئی، اس نے کمرے کے درو دیوار کی طرف دیکھا۔ اس بیڈ کی طرف دیکھا جس پر بے شمار راتیں ان دونوں نے ساتھ سو کر گزاری تھیں۔ وہ بیڈ سوگوار تھا۔ وہ درو دیوار سوگوار تھے۔ حالانکہ وہ تو اس کی شادی سے پہلے کی بات تھی۔ دو سال پہلے کی بات تھی جب وہ اس کمرے میں رہا کرتی، پھر یہ کمرہ آج اچانک اس کی جدائی میں کیوں غمگین ہو گیا تھا۔ لیکن وہ کمرہ اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ پچھلے دو سالوں سے اس کی کمی محسوس کر رہا ہے۔ کمرے کی مالکن کو یہ بات آج پتا چلی تھی۔

”مجھے میرے کمرے میں تو سکون سے رہنے دو۔ اس گھر میں آتے ہی تم نے مجھ سے میری ہر چیز چھین لی۔“ اس کے کمرے نے اسے اسی کی کمی ایک بات یاد دلائی۔ وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ وہ ٹیرس پر آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا تھا۔ بات بات پر رو پڑنے والی صبا شفیق یونا بھول گئی تھی۔ جو برف اس کی آنکھوں میں جمی تھی اسے اب کبھی نہیں پگھلنا تھا۔ وہ جانتی تھی موسموں کی کوئی سختی اور کوئی تپش اب اس برف کو پگھلا نہیں سکتی تھی۔ اس کے اندر ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ سامنے سڑک پر بہت سے لوگ آتے جاتے نظر آرہے تھے مگر وہ کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔ بس یہ سوچ رہی تھی۔

”کیا زندگی نے کبھی ان لوگوں کو آزمایا نہیں۔ مجھے تو زندگی نے بڑی بے رحمی سے آزمایا ہے۔ مجھے میرے پیروں پر کھڑے رہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔“

ریشماں اسے ناشتے کے لیے بلانے آئی تھی۔ وہ ڈائننگ روم میں آگئی۔ وہاں ماما بابا ڈیڈی ار تفضی اور ظفر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی ناشتہ شروع نہیں کیا تھا۔ وہ تینوں خاموشی سے ناشتے کی میز کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وہاں بیٹھا ہر فرد زندہ لاش نظر آ رہا تھا۔ وہ سب لوگ ایک دوسرے کی وجہ سے وہاں بیٹھے تھے۔ اور ایک دوسرے ہی کے لیے ناشتہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”ماما! آپ کچھ بھی نہیں کھا رہیں۔ یہ آلیٹ تو کھالیں۔“ ظفر ان کے برابر والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ان کی پلیٹ میں وہ آلیٹ ڈالنے لگا تو انہوں نے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔

”میں لے لوں گی ظفر! جب سانس لینی نہیں چھوڑی تو کھانا کھانا بھی نہیں چھوڑوں گی۔ تم میری فکر مت کرو۔“ ان کے لفظوں میں بہت درد تھا۔

معاذ جاگ گیا تھا، ریشماں اسے ماما کے کمرے سے اٹھا کر وہیں لے آئی تھی۔ ڈیڈی نے اسے اپنی گود میں بٹھالیا تھا۔ مگر وہ دو تین سیکنڈ میں ہی ان کی گود سے نیچے اتر کر کارپٹ پر بیٹھ کر کھیلنے لگا تھا۔

”رات“ مومن میرے پاس آئی تھی۔ ”ماما کسی سے بھی مخاطب ہوئے بغیر آہستہ سے بولیں۔“

”مجھ سے کہہ رہی تھی، ماما! قبر میں بہت اندھیرا ہے، مجھے اکیلے بہت ڈر لگتا ہے۔ آپ میرے پاس آجائیں۔“

”ار تفضی! تمہیں پتا ہے نا، وہ کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ڈر جاتی تھی۔ کوئی پیچھے سے آکر اسے اچانک آواز دے تو وہ چونک جاتی تھی۔ اور اندھیرے سے کتنا ڈر لگتا تھا۔ کبھی لائٹ چلی جاتی تو اکیلے سونے کے لیے اسے کمرے میں بھی نہیں جانی تھی۔“ بابا بے بسی اور غم کی تصویر بنے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ار تفضی نے اپنا سر اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ چائے کے

کپ پر نظریں جمائے جیسے ان کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔

سب کی توجہ مہا کی طرف تھی اس کی بھی تھی۔ لیکن پھر اچانک اس کی نظر معاذ پر پڑ گئی۔ وہ کاریٹ پر کھلتے ہوئے ان لوگوں سے تھوڑا دور چلا گیا تھا۔ کونے میں رکھی چھوٹی سی ٹیبل کو پکڑ کر وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ کھڑے ہونے کے بعد وہ فخریہ انداز میں اپنے اس کارٹے پر مسکرایا۔ پھر میز پر سے اپنے دونوں ہاتھ اس نے ہٹا دیے اور آگے کی طرف بغیر کسی سہارے کے ایک قدم بڑھایا۔ وہ چیزوں کا سہارا لے کر کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ گھٹنوں، گھٹنوں اور چیزیں پکڑ کر چلنے بھی لگا تھا۔ مگر بغیر کسی سہارے کے یہ اس کا پہلا قدم تھا۔ اور اس پہلے قدم کے بعد وہ اگلے پل فوراً نیچے گر گیا تھا۔

اس کے پہلے قدم پر اسے تھام لینے والی ماں آج یہاں نہیں تھی۔ ورنہ کیا وہ یوں کرتا۔ وہ کیا اسے بھاگتے ہوئے جا کر پکڑ نہ لیتی؟ اسے اپنے قدم کا تو اسے کس قدر انتظار تھا۔ یوں ایک دم گر پڑنے پر چوٹ تو نہیں لگی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی رونے لگا تھا شاید اپنی کوشش کی ناکامی پر۔ مہار سے سب کی توجہ ہٹ گئی تھی۔ وہ ہی سب سے پہلے بھاگ کے اس کے پاس گئی تھیں باقی سب بھی اٹھ کر اس کے پاس چلے گئے تھے۔ صرف صبا اور ارتضیٰ میز پر بیٹھے رہے۔ مگر نظریں ان دونوں کی بھی ادھر ہی تھیں۔ مہار سے گود میں لے کر پیار کرتے ہوئے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اماں، معاذ کے رونے کی آواز سن کر اپنے کمرے سے نکل آئی تھیں۔ سب اس کے گرد جمع ہو گئے، اسے بہلانے لگے پھر ظفر اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی خاطر اسے گھر سے باہر لے گیا۔

”چلو معاذ! باہر چلتے ہیں۔“ باہر چلنے والی بات وہ خوب سمجھا کرتا تھا۔ اسی لیے فوراً اس کی گود میں چڑھ گیا تھا۔

”ہر ماں اپنے بچے کے پیچھے اتنی ہی دیوانی ہوتی ہے۔ اتنی ہی پاگل ہوتی ہے۔ یہ رشتہ ہی ایسا ہے۔“ وہ

بغیر ناشتہ کیے میز پر سے اٹھ گئی۔

”کہاں جائے وہ؟ کس جگہ؟ وہ کون سی جگہ ہوگی جہاں جا کر دل کو سکون ملے گا۔“ وہ گھر کے مختلف حصوں میں چکراتی پھر رہی تھی۔

”ڈھونڈا کرو گی اب تم تمہن کو۔ آوازیں دیا کرو گی اسے۔“ وہ سیڑھیوں پر گر پڑنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔

”تم نے کہا تھا تمہن کہ تم مجھ سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتیں۔ اگر چاہو تو بھی نہیں۔“ اس کے لبوں سے سرگوشی نما آواز نکلی۔

”نہیں ہوں بابا میں تم سے ناراض اب کب تک یہ رونی صورت بنائے رکھوں گی۔“ اس نے اپنے گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔

”تمہن ابھی جب تم مجھ سے ناراض ہوئیں تو اتنی اجنبی لگ رہی تھیں۔ مجھے تمہاری ناراضی سے بہت ڈر لگا۔ ایسا لگ رہا تھا میں تمہیں منا ہی نہیں پاؤں گی۔ اس طرح ناراض مت ہوا کرو تمہن۔“ اس کے دل کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ گھٹنوں پر سر رکھے ”تم اس طرح ناراض مت ہوا کرو تمہن!“ کہے چلی جا رہی تھی۔

”صبا!“ اس کے کانوں نے ڈیڈی کی آواز سنی۔ کتنے دنوں بعد آج ڈیڈی نے اسے آواز دی۔ اس نے گھٹنوں پر سے سر اٹھایا۔ ”یہاں دھوپ میں کیوں آکر بیٹھ گئیں۔ کتنی گرمی ہو رہی ہے۔ یہاں۔“ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ یہاں سب سے چھپ کر اکیلی بیٹھی رو رہی ہے، مگر اس کی آنکھیں تو بالکل خشک تھیں۔ وہ رو نہیں رہی تھی تو کیا ہوا۔ وہ ان کی بیٹی تھی۔ کیا اس کی آنکھوں سے جھانکتا ملاں اور کرب دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ؟“ انہوں نے اسے بڑے پیار سے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

”اس طرح اکیلی کیوں بیٹھ گئیں بیٹا! اندر اپنی ماماں کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ۔“ ان کے لہجے میں اس کے لیے پیار کے ساتھ ساتھ تشویش بھی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ ڈیڈی کے سینے پر سر رکھ کر بہت سا روئے۔ ان

ادھر ادھر کے قصے سناتے رہے تھے اور وہ خود میں ان دونوں سے نگاہیں ملانے کا حوصلہ نہ پا کر سر جھکا کر بیٹھی رہی تھی۔



ظفر وہ پانچ تصویریں ڈویپ کروا کر لے آیا تھا جو اس روز فنکشن شروع ہونے سے پہلے کھینچی گئی تھیں۔ ان میں چار تصویریں معاذ کی تھیں۔ وہ چاروں تصویریں ظفر نے کھینچی تھیں۔ اور پانچویں تصویر وہ تھی جو زندگی کے اس گھر سے رخصت ہونے سے پینتالیس منٹ پہلے کھینچی گئی تھی۔ جس طرح کیسوی آنکھ بہت سے خوب صورت منظروں کو ہمیشہ کے لیے قید کر سکتی ہے، کاش اسی طرح وقت بھی قید کیا جاسکتا۔

وہ تصویر اس سے بھی برہہ کرا چھٹی آئی تھی، جتنی کہ اس سے قرباتش کی گئی تھی۔

ارتضیٰ نے اس تصویر پر صرف ایک نظر ڈالی اور فوراً وہاں سے اٹھ گیا۔ اس نے تصویر اپنے ہاتھ میں بھی نہیں لی تھی۔ وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔ ماما اس تصویر کو چومتے ہوئے رو رہی تھیں۔ پھر ماما کے کہنے پر ظفر نے وہ تصویر اٹلا رنج کروائی تھی اور بہت خوبصورت سے فریم میں جڑوا کر ماما ہی کی خواہش پر اسے لاؤنج میں لگا دیا تھا۔ ماما گھنٹوں بیٹھ کر اس تصویر کو دیکھتی رہتی تھیں۔



رات کے دو بج رہے تھے وہ جاگی ہوئی تھی۔ معاذ کے رونے کی ہلکی سی آواز اس کے کمرے تک پہنچ رہی تھی۔ مگر وہ بے حس سے انداز میں لیٹی چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ معاذ کو گود میں اٹھا کر ماما اس کے کمرے میں آگئی تھیں۔

”شکر ہے صبا! تم جاگی ہو، ذرا دیکھو اسے شاید تمہارے پاس آکر چپ ہو جائے۔ میں کتنی دیر سے اسے بہلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا یہ اتنا رو کیوں رہا ہے۔ پتا نہیں یہ بھوک کی وجہ

سے بوچھے۔

”ڈیڈی! زندگی اتنی بے رحم کیوں ہوتی ہے؟“
”آپ چلیں ڈیڈی میں آ رہی ہوں۔“ اس نے ان سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

ڈیڈی سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گئے تھے۔ وہ مردہ قدموں سے چلتے ہوئے اندر آگئی۔ ماما کے کمرے کے پاس آئی تو دروازہ کھلا ہوا نظر آیا۔

”میلبرہ! ہمیں اپنے بچوں کی خاطر خود کو سنبھالنا ہوگا۔ اگر ہم یوں ہمت ہار گئے تو ہمارے بچوں کا کیا ہوگا۔ تم نے صبا کو دیکھا ہے۔ کیسی مر جھا گئی ہے۔ میری بیٹی۔ ابھی جس طرح وہ تھا اور اس بیٹھی تھی میرے دل کو کچھ ہوا تھا اسے دیکھ کر۔“ ڈیڈی ماما کو سمجھا رہے تھے۔ ”ما“ ان کی نگاہ اس پر پڑی۔

”آجاؤ صبا۔“ انہوں نے اس کی خاطر مسکرانے کی کوشش کی تو وہ اپنی نظروں میں مزید گرنے لگی۔ ماما نے بھی اتنے دنوں بعد اسے توجہ سے دیکھا تھا۔ کچھ کہے بغیر انہوں نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ ماما کے پاس بیڈ پر آگئی۔ ڈیڈی بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا اور ماما کا دل بہلانے کے لیے وہ معاذ کی کسی تازہ ترین شرارت کا ذکر بڑے پر لطف انداز میں کر رہے تھے۔ اس کا ضمیر اسے کچھ دے رہا تھا۔
”ڈیڈی! آپ اور ماما سمجھ رہے ہیں صبا کو شمن کے مرنے کا بہت دکھ ہے۔“ غم کی انتہا پر پہنچ کر اس کی آنکھیں منجمد ہو گئی ہیں۔

”آپ دونوں کو پتا ہی نہیں کہ وہ غم کی وجہ سے نہیں ضمیر کی چیخ کی وجہ سے خاموش ہو گئی ہے۔ اس لیے کہ یہ خواہش اس نے بارہا کی تھی شمن کے کہیں چلے جانے کی خواہش، اس کے غائب ہو جانے کی خواہش، اس کے مرجانے کی دعا میں مانگی تھیں اس نے۔ اور اب جب کہ وہ واقعی مر گئی تو صبا شفیق احساس جرم میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اتنی جس شاید اس میں باقی ہے کہ وہ اپنے گناہوں پر نادم ہو سکے۔ مگر یہ بات وہ آپ دونوں کو بتائے گی نہیں۔ اس میں اتنی اخلاقی جرات نہیں کہ اپنی بد صورت شکل آپ لوگوں کو دکھاسکے۔“ ڈیڈی

اس کے رونے کی شدت میں اچانک ہی کمی آگئی تھی۔ رو تو وہ ابھی بھی رہا تھا۔ مگر اب رونے میں ضد اور غصے کی جگہ شکوے نے لے لی تھی۔
”کہاں چلی گئی تھیں مجھے چھوڑ کر؟“ وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر سسکیاں لے رہا تھا۔

When the Glorious Sun Is Set.
When The Grass With Dew Is Wet

اس کی سسکیوں کی آواز آنا بھی بند ہو گئی تھی۔ ”مما“ بھی رونا بھول کر صبا کی آواز میں کھو گئی تھیں۔ وہ ایک ٹک صبا کو دیکھ رہی تھیں۔ کتنی ملتی بھی اس کی آواز شمن سے۔

”صبا چپ مت ہو۔ یو نہی گنگنائی رہو۔ تمہاری آواز میں مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی ہے۔“ ان کی آنکھیں اس سے اتھا کر رہی تھیں۔ انہوں نے کتنی مرتبہ اسے یہی نظم گنگنائے سنا تھا۔

شمن کے چالیسویں کے بعد ظفر واپس چلا گیا تھا۔ اس کے سپروائزر کا فون آیا تھا۔ اس کا پی ایچ ڈی آخری مراحل میں تھا۔ اتنے دن یہاں رکنے سے اس کا بہت حرج ہو گیا تھا۔

سب نے بڑے جوش اور ہمت سے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔



زندگی کسی کے لیے نہیں رکتی، کسی کے نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جن لوگوں کے ہونے سے لگتا ہے کہ زندگی ان ہی کے دم سے ہے، یہ نہیں ہوں گے تو زندگی ہی نہیں ہوگی۔ جب وہ نہیں ہوتے زندگی تب بھی ہوتی ہے۔ وہ اس طرح چلتی رہتی ہے۔ وہ زندہ رہ کر زندگی سے منہ نہیں پھیر سکتے تھے۔ دل کرب اور درد سے بھرے تھے۔ آنکھیں ملول اور افسردہ تھیں مگر انہیں پھر بھی زندگی کی طرف واپس تو آنا تھا۔

ار تفضی آفس جانے لگا تھا۔ اس نے خود کو پہلے کی طرح مصروف کر لیا تھا کہ شمن کی یاد تو ہر جگہ اس کے

سے رو رہا ہے۔ یا اس کے کہیں درد ہو رہا ہے۔ میں نے فیڈر منہ میں دینے کی کوشش کی مگر اس نے نہیں لیا۔ ”ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں“ روتے ہوئے معاذ کو اور اس کی فیڈر کو انہوں نے اس کی گود میں ڈال دیا۔ اور خود بھی بیڈ پر اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ اتنے دنوں سے معاذ کو ممما ہی سنبھال رہی تھیں۔ آج پتا نہیں اسے کیا ہوا تھا۔ جو وہ یوں چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔

”تم میں کیا ہے صبا! میرا دل خود بخود تمہاری طرف کھینچا ہے۔“ اسے اس لمحے سے وجود میں سے بڑی باتیں سی خوشبو آئی۔ اس نے اسے بھیج کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ جس طرح اس بچے کی ماں کا دل اس کی طرف کھینچتا تھا، اسی طرح اس کا دل اس بچے کی طرف کھینچ لگا تھا۔ وہ اسے سینے سے لگا کر چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ چپ ہو نہیں رہا تھا۔

”اے دودھ پلاؤ شاید بھوک کی وجہ سے ہی رو رہا ہے۔“ ممما کے کہنے پر اس نے فیڈر اٹھا کر اسے دودھ پلانے کی کوشش کی۔ مگر اس نے روتے ہوئے ہاتھ مار کر فیڈر دور پھینک دی۔

”اے ماں کی ہڑک ہو رہی ہے۔ دن میں بچہ کسی کے پاس بھی رہ لے رات میں اسے ماں کی گود ہی چاہیے ہوتی ہے۔ وہ بول نہیں سکتا تو کیا ہوا، ڈھونڈ تو رہا ہو گا۔“ ممما بولتے بولتے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھیں۔ اسے یاد آیا، شمن، معاذ کو گود میں لے کر شلایا کرتی تھی۔

وہ اسے گود میں لے کر کھڑی ہو گئی۔ اسے اپنے کندھے سے لگا کر کمرے میں شلنے لگی، اپنا ایک ہاتھ وہ بڑی آہستگی سے اس کی کمر پر پھیر رہی تھی۔ اور دوسرا اس کے بالوں پر، لیکن شمن اسے شلاتے وقت کچھ گنگنائی بھی تو تھی۔

”کیا ہے؟ صبا کو اچھی طرح یاد تھا وہ کیا گنگنائی تھی۔ اس نے بہت آہستہ اور بڑے کومل اور مدھم انداز میں گنگنائی شروع کر دیا تھا۔

Twinkle Twinkle Little Star
How I Wonder What You Are

اس نے چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھاگ کر اس کی طرف آتا تھا اور وہ اسے نظر انداز نہیں کر پاتی تھی۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے لفظ بولنے شروع کر دیے تھے۔ ماما کو ماما پر صاف بولتا تھا۔ باقی اس کی بولی ایسی تھی جو صرف ماما کی اور اس کی سمجھ میں آتی تھی۔

رات کو ماما اور معاذ اس کے کمرے ہی میں سوئے گئے تھے۔ رات کو وہ ماما سے نہیں شبھلتا تھا۔ جب ضد میں آیا ہوتا تو ماما اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی تھیں۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر شہلاتی، اسے بڑے پار سے بھلاتی۔ کتنی راتیں ماما اور اس نے مل کر معاذ کے لیے جاگی تھیں۔

”نمن چلی گئی، میرا ار ترضی شمارہ گیا، معاذ سے اس کی ماں چھن گئی۔ میں کس کس بات کا غم کروں۔ میرے بچوں سے ان کی خوشیاں چھن گئی ہیں۔ اب جینے کا دل نہیں چاہتا، غصہ بہت جی لیا۔“ بابا اور ڈیڈی کافی دیر تک اماں کا دل بھلانے کے لیے ان کے پاس بیٹھے رہے تھے۔ وہ اپنے دکھ بیٹوں کے ساتھ بانٹ کر پرسکون ہو گئی تھیں۔ بہت دنوں بعد انہوں نے کسی کے ساتھ اتنی طویل گفتگو کی تھی۔ اپنے سارے دکھ درد ہلکے کر کے وہ اتنی پرسکون ہوئیں کہ اس رات کو صبح ہونے پر کسی کے جگانے سے بھی نہیں اٹھیں۔

نمن کا غم اماں نے اپنے دل سے ایسا لگایا تھا کہ اس کے مرنے کے صرف سات مہینے بعد خود بھی ابدی نیند سو گئی تھیں۔



زمین نے رنج کے گرد اپنا ایک اور چکر مکمل کر لیا تھا۔ دن رات کی گردش میں وہ دن ایک مرتبہ پھر پلٹ کر ان لوگوں کی زندگیوں میں آ گیا تھا۔ وہ دن جب ایک ہستی مسکراتی زندگی اس گھر سے رخصت ہو گئی تھی۔ یہ دن ان سب کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ لیکن پھر بھی انہیں اس دن خوشی منانی تھی۔ دل پر جس کے جو بھی گزر رہی تھی وہ لوگ اس کا ایک دوسرے سے اظہار نہیں کر رہے تھے۔ آپس میں ایک

ساتھ تھی۔ ماسٹرز کی کلاسز شروع ہو چکی تھیں، جب نمن اور ار ترضی واپس کراچی آئے۔ ان دنوں اس کے امتحان چل رہے تھے۔ معاذ کی سالگرہ سے چند دن پہلے وہ بریکسٹنل سے فارغ ہوئی تھی۔ وہ اب ماسٹرز کرنے کے لیے دوبارہ یونیورسٹی جوائن کرنا نہیں چاہتی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اسے یہ بات یاد بھی نہیں رہی تھی کہ یونیورسٹی میں اس کی M.S.C کی کلاسز شروع ہونے والی ہیں۔ ڈیڈی نے اسے یہ بات یاد دلانی اس نے ان سے ”ڈیڈی میرا M.S.C کرنے کا موڈ نہیں۔“ کہہ کر انکار کر دیا تو وہ خاموش ہو گئے۔ انہوں نے اس سے مزید اصرار نہیں کیا تھا۔ مگر بابا نے اسے یونیورسٹی جانے پر مجبور کیا تھا۔

”بابا! میرا دل نہیں چاہتا۔ بڑھنے میں اب میرا دل نہیں لگے گا۔“ اس نے سر جھکا کر بے بسی سے کہا تو وہ مشفقانہ انداز میں اسے سمجھانے لگے۔

”مجھے پتا ہے بیٹا! کہ تمہارا دل نہیں چاہ رہا، مگر بعض کام دل کی مرضی کے خلاف کرنے پڑ جاتے ہیں نا، کسی بہت اپنے کے لیے۔ اس کی خوشی کے لیے۔ تم اس طرح دنیا سے کنارہ کر کے الگ تھلگ بیٹھی رہیں تو پتہ اور شفقت کیسے خود کو نارمل کر پائیں گے۔ ہمیں اس گھر میں زندگی واپس لانی ہے۔ زندگی کو پہلے جیسا بنانا ہے، خوشیوں اور امنگوں سے بھرا ہوا۔“

”بابا! اب زندگی کبھی پہلے جیسی نہیں ہو سکے گی۔“ اس نے ان کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی پشت پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے رہے۔ اس نے بابا کی بات مان لی تھی، ان کا مان رکھ لیا تھا۔

وہ ہر روز خود کو زبردستی گھسیٹ کر یونیورسٹی لاتی تھی۔ کلاس کے دوران وہ لیکچر کے بمشکل چند پوائنٹس ہی نوٹ کر پاتی۔ ماما اور ڈیڈی اسے یونیورسٹی جاتا دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔ مگر نہ اس کی مستقل قسم کی خاموشی ان کے لیے تشویش کا باعث بنتی جا رہی تھی۔ وہ یونیورسٹی سے آتی تو معاذ لپک کر اس کے پاس آ جاتا۔ اسے گود میں اٹھانے سے کتراتا

دوسرے سے جھوٹ بولتے وہ سب خود کو خوش ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بابا ویسا ہی کیک آرڈر کر کے آئے تھے جیسا پہلی سالگرہ پر شمن نے کیا تھا۔ ممانے کھانے کا بہترین نظام کیا تھا۔ ڈیڈی نے نوکروں کو ساتھ لگا کر ڈانگنگ رووم کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ غباروں اور چھالروں سے سجایا تھا۔ ان سب نے معاذ کے لیے تحفوں کا زمرہ لگایا تھا۔ ظفر نے بھی عین سالگرہ کے دن تحفہ بھیجا تھا۔ کیک کے کاٹنے وقت بابا نے ار تفضی سے کہا کہ وہ معاذ کا ہاتھ پکڑ کر کیک کٹوائے۔

”مما! آپ اور ڈیڈی کٹوائیجئے۔“ اس نے ممانے کی نظرں چراتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

کیک کا چھوٹا سا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے ماما خود کو روک نہیں پائی تھیں۔ بہت مزے سے کیک کھاتا ہوا معاذ ان کو روٹا دیکھ کر بڑا حیران نظر آ رہا تھا۔ بابا، ڈیڈی اور ار تفضی سب انہیں چپ کرانے میں مصروف تھے معاذ کی توجہ اب غباروں کی طرف تھی۔ صبا نے اسے کارپٹ پر بٹھا کر بہت سارے غبارے اس کے گرد جمع کر دیے۔ وہ اتنے سارے رنگین غباروں کو دیکھ کر بہت خوش تھا۔ وہ بظاہر اس کے ساتھ بیٹھی تھی مگر اس کی توجہ سامنے صوفے پر بیٹھے بابا، ماما، ڈیڈی اور ار تفضی کی طرف تھی۔

”صبا! کسی نے اسے بہت زور سے آواز دی۔ وہ بری طرح جوگی۔“

”کیا ہوا صبا! میں اتنی دیر سے تمہیں آواز دے رہا ہوں۔“ ار تفضی فلور کشن پر ممانے کے سامنے بیٹھا تھا۔ بابا اور ڈیڈی ان کے پاس صوفے پر بیٹھے تھے وہیں بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر ار تفضی نے اسے آواز دی تھی۔ صبا کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔ اس کے آواز دینے پر اس نے اسے دیکھ تو لیا تھا مگر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی بات سن تو رہی ہے مگر سمجھ نہیں رہی۔

”صبا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔؟“ وہ ماما کو

چھوڑ کر فوراً اس کے پاس آیا تھا۔ بابا اور ڈیڈی ہنوز ممانے کی دل جوگی میں لگے تھے۔ وہ بڑے تشویش بھرے انداز میں اس کو دیکھ رہا تھا۔

”میں تمہاری طبیعت کے بارے میں پوچھ رہا ہوں صبا!“ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے اپنا سوال دہرایا۔

”میں ٹھیک ہوں ار تفضی بھائی!“ اس نے معاذ پر نظریں مرکوز رکھتے ہوئے آہستگی سے جواب دیا۔

”جب رونا آئے تو رو لینا چاہیے۔ نہ رونا بہادری نہیں۔ غم اپنے اندر جمع کرتے رہنے سے دل پر بہت بوجھ پڑ جاتا ہے۔ تم ماما اور ڈیڈی کی وجہ سے نہیں روئیں ان کے سامنے نہیں روئیں مگر میرے سامنے تم رو سکتی ہو۔ اگر شمن یاد آ رہی ہے تو رولو صبا! مجھے پتا ہے تم دونوں ایک دوسرے کی بہن سے زیادہ دوست تھیں۔“

”بہت محبت کرتی تھی وہ تم سے۔ تم اس محبت کو مس کرتی ہو صبا!“ شمن کے بارے میں اس طرح سے اس ایک سال میں ار تفضی نے گھر کے کسی فرد سے بات نہیں کی تھی۔ مگر اس وقت صبا کے چہرے پر موجود تاثرات نے اسے شمن کے بارے میں اتنا زیادہ بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیسی لگی تھی وہ اس پل ار تفضی کو۔ جیسے اس کی زندگی سے ہر امید ہر آس اور ہر خوشی کو باہر نکال دیا گیا ہو۔ یوں جیسے اس کے پاس زندگی میں کچھ بچا ہی نہ ہو۔ وہ اسے کیسے بتانی کہ وہ کیوں نہیں روتی۔ وہ کیسے کہتی کہ اس سے رویا نہیں جاتا۔ وہ رونا چاہتی ہے مگر اس کا ضمیر اسے رونے نہیں دیتا۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

”مجھ سے اس کے بارے میں بات نہیں کی جاتی۔“ اسے کچھ تو کہنا تھا۔

”اس حادثے کو قبول کر لو صبا! ہم سب کو اس کے بغیر رہنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔ مان لینی ہوگی یہ بات کہ وہ اب کبھی یہاں آئے گی بھی نہیں۔“ وہ ہمیشہ ہی کی

طرح کے پیار بھرے انداز میں اسے سمجھانے لگا۔



روز کی طرح رات کو ماما اور معاذ اس کے کمرے میں تھے۔ وہ روزانہ کی بہ نسبت آج جلدی سو گیا تھا۔ ماما نے سوتے ہوئے معاذ پر ایک شفقت بھری نگاہ ڈالی، پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”تمہیں نیند تو نہیں آرہی صبا؟“ اس نے ماما کی طرف نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں دیکھا۔ ان کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس سے کوئی بات کرنا چاہتی ہیں۔ اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ معاذ ان دونوں کے بیچ میں لیٹا ہوا تھا۔

”صبا! ماں اور بیٹی کا رشتہ دوستی کا رشتہ بھی ہوتا ہے۔ ماں بیٹی سے ہر بات دوستوں کی طرح کرتی ہے اور بیٹی بھی دوستوں کی طرح ماں سے اپنی ہر کیفیت شیئر کرتی ہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت متانت اور بردباری سے بولیں۔ اسی لیے بے ساختگی میں اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”کیا بات ہے ماما؟“

”صبا! میں چاہتی ہوں آج ہم دوستوں کی طرح باتیں کریں۔ میں تم سے تمہاری زندگی کے سب سے اہم فیصلے کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے دھیمے لہجے میں بولیں۔

”ہم لوگ تمہاری شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ بہت سے رشتے ہیں ہمارے سامنے مگر تمہاری زندگی کے فیصلے کا اختیار تمہارے ہی پاس ہونا چاہیے۔ اگر تم کسی کو اس حوالے سے پسند کرتی ہو۔ تو

تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔“ وہ جواب میں چند لمحوں تک کچھ بول نہیں سکی تھی۔

”کیسی کوئی بات نہیں ہے ماما! میری زندگی میں ایسا کوئی بھی نہیں۔“ وہ جھوٹ بول بھی نہیں رہی تھی۔ جو کچھ اس کی زندگی میں تھا تو وہ اس کا ماضی تھا۔ اب نہ اس کی زندگی میں نہ اس کے دل میں نہ اس کی

سوچوں میں کہیں پر بھی کوئی نہیں تھا۔

”پھر کیا ہم لوگ اپنی مرضی سے تمہارے لیے کسی کو چن سکتے ہیں؟ کیا تم ہمیں یہ حق دے رہی ہو؟“ ان کی آنکھوں میں بڑی امید بھری چمک ابھری تھی۔ ایسے جیسے اس کے جواب نے انہیں بڑی خوشی دے دی ہو۔ اس نے سر اثبات میں ہلادیا تھا۔

”اگر ہم تمہاری شادی ار ترضی کے ساتھ کر دیں تو۔۔۔؟“ اسے جیسے ایک دم کرنٹ لگا۔ وہ پوری کی پوری ہل گئی۔

”تم مجھے خود غرض مت سمجھو صبا! یہ بات میں اس لیے نہیں کہہ رہی کہ تم ہمیشہ معاذ کی ماں کا رول ادا کرتی رہو۔ اس کی پرورش کرو اس میں کوئی شک نہیں کہ تم سے بہتر معاذ کا خیال کوئی نہیں رکھ سکتا۔ کل کو اگر ار ترضی نے دو سری شادی کر لی تو وہ دو سری لڑکی چاہے کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو تمہاری طرح اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکے گی۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ بالکل درست ہیں۔ لیکن میرے تم سے ار ترضی سے شادی کے بارے میں کہنے کی وجہ یہ ہرگز نہیں۔ سچ تو یہ ہے صبا! کہ ار ترضی سے بہتر تمہارے لیے کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ تمہیں سمجھتا ہے تمہارے مزاج کو سمجھتا ہے۔ اس نے میری ایک بیٹی کو اتنا سکھی رکھا ہے کہ میں اپنی دو سری بیٹی بہت خوشی سے اسے دے سکتی ہوں۔ یہ صرف میری خواہش نہیں ہے۔ تمہارے ڈیڈی اور غصنفر بھائی کی بھی خواہش ہے۔ تم ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رہو گی۔ معاذ کو ماں کا پیار مل جائے گا ہمیشہ کے لیے۔ ار ترضی کا گھر پھر سے آباد ہو جائے گا۔“

وہ بہت سنجیدگی سے اسے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں ماما!“ کتنی دیر بعد وہ خود کو بولنے پر آمادہ کر پائی اس سے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔

”صبا! ار ترضی بہت اچھا ہے۔ وہ میری نظروں کے

ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔ میرا یقین کرو تمہیں! اس نے چلاتے ہوئے اس سے یہ بات کہنی چاہی مگر وہ اس کی بات سے بغیر وہاں سے غائب ہو گئی تھی اس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ ماما دوسری طرف کروشے شاید سوچکی تھیں۔ معاذ بھی گہری نیند سو رہا تھا۔



”کیا ہو گیا ہے بابا آپ کو! صبا کے بارے میں ایسی کوئی بات میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی۔“ ار تفتی نے بابا کے منہ سے یہ بات سنتے ہی بغیر ایک لمحہ کی دیر لگائے فوراً انکار کر دیا۔

”سوچی نہیں تھی تو اب سوچی جاسکتی ہے۔ تم اسے بچی سمجھتے ہو۔ مگر اب وہ بچی ہے نہیں۔“ بابا اس کے دو ٹوک انکار پر کچھ جھنجھلا کر بولے تھے۔

”کب تک شہزادگی گزارو گے۔ کبھی نہ کبھی تو تمہیں اپنے لیے کوئی فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ تو وہ لڑکی صبا کیوں نہیں ہو سکتی۔ ہمارے گھر کی روایتیں واپس آجائیں گی۔ معاذ کو ماں کا پیار مل جائے گا۔“ اس نے ان کی ساری بات بہت خاموشی سے سنی۔ جیسے ہی وہ چپ ہوئے وہ بولنا شروع ہو گیا۔

”سب سے پہلے تو بابا! آپ اپنا یہ خوف دور کر لیں کہ میں معاذ کے لیے کوئی سوئیلا ماں لے کر آنے والا ہوں بالکل بے فکر رہیں آپ۔ دوسری بات صبا کے بارے میں۔“ وہ ایک پل کو خاموش ہوا پھر اسی مستحکم اور فیصلہ کن انداز میں دوبارہ بولنے لگا۔

”اگر آپ کے کہنے پر اس بات کو ذہن سے نکال بھی دوں کہ میں نے صبا کے لیے اس انداز سے کبھی نہیں سوچا اور یہ کہ وہ اب اتنی چھوٹی نہیں ہے جتنا میں اسے سمجھتا ہوں۔ تب بھی بابا! میں یہ فیصلہ کبھی نہیں کروں گا۔ میں اتنا خود غرض کبھی نہیں ہو سکتا کہ اس سے محض اس لیے شادی کر لوں کہ میرے بیٹے کو ماں کا سا پیار مل جائے۔ اس کا حق ہے زندگی کی خوشیوں پر۔ کوئی ایسا شخص جو اسے سچا پیار دے۔“

سامنے تل کر بڑا ہوا ہے۔ میں نے اس میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔ تمہاری تو خود اس کے ساتھ کتنی زیادہ ایڈوانسمنٹنگ ہے۔ میرا دل کہتا ہے تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گی۔“ ان کا لہجہ التجازیہ ہو گیا تھا۔

”ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا ماما! میں نے ار تفتی بھائی کے بارے میں کبھی اس طرح نہیں سوچا۔ دوستی اور انڈر اسٹینڈنگ کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان کے ساتھ شادی کر لوں میں نے انہیں کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔ میں نے ہمیشہ انہیں تمن کے حوالے سے دیکھا ہے۔ اور میں کسی اور حوالے سے انہیں رکھنا چاہتی بھی نہیں ہوں۔“ اس کا لہجہ بہت بے لچک اور سخت تھا۔ وہ اس موضوع پر مزید ایک لفظ بھی نہیں سنا چاہتی تھی۔

”بالی جن پر یوزلز کا آپ ابھی ذکر کر رہی تھیں۔ ان میں سے آپ لوگ جسے چاہیں میرے لیے منتخب کر لیں۔ میں آپ لوگوں کے کسی فیصلے پر اعتراض نہیں کروں گی۔ لیکن پلیز ماما! یہ بات مجھ سے دوبارہ مت کیجئے گا۔ مجھے ایسی بات سوچتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔“ ماما اس کا دو ٹوک انداز دیکھ کر خاموش ہو گئی تھیں۔

وہ آنکھیں بند کر کے سونے لیٹ گئی۔ آنکھیں بند کرتے ہی وہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

”کیوں منع کر دیا تم نے ماما کو؟ انہوں نے وہی بات تو کی تھی جو تمہاری بھی خواہش تھی اور جس کے پورا ہونے کے لیے ہی تم نے میرے مرنے کی دعا مانگی تھی۔ مت انکار کرو ماما کو یہ تو تمہاری بچپن کی خواہش ہے۔ محبت نہ مرنی ہے نہ ختم ہوتی ہے وہ اب بھی ضرور تمہارے دل میں کسی نہ کسی جگہ موجود ہوگی۔ آگے بڑھو اور پالو اپنی محبت تمہیں تمہاری محبت مل جائے اسی لیے تو میں یہاں سے چلی گئی تھی۔“ وہ طنزیہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اسے نشتر چھو رہی تھی۔ جو کلام اس نے زندگی میں کبھی اس کے ساتھ نہیں کیا تھا اب بڑی سفاکی سے کر رہی تھی۔ وہ سسک اٹھی۔

”نہیں تمن! تم بالکل غلط سوچتی ہو۔ میں نے

تک صبا کی بات تھی اس کے لیے تین چار روز
آئے ہوئے تھے۔ جب اس نے فیصلہ ممان اور ڈیڈی پر
چھوڑ دیا تو انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ ان پر غور کرنا
شروع کر دیا۔ ممان خاندان میں شادی کرنے کے حق
میں تھیں۔

”خاندان کے لوگوں کے بارے میں سب پتا ہوتا
ہے، کسی چھان بین کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایک
دوسرے کی اچھائی، برائی سب پہلے سے معلوم ہوتی
ہے۔“ ممان کی اس بات سے بابا نے بھی اتفاق کیا تھا۔
خاندان میں سے آئے دور رشتوں میں سے انہیں سفیر
فیروز کا رشتہ زیادہ پسند تھا۔

سفیر کراچی سے B.E کرنے کے بعد کینیڈا
MS کرنے کے لیے چلا گیا تھا۔ اسے وہیں پر بہت
اچھی جاب مل گئی تھی۔ اس نے تجربہ کے طور پر وہاں
جاب کر لی تھی۔ مستقبل میں اس کا پاکستان واپس
آنے اور اپنی ذاتی انجینئرنگ فرم اسٹیبلس کرنے کا
ارادہ تھا۔ ممان اور ڈیڈی کے پاس اس رشتے کو دوسرے
رشتوں پر ترجیح دینے کی کئی وجوہات تھیں۔ سب سے
بڑی اور اہم وجہ فیروز خالد کے گھر کا ماحول تھا۔ وہ اور ان
کی بیوی دونوں بہت پڑھے لکھے اور وضع دار قسم کے
لوگ تھے۔

ممان صبا کو شادی کر کے اتنی دور کینیڈا بھیجنے کا تصور
بھی نہیں کر سکتی تھیں مگر یہ سن کر کہ سفیر ایک آدھ
سال میں کراچی واپس آنے کا ارادہ رکھتا ہے اس
رشتے کی طرف سے ہر طرح مطمئن ہو گئی تھیں۔



اس کی اور ظفر کی شادی کی تاریخیں آگے پیچھے
رکھی گئی تھیں۔ ظفر کی شادی اس کی شادی سے ایک
ہفتہ پہلے تھی۔ ایسا ظفر کی خواہش پر کیا گیا تھا۔ وہ چاہتا
تھا کہ صبا اس کی شادی کو بھرپور طریقے سے انجوائے
کر سکے، ورنہ پہلے ان لوگوں کا دونوں کی ساتھ شادی
کرنے کا پروگرام تھا۔ ظفر شادی سے ایک مہینہ پہلے
کراچی آ گیا تھا۔ اپنی شادی سے زیادہ وہ صبا کی شادی کی

آپ کو پتا ہے ناں صبا مجھے کتنی عزیز ہے۔ میں کسی
دوسرے کو اس پر زیادتی کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ خود
کیسے اس کے ساتھ کوئی زیادتی کر سکتا ہوں۔ میں چاہتا
ہوں اسے زندگی میں سچی محبت ملے۔ اسے زندگی میں
سب کچھ ملے۔ ”بابا بے بسی اور مایوسی سے اسے دیکھ
رہے تھے۔ وہ اسے قائل نہیں کر پائیں گے“ انہیں
اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا۔

”پہلی آپ ہمارے گھر کی خوشیوں کی بات کر رہے
تھے، بابا! ہمارے گھر کی خوشیاں صبا اور ظفر کی شادیاں
کر کے بھی تو لوٹ سکتی ہیں۔ ظفر امریکہ میں بہت
اچھی طرح سیٹ ہے اس کی یونیورسٹی میں جاب بہت
اچھی چل رہی ہے۔ اس سے اس بارے میں بات
کر کے اس کی شادی کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔
صبا کا ایم ایس سی مکمل ہو گیا ہے۔ اس میں کس بات کی
کمی ہے جو اس کے لیے کوئی اچھا رشتہ نہ مل سکے۔ ان
دونوں کی شادی کر کے ہمارے گھر کی رونقیں لوٹ
آئیں گی۔“ وہ ان کی مایوسی محسوس کر کے اپنا ہاتھ ان
کے ہاتھ پر رکھ کر انہیں اپنا موقف سمجھانے کی
کوشش کر رہا تھا۔



ان دونوں کے اتنی سختی سے اس بات کو رد کر دینے
کے بعد دوبارہ اس ذکر کی کوئی گنجائش نہیں بچی تھی۔
ہاں صبا اور ظفر کی شادی کے سلسلے میں اب سب نے
بڑی سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ ظفر کو
University of Dallas میں جاب آفر ہوئی
تو اس نے ممان اور ڈیڈی کی اجازت سے اس آفر کو قبول
کر لیا۔

ممان نے اس سے فون پر اس بارے میں بات کی تو
اس نے اپنی شادی کا فیصلہ کلی طور پر ممان چھوڑ دیا۔ ممان
کی کلج کی دوست تھیں رضوانہ آنٹی، ان کی بیٹی
عاصمہ، ممان کو بہت پسند تھی۔ ممان کی پسند کو گھر کے باقی
افراد نے بھی پسند کیا تھا۔ یوں ایک خوبصورت سی شام
عاصمہ کو انگوٹھی پہنا کر یہ رشتہ پکا کر دیا گیا تھا۔ جہاں

تیار یوں میں مصروف تھا۔ ار ترضی تو پہلے ہی اس کی شادی کی تیاریوں میں بہت رجوش طریقے سے حصہ لے رہا تھا۔ شادی کی تقریباً تمام شاپنگ ممانے ار ترضی کے ساتھ کی تھی۔ سفیر بھی شادی سے آٹھ دن پہلے کراچی آگیا تھا۔ ظفر کے ویسے کے اگلے دن اسے باپوں بٹھایا گیا تھا۔

اس رات ار ترضی اس کے کمرے میں آیا۔ ظفر اور عاصم پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔

”یہ تمہاری شادی کا تحفہ۔“ وہ ڈیادیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی کہ اس میں جیوری ہے۔ ”ایک بار ہم یونہی باتیں کر رہے تھے تو ثمن نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہیں شادی پر تحفے میں ڈائمنڈ کاسیٹ دینا چاہتی ہے اور ساتھ ہی تمہیں اور تمہارے شوہر کو ہنی مون کے لیے ہوائی جہاز کا ریٹرن ٹکٹ بھی۔ اب دوسرے والے تحفے کی تو کوئی ضرورت ہے نہیں۔ میرا خیال ہے تمہارا ہنی مون نیا گرافال کی خوبصورتیوں کو سراہتے ہوئے گزرنا ہے۔“ وہ بڑے ہلکے پھلکے انداز میں اسے ثمن کی اس کے بارے میں کہی گئی ایک بات بتا رہا تھا۔

”جلدی سے کھول کر دیکھو صبا! پتا تو چلے ار ترضی بھائی کی چوائس کیسی ہے۔“ عاصم سیٹ دیکھنے کے لیے بڑی متحس نظر آ رہی تھی۔ وہ بظاہر عاصم کے ساتھ سیٹ دیکھنے لگی تھی لیکن اندر ہی اندر ار ترضی کی باتوں نے اسے بہت ڈسٹرب کیا تھا۔ اس وقت جب کہ وہ کوئی تکلیف دہ بات سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اسے یہ بتا رہا تھا کہ ثمن اس کے لیے کیا کیا سوچا کرتی تھی۔ وہ اس کے لیے کیا کیا خواب دیکھا کرتی تھی۔ اس کے لیے صبا شفیق کے لیے جو اس سے۔۔۔ اس سے آگے سوچنے کی اس کی ہمت نہیں تھی۔

”یہ تمہاری چچی شادی کے بعد بھی اپنے سارے مسئلے لے کر تمہارے پاس آیا کرے گی۔ سفیر تو دیکھنا چند مہینوں میں ہی تم سے چڑنے لگے گا۔“ ظفر بہت عرصے بعد اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کے موڈ میں

تھا۔

”صبا اب میرے ساتھ اپنی کوئی بات شیئر نہیں کرتی۔ بہت بڑی ہو گئی ہے صبا۔ اس نے مجھ سے اپنی فیلنگز چھپانی سیکھ لی ہیں۔“ ار ترضی نے ظفر سے شکوہ کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

”یہ اطلاع میرے لیے تو بڑی خوش آمد ہے۔ یعنی میں یہ توقع رکھ سکتا ہوں کہ اب اگر کبھی میں اور تم کسی مقابلے میں آمنے سامنے آئے تو یہ میرے جعفر اپنے سگے بھائی کو فیور کرے گی۔“ ظفر آج واقعی بالکل پرانے موڈ میں تھا۔ شاید وہ اسے ہسانا چاہتا تھا۔ جو وقت گزر چکا تھا اسے کچھ دیر کے لیے واپس لانا چاہتا تھا۔

کافی دیر تک وہ تینوں اس کے کمرے میں بیٹھے رہے۔

وہ اس کی چھیڑ چھاڑ کے جواب میں بجائے لڑنے کے مسکرا رہی تھی۔ وہ بھائی کی خواہش پوری کرنا چاہتی تھی مگر اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا اور بحث کرنے والی صبا کو وہ کہاں سے ڈھونڈ کر لاتی۔ وہ صبا تو عرصہ ہوا کہیں کھو گئی تھی۔



نکاح کے وقت اس کے پاس بہت سے لوگ تھے۔ اس کے بالکل قریب ممانیٹھی تھیں۔ وہاں ظفر بھی تھا۔ بابا بھی تھے۔ ان سب کے باوجود اس نے اپنے چاروں طرف ایک وجود کو تلاشا تھا۔

”ثمن! تم کہاں ہو۔ آؤ دیکھو تمہاری صبا آج دلہن بنی ہے۔ آج اس کی شادی ہے۔ اب تو یقین کر لو کہ صبا تم سے کچھ بھی چھیننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تم سے حسد نہیں کرتی تھی وہ تمہاری خوشیوں سے نہیں جلتی تھی دیکھ لو اس نے تمہاری کسی چیز پر اپنا حق نہیں

جتایا۔ وہ اس گھر سے رخصت ہو رہی ہے سب کچھ چھوڑ کر تمہاری کسی بھی چیز پر نگاہ ڈالے بغیر۔ یقین آگیا ناں تمہیں کہ صبا نے کبھی تمہاری جگہ نہیں لی

چاہی تھی۔ تمہاری جگہ کل بھی تمہاری تھی اور آج بھی تمہاری ہے۔“ اس کے روئیں روئیں نے شمن کو بے آواز پکارا تھا۔

اسے رخصت کرتے وقت ممالے گلے لگا کر کتنی دیر تک روتی رہی تھیں۔ ڈنڈی کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ ”صبا! تم بہت یاد آؤ گی۔“ ار تفضی کے لہجے میں بھی اداسیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اپنے سرال میں ہلکا قدم رکھتے ہوئے اس نے خود سے ایک عہد لیا۔ یہ کہ وہ اپنے شوہر کی ہمیشہ وفادار رہے گی۔ یہ کہ وہ ایک بہت اچھی بیوی بنے گی۔ سرال میں اس کا بڑے شاندار طریقے سے استقبال کیا گیا تھا۔ وہ واقعی اپنے ساس سر کی لاڈلی بہو لگ رہی تھی۔ علینا اور طلحہ بھی خاصے خوش نظر آ رہے تھے۔

اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے ذہن میں اس وقت سوائے اپنے شوہر کے کسی کا خیال نہیں تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا لیکن وہ محسوس کر سکتی تھی کہ وہ ایک ایک قدم اٹھاتا اسی کی طرف آ رہا ہے۔ وہ بیڈ کے پاس آ کر رک گیا۔ وہ اس سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا اور بہت گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کر رہی تھی۔ چند سیکنڈ وہ اسی طرح کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر اس نے بغیر کچھ کہے ایک نیلے رنگ کا مخملیں جیولری کیس اس کے پاس بیڈ پر رکھ دیا۔ وہ ابھی اس کی اس حرکت پر ہی حیران ہو رہی تھی کہ وہ اس کے پاس سے ہٹ گیا۔

اس نے بے ساختہ اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر پہلی مرتبہ اس کی طرف دیکھا۔ اس کی صبا کی طرف پشت تھی۔ اس نے ڈرائنگ ٹیبل پر سے سگریٹ کا پکٹ اور لائٹر اٹھایا اور پھر اس کی طرف دیکھے بنا سلائیڈنگ ڈور کھول کر باہر بالکونی میں چلا گیا۔ بالکونی میں جانے کے بعد اس نے سلائیڈنگ ڈور واپس بند نہیں کیا تھا۔ بالکونی میں مکمل اندھیرا تھا مگر کمرہ تو پوری طرح روشن تھا۔ وہ اسے بہت آرام سے دیکھ سکتی تھی اور وہ اسے دیکھ بھی

رہی تھی۔ وہ ریٹنگ پر بازو ٹکائے اسموکنگ کر رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی سفیر کے رویے کو۔ اسے یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ کھڑے کھڑے تھک گیا تو کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ رات کا باقی حصہ اس نے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہوئے گزارا۔ وہ ویسے ہی بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی جبکہ وہ اس کی طرف بالکل بھی متوجہ نہیں تھا۔ صبح کے قریب اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور وہ کرسی سے ٹیک لگائے لگائے ہی سو گیا تھا۔ اذان ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ جب اچانک اس کی آنکھ کھلی وہ آہستگی سے بیڈ پر سے اٹھی۔ ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر وہ آہستہ آہستہ اپنی ساری جیولری اتار رہی تھی۔ کسی لڑکی کے ساتھ شادی کی پہلی رات اس کا شوہر ایسا سلوک کرے اور وہ روئے بھی نہ کتنی ناممکن بات ہے یہ۔ اس نے اپنی آنکھوں کو آئینے میں بغور دیکھا۔ ان میں ہلکی سی بھی نمی نہیں تھی۔ یوں جیسے اسے اس بات کا احساس ہی نہیں کہ اس کی انسلٹ کی گئی ہے اس کے وقار کو ٹھیس پہنچائی گئی ہے۔ جیولری اتارنے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ اس نے کپڑے بدلے پھر وضو کیا۔ جائے نماز اسے ڈرائنگ روم میں رکھی مل گئی تھی۔ وہ سر پر نماز کے لیے دوپٹہ اوڑھتی ڈرائنگ روم سے باہر نکلی تو نظریں سیدھی سفیر پر پڑیں۔ وہ کمرے میں واپس آ چکا تھا۔ وہ اس کے بالکل سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے بھی کچھ چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”مجھے نماز پڑھنی ہے“ قبلہ کس طرف ہے؟۔“

اس نے سفیر کی طرف دیکھتے ہوئے بہت عام سے اور جذبات سے عاری انداز میں پوچھا۔ وہ بہت بری طرح چونک گیا۔

اس کے پاس آ کر اس نے جائے نماز اس کے ہاتھ سے لی اور خود ہی بچھا دی۔ وہ جائے نماز بچھا کر مٹا تو وہ فوراً ”نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ وہ واپس صوفے پر بیٹھ

گیا۔

نماز پڑھ کر جائے نماز تہہ کرتے ہوئے وہ واپس مڑی تو سہیر کو اپنی ہی طرف دیکھتا ہوا پایا۔ وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔ سفیر نے اسے اشارے سے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

”میں جو باتیں تم سے کرنے والا ہوں وہ تمہارے لیے یقیناً بہت تکلیف دہ ہوں گی مگر جھوٹ اور منافقت سے میں سخت نفرت کرتا ہوں۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

”کل رات تم مجھے بہت بری لگ رہی تھیں لیکن اس وقت تمہیں دیکھ کر مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اس سارے قصے میں میرے علاوہ اگر کسی پر ظلم ہوا ہے تو وہ تم ہو۔ تمہارا اور تمہاری فیملی کا کوئی قصور نہیں۔ تم لوگوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس قصے کے اصل مجرم میرے والدین ہیں۔“ وہ بہت صاف گوئی سے بولا۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”پاپا کہتے ہیں انہوں نے آج سے کئی سال پہلے تمہیں اپنی بہو کے طور پر پسند کر لیا تھا۔ ہم لوگ تمہارے گھر کسی فنکشن میں گئے تھے تب ممی نے مجھے تمہیں دکھاتے ہوئے بتایا تھا۔ اس وقت میری زندگی میں ایسا کوئی نہیں تھا جس کی وجہ سے میں تمہارے لیے انکار کر دیتا۔ مجھے بھی تم اچھی لگی تھیں۔ میری رضامندی لینے کے بعد ممی نے تمہارے گھر والوں سے رشتے کی بات کی مگر تمہارے گھر والوں نے انکار کر دیا۔ میرے حساب سے وہ بات وہیں ختم ہو گئی تھی مگر میں جانتا نہیں تھا کہ یہ بات ختم نہیں ہوئی ہے۔“ اس کے لہجے میں غصہ چھلکنے لگا تھا۔

”پھر میں ماسٹرز کرنے کینڈا چلا گیا۔ وہاں مجھے مارگریٹ ملی۔ وہ بھی میری طرح سول انجینئر تھی۔ یونیورسٹی میں میرے ساتھ ایم ایس کر رہی تھی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ خوبصورتی سے میں بے شک بہت سی لڑکیوں کی متاثر ہوا ہوں گا مگر

محبت مجھے صرف مارگریٹ سے ہوئی۔ وہ ایک انگریز فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے والد اپنے برنس کی وجہ سے برسوں پہلے انگلینڈ چھوڑ کر کینڈا سیدھل ہو گئے تھے۔ بہت کمزور و بونہو قسم کی انگلش فیملی سے تعلق ہے اس کا۔ ان کے ہاں بہت سی ایسی باتیں ہری سمجھی جاتی ہیں جنہیں مغربی کلچر میں برائی سمجھا نہیں جاتا۔ میں نے اسے پرپوز کیا۔ اور جب اس نے میرے پرپوزل کا ہاں یا نہ میں جواب دینے کا فیصلہ اپنے والدین پر چھوڑا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ مجھے اپنے پیرمس سے ملوانے لے گئی۔ وہ لوگ مجھ سے ملے اور میں انہیں پسند آ گیا۔

وہ لوگ چاہتے تھے کہ مجھ سے شادی کے لیے ان کی بیٹی اپنا مذہب نہ بدلے مگر میں نے مارگریٹ سے صاف کہہ دیا کہ اگر وہ واقعی مجھ سے محبت کرتی ہے اور شادی کرنا چاہتی ہے تو اسے مسلمان ہونا ہو گا۔ وہ مجھ سے اتنی زیادہ محبت کرنے لگی تھی کہ یہ بات مان گئی۔ اس نے اپنے والدین کو بھی منالیا۔ میں جانتا تھا میرے اس فیصلے سے میرے والدین کو اختلاف ہو گا۔ وہ ایک انگریز لڑکی کو چاہے وہ کتنی ہی اچھی فیملی سے تعلق کیوں نہ رکھتی ہو، بہو بنانے کے لیے خوشی خوشی تیار نہیں ہو سکتے۔ ممی پاپا کے ساتھ ہم بہن بھائیوں کے ہمیشہ دوستانہ تعلقات رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں ہماری زندگی کا ہر فیصلہ خود کرنے کی آزادی دی تھی۔ ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میرا خیال تھا کہ تھوڑی بہت بحث و تکرار کے بعد میں انہیں منالوں گا۔ میں نے پاپا کو فون پر مارگریٹ کے بارے میں بتایا تو وہ غصے سے پاگل ہو گئے۔

میں نے انہیں قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ مانے اور میں انہیں ناراض کر کے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے ممی پاپا کو بھی اسے پاکستان آنے کا بتا دیا اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ والدین بھی کبھی اولاد کے خلاف اس طرح کی سازش کر سکتے ہیں میں

سوچ بھی
تمہارے
تاریخ بھی
تھا اسی
مارگریٹ
میرے
قبول کیا
سمیٹ
شادی
ہم نے
ایس پور
ہی میں
جیسے کوئی
مجھے
پلان سو
جلگہ بیٹ
ہمارے
ہونے
میں اس
مجھے
حیرت
سب
مجھ
اپنے
سے اس
”
کی بیٹی
”
منع کر
بولے
”
ان کی
کریر

سے صبا سے زیادہ کوئی لڑکی اچھی نہیں لگی۔ ہاں اگر تم کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کی بات کرتے تو ہم اس بارے میں سوچ سکتے تھے۔“

ممی مجھے کسی انتہائی فیصلے سے باز رکھنے کے لیے جذباتی بلیک میلنگ میں مصروف تھیں۔

”تمہارے ہاتھ میں ہے ہماری عزت۔ میں مانتی ہوں تمہارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ میں نے کوشش کی تھی تمہارے پیپا کو سمجھانے کی مگر تم جانتے ہو انہیں وہ کس قدر ضدی ہیں۔ میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ نہیں مانے۔“ انہوں نے آنسو بہاتے ہوئے مجھ سے التجا کی۔ میں انہیں دنیا کے سامنے ذلیل کرنے کا حوصلہ نہیں کر پایا۔

میں نے چپ چاپ شادی کر لی۔ مجھے یہ بات سوچتے ہوئے شرم آئی ہے کہ اب میں سمیعہ کا سامنا کیسے کروں گا۔

کل رات تمہیں گھر لانے کے بعد ایک مرتبہ پھر ممی میرے پاس آ گئیں۔ وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑے رو رہی تھیں۔

”سفیر! میں تمہیں اپنی محبت کا واسطہ دے کر کہہ رہی ہوں، ہمیں اس کے والدین کے سامنے شرمندہ مت کروانا۔ پلیز اسے کچھ بھی مت بتانا۔“ انہیں پتا تھا میں بہت غصے میں ہوں۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر اور آنسو بہا کر میرے غصے پر بند باندھنے کی کوشش کی تھی۔

عورت کا حسن مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے،

سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے مجھے بتائے بغیر تمہارے گھر رشتے کی بات کی اور جھٹ پٹ شادی کی تاریخ بھی طے کر لی۔ میں انہیں ہر قیمت پر منالینا چاہتا تھا، اسی لیے میں نے اپنے پاکستان آنے سے پہلے مارگریٹ سے باقاعدہ اسلام قبول کرنے کے لیے کہا۔ میرے ساتھ اسلامک سینٹر جا کر اس نے باقاعدہ اسلام قبول کیا۔ وہ اب مسلمان ہو چکی ہے۔ اس کا نیا نام سمیعہ ہے۔ اسے پتا تھا میں اپنے والدین کو ہماری شادی کے لیے منانے جا رہا ہوں۔ وہ بہت خوش تھی۔ ہم نے مستقبل کے کتنے حسین خواب دیکھے تھے۔ ایئر پورٹ پر وہ مجھے سی آف کرنے آئی تھی۔ گھر پہنچتے ہی میں حیران رہ گیا۔ یہاں ایسی تیاریاں ہو رہی تھیں جیسے کوئی شادی ہونے والی ہے۔

مجھے تھوڑی ہی دیر میں حقیقت پتا چلی گئی، ان کا پلان سو فیصد کامیاب رہا تھا۔ شادی کے کارڈز سب جگہ بٹ چکے تھے۔ دوسرے شہروں سے کتنے رشتے دار ہمارے گھر میری آمد سے پہلے میری شادی میں شریک ہونے کے لیے موجود تھے۔ گھر میں اتنے مہمان تھے کہ میں اپنے باپ سے لڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ سب لوگ مجھے میری شادی کی مبارکباد دے رہے تھے اور میں حیرت سے سب سن اور دیکھ رہا تھا۔ ساری زندگی مجھے سب کچھ دینے کے بعد کس طرح میرے والدین نے مجھ سے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین کر اپنے ہر احسان کی قیمت وصول کر لی تھی۔ میں نے پیپا سے اس ظلم پر احتجاج کیا تو وہ دو ٹوک انداز میں بولے۔

”ہم نے تمہاری رضامندی کے بعد شفیق سے اس کی بیٹی کے رشتے کی بات کی تھی۔“

”لیکن وہ بات تو تب ہی ختم ہو گئی تھی۔ انہوں نے منع کر دیا تھا۔“ میں مشتعل ہوا تو وہ بے نیازی سے بولے۔

”انہوں نے منع نہیں کیا تھا۔ صرف یہ کہا تھا کہ ان کی بیٹی ابھی چھوٹی ہے، وہ اس کی شادی چند سال بعد

ادارہ خواتین ڈائجسٹ نارتھ سے بہنوں کے لیے عید کا تحفہ ہے

۲۰ خوبصورت و مقبول ناول

- * میر خواب ریزہ ریزہ 300/- * لامعہ شمس میراجہ 180/-
- * اک ریا جلائے کھانا 300/- * شہر دل کے دروازے غریب 250/-
- جانوں کا ناول ایک ساتھ سنگارے پر ڈاک خراج فوری
- * خوبصورت مرد و عورت * خوبصورت بچیاں * مضبوط جملہ * آفٹ پیسر

شکایت ہوئے ہیں

آج بھی قریبی بکسٹال سے حاصل فرمائیں

میں یقین تھا۔ ”وہ اب براہ راست اس کی طرف دیکھ
تھا۔ اس کی خوب صورتی کا ذکر اس نے بہت
خرانہ انداز میں کیا تھا۔

”صحیح سوچا تھا انہوں نے اپنے حساب سے۔ تم
بہت خوبصورت ہو۔ جو لڑکی بغیر کسی میک اپ
بناؤ سنگھار کے سر پر دوپٹہ اوڑھے اس قدر حسین
رہی ہے اس کی خوبصورتی میں شک کی کوئی
نجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ تم بہت خوبصورت ہو“ اعلا
لیم یافتہ ہو یہ تمام وجوہات کافی ہیں۔ تمہیں ایک
بھی لڑکی سمجھنے کے لیے تمہیں پسند کرنے کے لیے
میری تمام وجوہات کافی نہیں ہیں تم سے محبت کرنے
کے لیے۔“

”ہر اچھا شخص جو مجھے پسند بھی کر رہا ہو ضروری
میں کہ میں بھی اسے پسند کر لوں اور یہ بھی ضروری
میں کہ اس ناپسندیدگی کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ہو۔“
سے اپنی کئی ایک بات اچانک ہی یاد آئی تو اس کا دل
چاہا وہ سفیر کو یہ بات بتائے کہ وہ بھی بالکل اسی کی طرح
سوچتی ہے۔ وہ بھی ہر اچھے شخص سے صرف اس وجہ
سے محبت نہیں کر سکتی کہ وہ اچھا ہے۔

”مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ
ہوا اس پر مجھے افسوس ہے مگر میں اس سب کے لیے
خود کو قصور وار نہیں سمجھتا۔ تمہارے ساتھ ظلم
میرے ماں باپ نے کیا ہے۔ اگر کچھ کہنا ہے تو جا کر ان
سے کہو۔“ وہ ایک دم ہی صوفے سے اٹھا اور پھر اس
سے مزید کچھ کہے بغیر ہاتھ روم میں چلا گیا۔ چھ سات
منٹ بعد ہی وہ تو لے سے سرگڑتا ہوا ہاتھ روم سے
نکل آیا۔ تولیہ اس نے لاروائی سے کرسی پر اچھالا اور
ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر برش کرنے لگا۔
اسی وقت کسی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

”السلام علیکم بھابھی!“ آنے والی شخصیت علیہا کی
تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ہولے سے مسکرائی۔ اسے خود
اپنے مسکرائے پر حیرت ہوئی تھی۔ جو باتیں کچھ دیر
پہلے سفیر اس سے کر کے گیا تھا ان کے بعد مسکرائے
کی کوئی گنجائش بچی تو نہیں تھی۔

”میں نے ابھی سفیر بھائی کو لاؤنج میں دیکھا تو سوچا
کہ شاید آپ بھی اٹھ گئی ہوں گی“ اسی لیے آگئی مگر
تیاری میں آپ کی مدد کروادوں۔“ اس نے اپنی چھ ماہ کی
بچی کو گود سے اتار کر بیڈ پر لٹایا اور خود اس کے لیے
لباس منتخب کرنے لگی۔

”یہ ساڑھی کیسی ہے؟“ اس نے فیوزی رنگ کی
بنارسی ساڑھی اس کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔
”بہت خوبصورت ہے۔“ اس نے مسکراتے
ہوئے جواب دیا۔ وہ علیہا کو اپنے چہرے پر کچھ کھوتا
ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اسے علیہا کی اس کوشش اور
اس کوشش کے جواب میں اپنا مسکرا مسکرا کر ”سب
ٹھیک ہے“ والا انداز اختیار کرنے پر ہنسی آنے لگی۔

”بھابھی! آپ کپڑے بدلیں“ میں شانم کو کسی کے
سپرد کر کے آتی ہوں پھر مجھے آپ کا میک اپ کرنا ہے۔
میرا خیال ہے آپ کے گھر سے بھی عاصم وغیرہ آنے
والے ہوں گے۔ ان کے آنے سے پہلے آپ تیار
ہو جائیں تو اچھا ہے۔“ وہ اپنی بیٹی کو گود میں لیتے ہوئے
بولی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ علیہا کمرے سے
باہر چلی گئی تو وہ اٹھ کر بیڈ کے پاس آگئی۔ اس نے اس
جیولری کیس کو اٹھایا۔ اور ڈریسنگ ٹیبل کے پاس
آگئی۔ علیہا کے کہنے پر اسے خود بھی یہ بات یاد آگئی
تھی کہ ابھی کچھ ہی دیر میں اس کے گھر سے کوئی نہ کوئی
آنے والا ہو گا اور آنے والے اگر عاصم یا اس کی کوئی
کزن ہوئی تو پہلا سوال اسی چیز کے بارے میں ہو گا۔
اس کے ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔

اسے وہ جیولری اپنے ہاتھوں سے پہننے پر خود پر ذرا
بھی ترس نہیں آیا تھا۔

”تمہارے ساتھ یہی سب کچھ ہونا چاہیے تھا صبا
شفیق۔ تم اس کی مستحق تھیں۔“ وہ استہزائیہ انداز
میں خود پر ہنسی۔

علیہا نے اس کا میک اپ کرنے کے بعد جیولری
پہناتے ہوئے ستائشی انداز میں بولی۔ ”آپ کی ہائٹ
اور فیکر ایسا ہے کہ آپ پر ساڑھی بہت اچھی لگ رہی
ہے۔ بہت کم لوگوں پر ساڑھی اتنی اچھی لگتی ہے۔“ وہ

اسے تیار کر کے
ساتھ کمرے میں
اسے دیکھتے ہی
پڑھا۔ اس نے
سے لپٹایا۔ وہ اس
اس کی تیار یوں
طرح زینہ
اس کی گردن
ایک گہری طمر
علیہا نے بھی
کیلی آ
پوچھا۔ وہ اس
”ہاں“ ہر
بھی تو آیا
کر۔“ وہ جواب
”تم لوگ
لگا کیوں
گئیں جبکہ
ناشتے
آگئی۔ سفیر
جانے
ہاتھوں ہاتھ
نمانے
”صبا
تھوڑی دیر
نے بے
”بہر
دیا۔ ماما
”بد
آئی۔
”م
نے س
خالص
کہ

اسے تیار کر کے فارغ ہوئی ہی تھی کہ زینہ آنٹی کے ساتھ کمرے میں عاصمہ اور معاذ داخل ہوئے۔ معاذ اسے دیکھتے ہی بھاگتا ہوا فوراً اس کے پاس بیڈ پر پڑھا۔ اس نے بھی بڑے والہانہ انداز میں اسے خود سے لپٹایا۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی تیاریوں پر حیران بھی نظر آ رہا تھا۔ علینا ہی کی طرح زینہ آنٹی نے بھی اسے بہت غور سے دیکھا۔ اس کی گردن میں پرل کا نیکیلس دیکھتے ہی انہوں نے ایک گہری طمانیت بھری سانس لی جو اس کے علاوہ علینا نے بھی محسوس کی تھی۔

”کیلی آئی ہیں بھابھی؟“ اس نے عاصمہ سے پوچھا۔ وہ اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ”ہاں بس میں اور ظفر آئے ہیں۔ اور ہاں یہ معاذ بھی تو آیا ہے ہمارے ساتھ۔ وہ بھی زبردستی پیچھے لگ کر۔“ وہ جواباً مسکرائی۔

”تم لوگ باتیں کرو“ میں دیکھوں کہ ناشتہ اب تک لگا کیوں نہیں ہے۔“ زینہ آنٹی کمرے سے باہر چلی گئیں جبکہ علینا ان لوگوں کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ ناشتہ کے بعد وہ ظفر اور عاصمہ کے ساتھ گھر آئی۔ سفیر نے اپنی تھکن کا جواز پیش کر کے ساتھ جانے سے معذرت کر لی تھی۔ گھر میں اسے یوں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا گویا وہ بہت دنوں بعد وہاں آئی ہو۔ ماما اسے گلے لگا کر خوب پیار کیا تھا۔

”صبا! تمہیں سفیر کیسا لگا؟“ بڑی مشکلوں سے تھوڑی دیر کے لیے انہیں تنہائی نصیب ہوئی تو انہوں نے بے مافی سے اس سے پوچھا۔

”بہت ہنڈ سم۔“ اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ماما کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”بد تمیز۔ ماں سے مذاق کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔“

”ماما! آپ نے یہی تو پوچھا ہے کہ سفیر کیسا لگا۔ میں نے سچائی سے جوابات بھی وہ بتادی۔ اب ایک اچھے خاصے ڈیشننگ ہنڈ سم اور اسٹارٹ بندے کو میں یہ تو کہہ نہیں سکتی کہ اچھا نہیں لگا۔“ اس کا جواب کمرے

میں داخل ہوتی ہوئی عاصمہ نے بھی سن لیا۔ ماما کی طرح وہ بھی بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ شام کو علینا اور سفیر اسے لینے آئے تھے۔ سفیر کا انداز بہت سنجیدہ اور لیے لیے قسم کا تھا۔ ظفر کے ساتھ البتہ اس کی کافی دوستانہ انداز میں گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ لوگ وہاں سے رخصت ہوئے تو سفیر انہیں بیوی پار لڑراپ کر کے گھر چلا گیا تھا۔ ویلے کے لیے اسے یہیں سے تیار ہونا تھا۔ واپسی میں سفیر کی جگہ اس کا ایک کزن ان لوگوں کو لینے آیا تھا۔ وہ لوگ ہوٹل پہنچے تو تقریباً تمام مہمان آچکے تھے۔

علینا اور عاصمہ کی آپس میں اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ کل کامیک اپ زیادہ اچھا تھا یا آج کا۔

”نہ تم دونوں کا کوئی کمال ہے نہ تمہارے منتخب کیے ہوئے بیوی پار لڑر کا۔ وہ ہے ہی اتنی پیاری۔ کہیں سے بھی تیار ہوئی اسے اچھا ہی لگتا تھا۔“ علینا کی خالہ نے صاف گوئی سے تبصرہ کرتے ہوئے ان دونوں کی بحث کا خاتمہ کر دیا۔ وہ خاموش بیٹھی ان لوگوں کے بصرے سن رہی تھی۔ فنکشن ختم ہونے پر جب آہستہ آہستہ تمام مہمان رخصت ہو گئے اور صرف گھر کے افراد اور خاندان کے قریبی لوگ وہاں رہ گئے تو زینہ آنٹی سفیر سے بولیں۔

”تم اور صبا گھر چلے جاؤ۔ ہم لوگوں کو ابھی آدھا ہون گھنٹہ اور لگے گا۔ صبا بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوگی۔“ ماما نے سچ کہا تھا۔ اس کی سانس واقعی اسے بہت چاہتی تھیں۔ انہیں اتنی مصروفیت میں بھی اس کی تھکن کی فکر تھی۔

”تم نے کیا سوچا؟“ سفیر نے اس پر نظر ڈالے بغیر سنجیدگی سے پوچھا۔

”آپ نے کیا سوچا؟“ اس کے سوال کے جواب میں اس نے بھی سوال ہی کیا تھا۔ اسے اس سے اس بر جستگی کی توقع نہیں تھی۔ لہذا بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرے پیرئس نے مجھ سے پوچھنے کے بعد آنٹی انکل کو ہاں کہی تھی۔ انہوں نے میری رضامندی سے

میرا رشتہ طے کیا۔ مجھے اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اعتراض آپ کو ہے۔ آپ کی ناپسندیدگی کے باوجود بھی یہ شادی ہو چکی ہے۔ اب آگے کے بارے میں اہمیت میرے سوچنے کی نہیں، آپ کے سوچنے کی ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بے حد سپاٹ انداز میں بولی۔

سفیر نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”مجھے سمیعہ سے ہر قیمت پر شادی کرنی ہے۔ اس بارے میں سوچنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ گھر سے مہمان چلے جائیں اور علیہا اپنے گھر واپس چلی جائے تو میں فوراً ”کینیڈا واپس چلا جاؤں گا۔ میری کینیڈا میں جاب اتنی اچھی ہے کہ میں اپنے باپ کے پیسوں کا بالکل بھی محتاج نہیں، وہ بے شک مجھے عاق کرویں۔“

اپنی باتوں پر اس کا رد عمل دیکھنے کے لیے اس نے ایک مرتبہ پھر ونڈا سکرین سے نظریں ہٹا کر صبا کی طرف دیکھا۔

”کیا آپ کی اور سمیعہ کی زندگی میں میرے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے؟“ اس کا سوالیہ انداز ایک دفعہ پھر جذبات سے عاری تھا۔ ”حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔“

”میں اس شادی کو قائم رکھنا چاہتی ہوں۔ میری بہن کے انتقال کو ابھی بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ میرے پیرش ابھی تک اس صدمے سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ اگر میری شادی ختم ہو گئی تو انہیں بہت بڑا شاک پہنچے گا۔ میں انہیں اپنی وجہ سے کوئی دکھ نہیں دینا چاہتی۔ آپ کو سمیعہ کے ساتھ ضرور شادی کرنی چاہیے۔ آپ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں آپ دونوں کی شادی ہونی چاہیے مگر کیا اس شادی کے ساتھ ساتھ آپ میرے ساتھ بھی اس تعلق کو قائم رکھ سکتے ہیں؟“

”تم دو سری لڑکیوں سے بہت مختلف ہو۔“ یہ لڑکی اسے آج صبح سے چونکا رہی تھی۔ وہ اعتراف کیے بنا رہ نہیں سکا تھا۔ ”تمہاری جگہ دو سری کوئی لڑکی ہوتی تو

اس صورت حال میں اس طرح ری ایکٹ نہیں کر سکتی تھی۔ بجائے رونے دھونے اور واویلہ کرنے کے تم نے اتنی جلدی تمام مسائل کا منطقی انداز میں حل تلاش کرنا شروع کر دیا ہے۔ تم واقعی بہت مضبوط اور بہادر لڑکی ہو۔“ اس نے بڑی صاف گوئی سے اس کی تعریف کی۔

”آپ کی تعریف کا شکریہ۔ لیکن آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ اس کے سوالیہ انداز پر اس کے لبوں پر بے ساختہ ہلکی سی مسکراہٹ در آئی تھی۔ ”تم بہت اچھی لڑکی ہو صبا! تمہارے ساتھ واقعی بہت زیادتی ہوئی ہے۔ تمہاری شادی کسی ایسے شخص سے ہونی چاہیے تھی جو تم سے محبت کرتا۔“ اس کی نگاہوں اور اس کے لہجے میں سرد مہری اور اجنبیت کی جگہ دوستانہ انداز نے لے لی تھی۔

”اس وقت نہ میں تمہیں بتاں کہہ سکتا ہوں اور نہ ہاں۔ تم مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا وقت دو۔“ گاڑی گھر کے اندر لا کر پورچ میں لے جا کر روکتے ہوئے اس نے کہا۔ شدید خواہش رکھنے کے باوجود وہ اسے دو ٹوک انداز میں منع نہیں کر پایا تھا۔ کمرے میں آکر وہ بجائے بیٹھنے کے فوراً ”ہی ڈریسنگ ٹیبل کے پاس آکر اپنی جیولری اتارنے لگی۔ سفیر ڈریسنگ روم میں کپڑے بدلنے چلا گیا۔ وہ کپڑے بدل کر آیا تو وہ دوپٹے کی بنی نکلنے میں مصروف تھی۔ وہ کل کی طرح بالکونی میں نہیں گیا تھا بلکہ تکیے سے ٹیک لگا کر بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ یہیں نکالتے نکالتے یونہی بے دھیانی میں اس کی نظر سفیر پر پڑی تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ اس کی طرف بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور یہ نگاہیں صبح سے لے کر اب تک کی تمام نگاہوں سے مختلف تھیں۔ ایک بل کے لیے دوپٹہ پر رکھے اس کے ہاتھ کانپے۔ اس نے فوراً اپنا رخ بدل لیا۔

اور دوپٹہ کی آخری پن نکالنے کے بعد کپڑے بدلنے ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکا تھا۔

صبح ناشتے کے تھوڑی دیر بعد ہی زرینہ آنٹی نے اس سے لہجے کے بارے میں پوچھا۔
 ”لہجے میں کیا کھاؤ گی صبا؟“ انکل بھی وہیں بیٹھے تھے۔
 ”کچھ بھی جو آپ لوگوں کو پسند ہو۔“

”تکلف سے کام نہیں چلے گا“ اپنی پسند بتاؤ۔ آج ہم سب بھی تمہاری پسند کا لہجہ کریں گے۔“ انکل نے اسے فوراً ٹوکا۔
 ”کوئی بھی چائینر ڈش۔“ ان کے اصرار پر اسے کہنا

”زرینہ! آج لہجے پر چائینر ڈشز ہونی چاہئیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ ہونی چاہئیں۔“ اس کا جواب سننے ہی انہوں نے زرینہ آنٹی سے کہا۔ زرینہ آنٹی فوراً وہاں سے چلی گئیں۔ انکل بھی اپنے کسی کام سے تھوڑی دیر بعد اٹھ گئے تو وہ کچھ دیر کے لیے لاؤنج میں بالکل تنہا رہ گئی۔
 ”تم یہاں بیٹھی ہو۔“ سفیر لاؤنج میں آتے ہوئے

”چلو لہجے کرنے کہیں باہر چلتے ہیں۔“ گاڑی کی چابی ہاتھ میں لیے وہ جیسے جانے کا پروگرام پہلے ہی سے بنائے بیٹھا تھا۔
 ”لیکن آنٹی میری وجہ سے لہجے پر چائینر کھانے بنوا رہی ہیں۔“

”گھر پر بہت لوگ ہیں وہ کھانا کھانے کے لیے چھوڑ دو تم اسے۔“ اس کے اعتراض پر وہ لاپرواہی سے بولا۔

”میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم مئی کو بنا کر آ جاؤ۔“ باہر نکلتے ہوئے اس سے بولا۔

”آنٹی! ہم لوگ لہجے کرنے جا رہے ہیں۔“ وہ کچن کے دروازے کے پاس آکر ہچکچائے ہوئے انداز میں بولی۔ وہ ملازمہ کو لہجے کے لیے کچھ ہدایات دینے میں مصروف تھیں۔ اسے آنا دیکھ کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ اس کی بات سن کر وہ بڑے خوشگوار انداز میں مسکرا دیں۔

”ضرور جاؤ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ برآمدے کے بجائے وہ بہت زیادہ خوش نظر آ رہی تھیں۔ اسے معلوم تھی وجہ کس سے اس قدر خوش ہیں۔ وہ پورچ کی طرف جانے لگی تو راستے میں انکل سے ٹکراؤ ہوا۔ وہ سفیر کو گاڑی میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتے دیکھ چکے تھے، اس لیے ان کے چہرے پر پہلے ہی سے فخریہ مسکراہٹ تھی۔ اپنے فیصلے کا اچھا نتیجہ نکلا دیکھ کر وہ بڑے مطمئن نظر آ رہے تھے۔ ان کی سوچ اور ان کا تجربہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ بیٹا گھروالوں پر غصے اور ناراضی کے باوجود بھی اس لڑکی کو نظر انداز نہیں کر پایا تھا اور یہی انہیں امید تھی۔

”تمہیں چائینر کھانے پسند ہیں؟“ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”میوزک سنو گی؟“ اس کے پوچھنے پر اس نے سر ہلا دیا۔ اس نے کیسٹ لگا دی۔ گاڑی ایک چائینر ریسٹورنٹ کے پاس لا کر روک دی گئی۔ کل رات اس نے صبا سے کہا تھا کہ وہ سوچ کر اسے جواب دے گا اس بات کا کہ وہ اس کے ساتھ اس رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے تیار ہے یا نہیں مگر پھر اسے سوچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

کل رات کے بعد اب نہ صبا کو اپنے سوال کے جواب کی کوئی ضرورت رہی تھی اور نہ اسے جواب دینے کی کسی بھی وجہ سے لیکن وہ صبا شفیق کو قبول کر چکا تھا اسی لیے اس وقت لہجے کرتے ہوئے وہ اسے بڑی سنجیدگی سے بتانے لگا۔

”ابھی میں واپس ٹورنٹو چلا جاؤں گا۔ فوراً“ میں سمجھ کر یہ سب کچھ بتا نہیں سکوں گا کچھ عرصہ لگے گا مجھے یہ سب کچھ اسے سمجھانے میں۔ ظاہری بات ہے اسے بہت صدمہ پہنچے گا۔ وہ مجھ سے بدگمان ہوگی۔ آہستہ آہستہ میں اسے قائل کروں گا۔ بتا نہیں اس سب میں کتنے دن لگیں۔ ویسے بھی ابھی ایک سال سے پہلے تو میرا پاکستان آنے کا کوئی ارادہ پہلے بھی نہیں تھا۔ شادی میں اس کے ساتھ یہاں سے جاتے

ہی کر لوں گا پھر جیسے ہی وہ میری بات سمجھنے میں کامیاب ہوئی ہم لوگ پاکستان آجائیں گے پاکستان آنے کا میرا پکارو گرام ہے۔ تم مئی پاپا کے ساتھ رہنا سمیعہ کو میں الگ گھر میں رکھوں گا۔ وہ پرسکون سے انداز میں مسکرائی۔ اسے سفیر کی بات سے بڑا اطمینان ملا تھا۔

”میں آپ کی اور سمیعہ کی زندگی میں بالکل مداخلت نہیں کروں گی۔“ وہ اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے اس کی بات سن رہا تھا۔ ”بس میری آپ سے اتنی التجا ہے کہ میرے گھر والوں کو ابھی کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔ جس طرح آپ سمیعہ کو ایک دم سے ساری بات نہیں بتا سکتے اسی طرح میں بھی انہیں اچانک یہ خبر نہیں سنا سکتی۔ آپ کے جانے کے بعد موقع دیکھ کر میں انہیں مناسب طریقے سے ساری بات سمجھا دوں گی۔“ وہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ سفیر نے اس کی بات بڑی سنجیدگی سے سنی اور سر ہلا دیا۔ وہ اب اس کی باتوں پر حیران نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھی لڑکی کوئی عام لڑکی نہیں وہ بڑی منفرد اور مختلف لڑکی ہے۔

”پاپا سے ناراضی کے باوجود میں ان کی لائی ہوئی لڑکی کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس سے نفرت ہے۔“ وہ اس کی تعریف کر رہا تھا۔

”پھر اس میں میرا تو کوئی کمال نہیں۔ مطلب یہ کہ اگر میں خوبصورت نہ ہوں تو آپ مجھ سے نفرت کرتے مگر عام سی شکل کے ساتھ بھی میں ہوں تو صبا شفیق ہی۔ بقول آپ کے میں مختلف ہوں بہادر ہوں مضبوط ہوں۔ تب بھی مجھ میں یہ سب خصوصیات موجود ہوتیں مگر کیا اس وقت یہ خصوصیات اس وجہ سے غیر معمولی نہیں لگتیں کیونکہ ان کی حامل لڑکی عام سی صورت شکل کی ہوتی؟“ وہ جواباً کھل کر ہنسا تھا۔

”فرض کرنے والی بات کا میں کیا جواب دوں۔ اگر تم خوبصورت نہ ہوتیں یہ بات فی الحال تو میں فرض بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس وقت میرے سامنے گرین کلر کا ڈریس پہنی ہوئی لڑکی بے حد حسین لگ رہی

ہے۔“ فی الوقت وہ صبا شفیق کے حسین کا اسیر ہو گیا تھا۔ اس کی باتیں اسے اچھی لگ رہی تھیں۔ اسے دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔

”آپ فوراً گھر واپس جانا چاہتے ہیں؟“ ”ارادہ تو یہی تھا ویسے اگر تمہارا کہیں اور چلنے کا موہ ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ اس نے بڑی فراخ دلی سے کہا۔

”میں ماما اور ڈیڈی سے ملنا چاہتی ہوں اگر آپ چل سکیں تو۔“



کھانے کے بعد وہ کمرے میں آئی تو سفیر وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ لیوی پر کوئی مووی دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا۔

”او بیٹھو اچھی مووی آرہی ہے۔“ اس کی نظریں اسکرین پر تھیں اور ذہن معاذ میں اڑکا ہوا تھا۔

”تمیرا خیال ہے تمہیں فلم اچھی نہیں لگ رہی۔“ ”الیوم کم کرتے ہوئے وہ بولا۔

”نہیں، فلم اچھی ہے۔“ اس نے چوتکتے ہوئے اسے جواب دیا۔

”فلم سے تمہاری بیزاری اپنی جگہ درست ہے۔ چاہے جن حالات میں بھی ہماری شادی ہوئی ہے۔

بہر حال آج ہماری شادی کی تیسری رات ہے اور صرف تین دنوں میں دو افراد ایک دوسرے سے اتنے تنگ

نہیں آجاتے کہ آپس میں گفتگو کرنے کے بجائے لیوی دیکھ کر وقت گزاریں۔ یہ نوبت تو غالباً شادی کے

دو تین سالوں بعد آئی شروع ہوتی ہے۔“ اپنی بات مکمل کر کے اس نے ریموٹ سے لیوی آف کر دیا

تھا۔

”چلو ہم اپنی باتیں کرتے ہیں۔ موضوع کا انتخاب تم کرو۔“ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”آپ مجھے سمیعہ کے بارے میں بتائیں۔“ ”مسکراتے ہوئے بولی۔

”کیا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہی کہ وہ آپ

”حیرت ہے، تمہیں بھی اس کی وہی چیز سب سے اچھی لگی جو مجھے لگتی ہے۔“ وہ بولے سے ہنس۔
سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے اس نے تصویر واپس والٹ میں رکھ دی تھی۔ اس وقت وہ اس سے اتنی دور تھی کہ وہ اسے یاد کر کے دکھی ہونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا، اس لیے اس نے اپنی توجہ اس لڑکی کی طرف کر لی جسے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے سب پریشانیاں بھول جانے کو جی چاہنے لگتا تھا۔



ظفر تفریحی پروگرام بنانے میں اپنا مٹانی نہیں رکھتا تھا۔ حسب عادت اس نے ایک پکنک کار پروگرام بنالیا، جس میں صبا کی سسرال کو بھی انوائٹ کیا تھا۔ وہ اور عاصم، ہنی مون کے لیے جانے والے تھے۔ جانے سے دو دن پہلے اس نے پکنک اریج کر لی تھی۔ سفیر کی ایک خالہ جو دعویٰ سے آئی تھیں، واپس جا چکی تھیں جبکہ دوسری ابھی یہیں موجود تھیں۔ وہ سب ہی لوگ پکنک پر آئے تھے۔

وہ دونوں واک کرتے ہوئے سب سے کافی دور آگئے تھے۔ سفیر اسے اپنی کینڈا میں منائی جانے والی اس پکنک کا احوال سن رہا تھا جس میں اس نے اپنے یونیورسٹی کے دوستوں کے ساتھ مل کر بہت انجوائے کیا تھا۔ وہ بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ بہت دور جھیل کے کنارے بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے ار تضحیٰ اور ظفر اسے نظر آئے تھے۔ سفیر نے ان دونوں کو نہیں دیکھا تھا، وہ اپنا قصہ سنانے میں مصروف تھا۔ واک کرتے کرتے اچانک اس نے سفیر کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ ایک پل کے لیے بہت حیران ہوا تھا۔ یہ لڑکی جو اپنی عمر سے بیس، تیس سال بڑی اور میچجور لگتی تھی، اس سے وہ یہ توقع کبھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی پکنک ایساٹ پر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بھی واک کر سکتی۔ اپنا قصہ ادھور اچھوڑ کر اس نے متحیر سے انداز میں اسے دیکھا۔ اس دوران واک کرتے ہوئے وہ دونوں ار تضحیٰ اور ظفر کے کافی قریب پہنچ چکے

کو پہلی مرتبہ کب اچھی لگی، کیوں اچھی لگی۔“
”تمہیں برا نہیں لگے گا اگر میں تم سے اس کی باتیں کروں گا۔“ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔
”صوبلا“ مجھے برا ماننے کا کوئی حق ہے تو نہیں۔ وہ میرے اور آپ کے درمیان نہیں آتی۔ میں آپ کے اور اس کے درمیان آتی ہوں۔ اگر لگے تو اسے میرا ذکر برا لگنا چاہیے، مجھے اس کا نہیں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”مگر تم جان بوجھ کر تو ہمارے درمیان نہیں آئیں۔ اگر ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو تمہارے ساتھ بھی زیادتی ہی ہوئی ہے۔“ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس پر ایک نظروں ڈرائی۔

”وہ میری قسمت۔ میری قسمت میں جو لکھا تھا، وہ ہو گیا۔ میں اس کے لیے کسی کو الزام نہیں دیتی۔“ وہ منات سے بولی پھر ایک سیکنڈ کا توقف کر کے دوبارہ گویا ہوئی۔

”آپ نے میرا سوال ٹال دیا۔ میں آپ سے سمیعہ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ وہ کیا بہت خوبصورت ہے؟“ وہ جواب میں مسکرایا۔

”خوبصورت۔ اگر میری نظر سے دیکھو تو وہ اس دنیا کی سب سے حسین لڑکی ہے اور اگر دوسرے لوگوں کی بات کروں تو وہ گڈ لکنگ ہے۔“ جواب دیتے ہوئے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا والٹ اٹھایا اور پھر اس میں سے کچھ نکالنے لگا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”یہ دیکھو کی اس تصویر۔“ اس نے والٹ میں سے تصویر نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ بلیوٹراؤزر اور ریڈ لی شرٹ کے ساتھ گلے میں دوپٹہ کے انداز میں بلیک اور ریڈ پرنٹڈ اسکارف لیے وہ لڑکی بڑی بے ساختگی سے کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ ہنستے ہوئے سب سے نمایاں چیز اس کے ڈیپلزم تھے۔

”اس کی ہنسی بہت پیاری ہے۔ خاص طور پر ڈیپلزم بہت خوبصورت لگ رہے ہیں۔“ اس نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

تھے۔ وہ دونوں ان دونوں کو کافی دور سے ہی آتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ سفیر کی بعد میں نظر پڑی تھی ان دونوں پر۔ بہت دور تک کا چکر لگا کر کافی دیر بعد وہ دونوں واپس سب لوگوں کے پاس آئے تھے۔ سچ کا زبردست اہتمام تھا۔ عاصمہ اور علیہنا کھانا لگانے میں مصروف تھیں۔ وہ بھی ان دونوں کی مدد کروانے لگی۔ کھانے کے وقت بہت شور مچا ہوا تھا۔ فل والیوم میں گانے بھی بج رہے تھے اور سب لوگ بھی زور زور سے بولنے اور شور شرابا کرنے میں مصروف تھے۔ اس نے سامنے رکھی ہوئی بریانی کی ڈش اٹھائی۔ اپنی پلیٹ میں بریانی ڈالنے سے پہلے اس نے سفیر سے پوچھا۔

”آپ بریانی لیں گے؟“ اس نے جواباً ”سراشات میں ہلایا تو اس نے اپنی پلیٹ میں بریانی ڈالنے سے پہلے اس کی پلیٹ میں ڈالی۔ پھر اس نے شامی کباب کی ڈش اٹھائی تو اس طرح اس سے پوچھ کر پہلے اس کی پلیٹ میں ایک کباب رکھا پھر اپنی پلیٹ میں۔

بابا نے اپنے چہرے کے تاثر سے ایسا ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ انہوں نے اس کی یہ بات خاص طور پر نوٹ کی ہے لیکن دل ہی دل میں وہ صبا کی اس مشرقی بیویوں والی ادا سے خوب محفوظ ہوئے تھے۔ انہیں وہ دونوں ساتھ بیٹھے اچھے لگ رہے تھے۔ ان کے درمیان یقیناً بہت محبت اور انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے دل کو بہت اطمینان ہوا تھا۔ ساتھ مل کر ایک بہت ہی بھرپور دن گزار کر وہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس آ گئے تھے۔



ظفر اور عاصمہ ہنی مون کے لیے پاکستان کے شمالی علاقوں کی طرف نکل گئے تھے۔

علینا نے جیسے ہی اسلام آباد واپسی کا اعلان کیا، سفیر نے بھی جھٹ پٹ اپنی واپسی کی سیٹ کنفرم کرائی۔ عینا کے جانے کے تیسرے دن کی فلائٹ تھی اس کی۔ اس دوران وہ سفیر کے ساتھ کئی مرتبہ اپنے گھر ہو آئی تھی۔ سفیر کی اتنی جلدی واپسی کسی کے لیے بھی

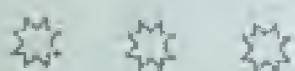
حیرت کا باعث نہیں تھی۔ سب کے علم میں یہ بات تھی کہ سفیر ایک سال کے اندر اندر مستقل طور پر پاکستان واپس آنے والا ہے اور اسی لیے وہ وہاں اپنے رکے ہوئے سب کام جلدی جلدی مکمل کر لینا چاہتا ہے۔ اس تمام عرصہ میں اس کے سفیر کے ساتھ بہت ناز مل تعلقات رہے تھے۔

ایئر پورٹ روانگی سے قبل، کمرے سے تیار ہو کر نکلنے سے پہلے وہ چند لمحوں کے لیے اس کے پاس آکر رکا تھا۔

”تم بہت اچھی ہو صبا! کاش میں تم سے محبت کر سکتا۔“ اس کے لمبے میں افسردگی تھی۔ وہ آہستگی سے مسکرائی۔

”تمہیں تکلیف ہو رہی ہوگی یہ بات سوچ کر کہ تمہارا شوہر تم سے دور جا کر فوراً ہی ایک دوسری لڑکی سے شادی کرنے والا ہے۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈھونڈنے چاہے۔

”آپ نے اول روز مجھے ساری بات صاف صاف بتادی تھی اور میں ساری باتیں جاننے کے باوجود اس رشتے کو نبھانے کے حق میں ہوں۔ آپ یقین کر لیں کہ میں نے حقیقت پسندی کے ساتھ اس ساری صورت حال کو قبول کر لیا ہے۔ میں آپ دونوں کی واپسی کا انتظار کروں گی۔“ سفیر کو ایئر پورٹ چھوڑنے کے لیے صرف اس کے گھر والے ہی نہیں گئے تھے بلکہ بابا، ڈیڈی اور ار ترضی بھی اسے سی آف کرنے آئے تھے۔ زرینہ آنٹی اور انکل کے چہروں پر بیٹے کو رخصت کرتے وقت بہت اطمینان تھا۔ سفیر کا صبا کے ساتھ رویہ ان کے سامنے تھا۔ وہ اس کی اچھائیوں کا معترف ہو گیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت بھی اس نے بڑی گرم جوشی اور اپنائیت کے ساتھ اسے خدا حافظ کہا تھا۔



سفیر نے ٹورنٹو پہنچتے ہی اپنی خیریت کا فون کیا تھا۔ زرینہ آنٹی اور اس سے اس نے بہت مختصر سی گفتگو کی

ظفر واپس جانے والا تھا۔ وہ بھائی کے ساتھ ایک دو گز اڑنا چاہتی تھی۔ زرینہ آئی نے اسے بخوشی میکے کی اجازت دے دی۔ ظفر کے جانے میں ابھی دو تھے۔ عاصمہ بہت چپ چپ نظر آ رہی تھی۔

”اتنا عجیب لگ رہا ہے صبا! ظفر کے جانے کا سوچ کر ہیرا رہا ہے۔ تمہیں بھی اس طرح کی فیلنگز ہوتی گی سفیر کے جانے پر۔“ عاصمہ نے اس سے کہا تو نے اقرار میں گردن ہلا دی۔

”فطری بات ہے نا بھابھی! جس شخص سے آپ کا نہ جڑا ہے اس کا دور جانا اچھا کیسے لگ سکتا ہے۔“ وہ شام کو آئی تھی۔ شام سے لے کر رات گئے تک ظفر، ار تفضی اور عاصمہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔ بابا، ڈیڈی اور ماما نے رات دس بجے تک ان کا ساتھ دیا تھا۔

اگلے روز معاذ کا اسکول کا پہلا دن تھا۔ اس کا جشن صبا کی شادی سے بھی کافی دن پہلے ہو چکا تھا۔ نے معاذ کو بڑی خوشی خوشی اسکول کے لیے تیار کیا۔ کے لیے اپنے ہاتھوں سے ناشتا بنایا۔ رات دیر جاگنے کے باوجود وہ سب لوگ معاذ کو خدا حافظ کے لیے جلدی اٹھ گئے تھے۔ سارا گھر اس کے پیچھے تھا۔ وہ خود بھی اسکول جانے پر بہت خوش اسی خوشی میں اس نے ناشتہ بھی روزانہ کی طرح بے بغیر کر لیا تھا۔ ار تفضی اسے چھوڑنے جا رہا تھا۔

”سب کو سلام کرو اور پیار کروا کر آؤ۔“ ار تفضی اس کا بیگ نیبل پر سے اٹھاتے ہوئے اسے سمجھایا ہاگتا ہوا پہلے ڈیڈی کے پاس گیا۔ انہوں نے جھک سے پیار کیا، دعا میں دیں پھر وہ بابا کے پاس آیا۔ نے اسے گود میں اٹھالیا۔

”اپنے پاپا جیسے آوٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ بننا، بلکہ سے بھی زیادہ۔ سب سے زیادہ۔“ بابا کی گود سے وہ ان کے برابر میں کھڑے ظفر کے پاس آ گیا تھا۔ پہلے ماما کے پاس جاؤ۔“ ظفر نے اسے سمجھایا۔ وہ گر صوفے پر بیٹھی ماما کے پاس آ گیا۔ ماما کی

آنکھوں میں اُسو تھے۔ اسے اپنے میکے سے الگ کرنا کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے بڑی تیزی سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ار تفضی فوراً ان کے پاس آیا تھا۔ ”مما! پلیز اس طرح مت کریں۔ آج معاذ کی تعلیمی زندگی کا پہلا دن ہے، آپ اسے دعا میں دیں۔“ اس نے ان کے کندھے پر بڑی محبت سے اپنا ہاتھ رکھا تھا۔



ظفر چلا گیا تو وہ واپس اپنے سسرال آگئی تھی۔ سفیر نے اس ایک فون کے بعد دوبارہ فون نہیں کیا تھا۔ زرینہ آئی کو اس کا فون نہ آنے پر بہت تشویش تھی۔ اسے گئے دس دن ہو چکے تھے، شروع کے چار پانچ دن اس کی کال کا انتظار کرنے کے بعد انہوں نے خود ہی اسے گھر پر فون کیا مگر وہ گھر پر ملا نہیں پھر اس کا فون آگیا تھا مگر یہ فون صبا کے لیے تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے، جب اس کے کمرے میں فون کی بیل بجی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سفیر تھا۔

”آپ اتنے دنوں سے کہاں ہیں؟ یہاں پر سب آپ کی طرف سے بہت فکر مند ہیں۔“ اس کی آواز سنتے ہی صبا نے کہا۔

”یہیں ہوں، مجھے کہاں جانا ہے اور جو میرے لیے فکر مند ہیں ان سے کہو، میرے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”کیا ہوا سفیر! آپ سمیعہ سے ملے؟“ اس کا سوال سن کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”میں بہت پریشان ہوں صبا! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا کروں۔ سمیعہ مجھ سے بہت بری طرح ناراض ہو گئی ہے۔“ وہ بہت مایوس اور پریشان لگ رہا تھا۔

”آپ فکر نہیں کریں، وہ آہستہ آہستہ ساری بات سمجھ جائے گی۔ اسے آپ کی مجبوری کا اندازہ ہو جائے گا۔ آپ اسے تھوڑا سا وقت دیں۔“ اس نے اسے تسلی دینی چاہی تو وہ جواباً ”غصے سے بولا۔

”بات تو وہ تب سمجھتی اگر میری کوئی بات اس نے

سنی ہوئی۔
کر رہی۔
نہیں۔ اس
بات کا
کسی بھی
ہے، اپنے
کہاں ملو
”وہ
کی جاتی
جاسکتا۔
کے اعتما
ایکٹ کر
ناراض
کے عذر
معذرت
انتظار کر
نے اس
مطمئن
”تم
نہیں
چار منٹ
صبح
فون
”وہ
نہیں
سکون
انہیں
اتنے
نہیں
آ
ساتھ
نظر اند

تھے۔ وہ دونوں ان دونوں کو کافی دور سے ہی آتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ سفیر کی بعد میں نظر پڑی تھی ان دونوں پر۔ بہت دور تک کا چکر لگا کر کافی دیر بعد وہ دونوں واپس سب لوگوں کے پاس آئے تھے۔ سچ کا زبردست اہتمام تھا۔ عاصمہ اور علیہنا کھانا لگانے میں مصروف تھیں۔ وہ بھی ان دونوں کی مدد کروانے لگی۔ کھانے کے وقت بہت شور مچا ہوا تھا۔ فل والیوم میں گانے بھی بج رہے تھے اور سب لوگ بھی زور زور سے بولنے اور شور شرابا کرنے میں مصروف تھے۔ اس نے سامنے رکھی ہوئی بریانی کی ڈش اٹھائی۔ اپنی پلیٹ میں بریانی ڈالنے سے پہلے اس نے سفیر سے پوچھا۔

”آپ بریانی لیں گے؟“ اس نے جواباً ”سراشات میں ہلایا تو اس نے اپنی پلیٹ میں بریانی ڈالنے سے پہلے اس کی پلیٹ میں ڈالی۔ پھر اس نے شامی کباب کی ڈش اٹھائی تو اس طرح اس سے پوچھ کر پہلے اس کی پلیٹ میں ایک کباب رکھا پھر اپنی پلیٹ میں۔

بابا نے اپنے چہرے کے تاثر سے ایسا ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ انہوں نے اس کی یہ بات خاص طور پر نوٹ کی ہے لیکن دل ہی دل میں وہ صبا کی اس مشرقی بیویوں والی ادا سے خوب محفوظ ہوئے تھے۔ انہیں وہ دونوں ساتھ بیٹھے اچھے لگ رہے تھے۔ ان کے درمیان یقیناً بہت محبت اور انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے دل کو بہت اطمینان ہوا تھا۔ ساتھ مل کر ایک بہت ہی بھرپور دن گزار کر وہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس آ گئے تھے۔



ظفر اور عاصمہ ہنی مون کے لیے پاکستان کے شمالی علاقوں کی طرف نکل گئے تھے۔

علینا نے جیسے ہی اسلام آباد واپسی کا اعلان کیا، سفیر نے بھی جھٹ پٹ اپنی واپسی کی سیٹ کنفرم کرائی۔ عینا کے جانے کے تیسرے دن کی فلائٹ تھی اس کی۔ اس دوران وہ سفیر کے ساتھ کئی مرتبہ اپنے گھر ہو آئی تھی۔ سفیر کی اتنی جلدی واپسی کسی کے لیے بھی

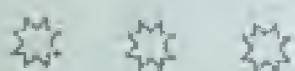
حیرت کا باعث نہیں تھی۔ سب کے علم میں یہ بات تھی کہ سفیر ایک سال کے اندر اندر مستقل طور پر پاکستان واپس آنے والا ہے اور اسی لیے وہ وہاں اپنے رکے ہوئے سب کام جلدی جلدی مکمل کر لینا چاہتا ہے۔ اس تمام عرصہ میں اس کے سفیر کے ساتھ بہت ناز مل تعلقات رہے تھے۔

ایئر پورٹ روانگی سے قبل، کمرے سے تیار ہو کر نکلنے سے پہلے وہ چند لمحوں کے لیے اس کے پاس آکر رکا تھا۔

”تم بہت اچھی ہو صبا! کاش میں تم سے محبت کر سکتا۔“ اس کے لمبے میں افسردگی تھی۔ وہ آہستگی سے مسکرائی۔

”تمہیں تکلیف ہو رہی ہوگی یہ بات سوچ کر کہ تمہارا شوہر تم سے دور جا کر فوراً ہی ایک دوسری لڑکی سے شادی کرنے والا ہے۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈھونڈنے چاہے۔

”آپ نے اول روز مجھے ساری بات صاف صاف بتادی تھی اور میں ساری باتیں جاننے کے باوجود اس رشتے کو نبھانے کے حق میں ہوں۔ آپ یقین کر لیں کہ میں نے حقیقت پسندی کے ساتھ اس ساری صورت حال کو قبول کر لیا ہے۔ میں آپ دونوں کی واپسی کا انتظار کروں گی۔“ سفیر کو ایئر پورٹ چھوڑنے کے لیے صرف اس کے گھر والے ہی نہیں گئے تھے بلکہ بابا، ڈیڈی اور ار ترضی بھی اسے سی آف کرنے آئے تھے۔ زرینہ آنٹی اور انکل کے چہروں پر بیٹے کو رخصت کرتے وقت بہت اطمینان تھا۔ سفیر کا صبا کے ساتھ رویہ ان کے سامنے تھا۔ وہ اس کی اچھائیوں کا معترف ہو گیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت بھی اس نے بڑی گرم جوشی اور اپنائیت کے ساتھ اسے خدا حافظ کہا تھا۔



سفیر نے ٹورنٹو پہنچتے ہی اپنی خیریت کا فون کیا تھا۔ زرینہ آنٹی اور اس سے اس نے بہت مختصر سی گفتگو کی

ظفر واپس جانے والا تھا۔ وہ بھائی کے ساتھ ایک دو گز اڑنا چاہتی تھی۔ زرینہ آئی نے اسے بخوشی میکے کی اجازت دے دی۔ ظفر کے جانے میں ابھی دو تھے۔ عاصمہ بہت چپ چپ نظر آ رہی تھی۔

”اتنا عجیب لگ رہا ہے صبا! ظفر کے جانے کا سوچ کر ہیرا رہا ہے۔ تمہیں بھی اس طرح کی فیلنگز ہوتی گی سفیر کے جانے پر۔“ عاصمہ نے اس سے کہا تو نے اقرار میں گردن ہلا دی۔

”فطری بات ہے نا بھابھی! جس شخص سے آپ کا نہ جڑا ہے اس کا دور جانا اچھا کیسے لگ سکتا ہے۔“ وہ شام کو آئی تھی۔ شام سے لے کر رات گئے تک ظفر، ار ترضی اور عاصمہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔ بابا، ڈیڈی اور ماما نے رات دس بجے تک ان کا ساتھ دیا تھا۔

اگلے روز معاذ کا اسکول کا پہلا دن تھا۔ اس کا جشن صبا کی شادی سے بھی کافی دن پہلے ہو چکا تھا۔ نے معاذ کو بڑی خوشی خوشی اسکول کے لیے تیار کیا۔ کے لیے اپنے ہاتھوں سے ناشتا بنایا۔ رات دیر جاگنے کے باوجود وہ سب لوگ معاذ کو خدا حافظ کے لیے جلدی اٹھ گئے تھے۔ سارا گھر اس کے پیچھے تھا۔ وہ خود بھی اسکول جانے پر بہت خوش اسی خوشی میں اس نے ناشتہ بھی روزانہ کی طرح بے بغیر کر لیا تھا۔ ار ترضی اسے چھوڑنے جا رہا تھا۔

”سب کو سلام کرو اور پیار کروا کر آؤ۔“ ار ترضی اس کا ہیک ٹیبل پر سے اٹھاتے ہوئے اسے سمجھایا ہاگتا ہوا پہلے ڈیڈی کے پاس گیا۔ انہوں نے جھک سے پیار کیا، دعا میں دیں پھر وہ بابا کے پاس آیا۔ نے اسے گود میں اٹھالیا۔

”اپنے پاپا جیسے آوٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ بننا، بلکہ سے بھی زیادہ۔ سب سے زیادہ۔“ بابا کی گود سے وہ ان کے برابر میں کھڑے ظفر کے پاس آ گیا تھا۔ پہلے ماما کے پاس جاؤ۔“ ظفر نے اسے سمجھایا۔ وہ گر صوفے پر بیٹھی ماما کے پاس آ گیا۔ ماما کی

آنکھوں میں اُسو تھیں۔ اسے اپنے میکے سے الگ کرنا کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے بڑی تیزی سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ار ترضی فوراً ان کے پاس آیا تھا۔ ”مما! پلیز اس طرح مت کریں۔ آج معاذ کی تعلیمی زندگی کا پہلا دن ہے، آپ اسے دعا میں دیں۔“ اس نے ان کے کندھے پر بڑی محبت سے اپنا ہاتھ رکھا تھا۔



ظفر چلا گیا تو وہ واپس اپنے سسرال آگئی تھی۔ سفیر نے اس ایک فون کے بعد دوبارہ فون نہیں کیا تھا۔ زرینہ آئی کو اس کا فون نہ آنے پر بہت تشویش تھی۔ اسے گئے دس دن ہو چکے تھے، شروع کے چار پانچ دن اس کی کال کا انتظار کرنے کے بعد انہوں نے خود ہی اسے گھر پر فون کیا مگر وہ گھر پر ملا نہیں پھر اس کا فون آگیا تھا مگر یہ فون صبا کے لیے تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے، جب اس کے کمرے میں فون کی بیل بجی تھی۔

اس نے ریسپور اٹھایا تو دوسری طرف سفیر تھا۔ ”آپ اتنے دنوں سے کہاں ہیں؟ یہاں پر سب آپ کی طرف سے بہت فکر مند ہیں۔“ اس کی آواز سنتے ہی صبا نے کہا۔

”یہیں ہوں، مجھے کہاں جانا ہے اور جو میرے لیے فکر مند ہیں ان سے کہو، میرے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”کیا ہوا سفیر! آپ سمیعہ سے ملے؟“ اس کا سوال سن کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”میں بہت پریشان ہوں صبا! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا کروں۔ سمیعہ مجھ سے بہت بری طرح ناراض ہو گئی ہے۔“ وہ بہت مایوس اور پریشان لگ رہا تھا۔

”آپ فکر نہیں کریں، وہ آہستہ آہستہ ساری بات سمجھ جائے گی۔ اسے آپ کی مجبوری کا اندازہ ہو جائے گا۔ آپ اسے تھوڑا سا وقت دیں۔“ اس نے اسے تسلی دینی چاہی تو وہ جواباً ”غصے سے بولا۔

”بات تو وہ تب سمجھتی اگر میری کوئی بات اس نے

سنی ہوئی۔
کر رہی۔
نہیں۔ اس
بات کا
کسی بھی
ہے، اپنے
کماں ملو
”وہ
کی جاتی
جاسکتا۔
سے اعتما
ایکٹ کر
ناراض
کے عذر
معذرت
انتظار کر
نے اس
مطمئن
”تم
نہیں
چار منہ
صبح
فون
”وہ
نہیں
سکون
انہیں
اتنے
نہیں
آ
ساتھ
نظر

سنی ہوئی۔ وہ نہ مجھ سے مل رہی ہے نہ فون پر بات کر رہی ہے۔ اسے میری کسی مجبوری سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے نزدیک مجھ سے ناراض ہونے کے لیے بات کافی ہے کہ میں شادی کر کے آیا ہوں، چاہے کسی بھی وجہ سے۔ وہ میری آواز سن کر فون بند کر دیتی ہے، اپنے گھر میں مجھ سے ملنے سے انکار کر دیتی ہے، اپنے آفس جانا اس نے چھوڑا ہوا ہے۔ میں اس سے کہاں ملوں، کیسے اپنی پوزیشن کلیئر کروں۔“

”وہ آپ سے محبت کرتی ہے سفیر! جن سے محبت کی جاتی ہے پھر ان سے زیادہ عرصہ ناراض نہیں رہا جاسکتا۔ اسے آپ پر بہت اعتماد تھا، ابھی چونکہ اس کے اعتماد کو نہیں پہنچتی ہے، اس لیے وہ اس طرح رہی ایکٹ کر رہی ہے مگر وہ زیادہ دنوں تک آپ سے ناراض رہ نہیں پائے گی۔ وہ آپ کی مجبوری اور آپ کے عذر کو قبول کرتی ہے یا نہیں، بہر حال وہ آپ کی معذرت کو ضرور قبول کر لے گی۔ آپ تھوڑے دن انتظار کریں، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو صبا! مجھے اس طرح مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“ اس کے بعد اس نے مزید تین چار منٹ اس سے بات کی اور پھر فون بند کر دیا تھا۔ صبح اس نے ناشتے کی میز پر زرینہ آنٹی کو سفیر کے فون کے بارے میں بتایا۔

”وہ آفس میں تھوڑے بڑی تھے، اس وجہ سے فون نہیں کر رہے تھے۔“ بیٹے کی خیریت کی اطلاع ملنے پر سکون اور اطمینان محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اس بات سے تھوڑی سی تکلیف بھی پہنچی کہ اتنے دنوں بعد اس نے فون کیا تو اپنی بیوی کو، ماں کو نہیں۔



آنٹی کئی سالوں سے اپنا ذاتی اسکول بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہی تھیں۔ شادی کی مصروفیات کے پیش نظر انہوں نے اسکول جانا چھوڑا ہوا تھا مگر اب وہ دوبارہ

اسکول جانے لگی تھیں۔

جب سے انہوں نے اسکول جانا شروع کیا تھا، وہ گھر میں اکیلی بہت بوریٹ محسوس کر رہی تھی۔ آنٹی تین بجے واپس آئیں۔

”تم کھانا کھا لیتیں۔ میرے انتظار میں بھوکے کیوں بیٹھی رہیں۔“ ان کا موڈ صبح کی بات پر آف تھا مگر پھر بھی انہوں نے اس سے پیار سے ہی بات کی تھی۔

”آنٹی! اکیلے کھانا کھانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔“

اس نے اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے انہیں جواب دیا۔ طلحہ میڈلسن بڑھ رہا تھا۔ اس کے آنے جانے کے کوئی اوقات مقرر نہیں تھے، اسی وجہ سے وہ ان لوگوں کے ساتھ لنچ پر موجود نہیں تھا۔ لنچ کے دوران ہی اس نے آنٹی سے اپنی بوریٹ کا ذکر کیا۔ انہوں نے اس کا مسئلہ بڑی سنجیدگی اور توجہ سے سنا پھر کچھ سوچ کر اس سے بولیں۔

”تم میرے ساتھ اسکول چلا کرو۔ کہیں جاب کرنے سے بہتر یہ نہیں کہ اپنا اسکول سنبھالنے میں میری مدد کرو۔“

”ٹھیک ہے آنٹی! میں کل سے آپ کے ساتھ چلوں گی۔“ اور پھر اگلے روز سے وہ ان کے ساتھ اسکول جانے لگی۔

گھر پر ممانا وغیرہ نے بھی اس کے اس اقدام کو بہت سراہا تھا۔ خاص طور پر ار تضحیٰ نے اس کی بہت حوصلہ افزائی کی تھی۔

”نائن ٹو فائیو والی جاب کے مقابلے میں یہ کام بہت بہتر ہے۔ ہمارے کچر میں لڑکیوں کے لیے پینچنگ سے اچھا کوئی پروفیشن نہیں ہو سکتا۔“ سفیر کی فون کالز آرہی تھیں مگر بہت مختصر۔ وہ اپنے مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔ زرینہ آنٹی سے بھی وہ بہت مختصر گفتگو کیا کرتا تھا۔

وہ مزید بات کرنے کے لیے تڑپتی ہی رہ جاتی تھیں اور وہ ”اچھا ممی! خدا حافظ“ کہہ کر فون بند کر دیتا۔ اس نے صبا کو پیسے بھیجے تھے۔ اگرچہ وہ یہ بات جانتا تھا کہ اسے اس کے پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ ممی، بابا اس کی ہر ضرورت بہت اچھی طرح پوری کر سکتے تھے مگر شاید

وہ اپنی ذمہ داری نبھانا چاہتا تھا۔ وہ اس کے پیچھے بھیجنے پر اتنی خوش نہیں ہوئی تھی جتنا نکل ہوئے تھے۔



ظفر کے جانے کے چھ مہینے بعد عاصمہ بھی اس کی پاس چلی گئی تھی۔ عمامہ اور ڈیڈی بسو کے جانے پر اس کو تو ہوئے تھے مگر انہیں اس بات کی بھی خوشی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے پاس جا رہی تھی اور اسے اس کے پاس رہنا چاہیے تھا۔

وہ ہر ویک اینڈ اپنے میکے میں گزارتی، باقی سارا ہفتہ اس کا اسکول کی مصروفیت کی نذر ہو جاتا تھا۔ اس دوران صرف فون پر گھر والوں سے بات ہوتی یا ان لوگوں میں سے کوئی اس سے ملنے آ جاتا لیکن چھٹی کا دن وہ وہیں پر گزارتی تھی۔ معاذ اس بات پر سمجھوتا کر چکا تھا کہ اب ہالہ جانی (خالہ) اس کے ساتھ نہیں رہیں گی مگر جب وہ گھر آئی تو وہ اس سے اسی والہانہ انداز میں ملتا۔ اپنے اسکول کی ایک ایک بات اسے بتاتا۔ وہ اس سے فرمائشیں کر کر کے مختلف پونمز سنتی۔ وہ اس سے اپنی ضدیں پوری کرواتا، رات کو اس کے پاس سوتا۔ ماما کہتی تھیں اس کے آنے پر معاذ اتنا ضدی اور بدتمیز ہو جاتا ہے، ورنہ باقی سارا ہفتہ وہ بہت اچھا بچہ بنا رہتا ہے۔ ارٹھنی نے اس کے لیے ایک گورنس رکھ لی تھی۔ ماما اس کی ضد کے آگے چپ تو ہو گئی تھیں مگر پھر بھی وہ معاذ کے زیادہ تر کام خود ہی کیا کرتی تھیں۔



سفیر کا بہت دنوں سے فون نہیں آیا تھا۔ گھر میں سب ہی کو اس کے فون نہ کرنے پر تشویش تھی۔ وہ خود نہ گھر کے فون پر نہ موبائل پر وہ کہیں نہیں مل رہا تھا۔ وہ گھر پر نہیں ملا تو آفس فون کیا گیا۔ وہاں سے پتا چلا کہ وہ آج کل چھٹیوں پر ہے۔ اس خبر سے سب کی تشویش مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ چھٹیوں پر تھا اور گھر پر موجود نہیں تھا۔ یعنی وہ کہیں گیا ہوا تھا مگر کہاں؟

سب سفیر کی طرف سے پریشان تھے اس نے

اسے E-mail بھیجی۔ یہ سوچ کر کہ وہ کہاں کہیں بھی ہے کم از کم اپنی Mails تو ضرور چیک کرتا ہوگا۔

”سفیر! آپ کہاں ہیں؟ ہم سب آپ کے لیے بہت پریشان ہیں۔“ اس کا پیغام بہت مختصر سا تھا۔ اس کا جواب تیسرے دن سفیر کی فون کال کے ذریعے موصول ہو گیا تھا۔

”شکر آپ ملے تو۔ ہم لوگ بہت پریشان ہو گئے تھے۔“ اس کی آواز سنتے ہی وہ بولی وہ جواباً خاموش رہا تھا۔

”آپ تھے کہاں؟“ اس نے مزید پوچھا تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

”میں نے اور سمیعہ نے شادی کر لی ہے۔ ایک مہینہ ہو گیا ہماری شادی کو۔ ہم دونوں ہنی مون کے لیے یورپ گئے ہوئے تھے۔ کل ہی واپس آیا ہوں۔ ابھی ابھی تمہاری mail پڑھی تھی۔ اسی لیے فون کیا ہے۔“

”آپ دونوں کی شادی ہو گئی، زبردست یہ تو بہت ہی اچھی خبر ہے۔ بہت مبارک ہو۔ سمیعہ کو بھی میری طرف سے مبارکباد دیجئے گا۔ دیکھیں میں نے آپ سے کہا تھا نا وہ زیادہ دنوں تک اپنی ناراضی برقرار نہیں رکھ پائے گی۔ اسے ماننا ہی تھا اور وہ مان گئی۔“ اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اسے مبارکباد دی تھی۔ وہ جواب میں ایک مرتبہ پھر خاموش رہا۔

”کیا ہوا آپ خاموش کیوں ہیں؟“

”صبا! تم اتنی اچھی مت بنا کرو۔ مجھے تم سے شرمندگی ہونے لگتی ہے۔“ وہ جھنجھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

وہ اس کے لہجے پر کچھ حیران سی ہوئی۔

”اچھا سنو، اب تم مجھے گھر پر فون مت کرنا۔ میں نے تمہیں سمیعہ کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ میرے بارے میں بہت پوزیٹو ہے۔ تمہارا فون آیا تو اسے بہت برا لگے گا۔ مجھے E-mail بھیجنا۔ اسے میرا Password پتا ہے، میں اس سے اپنی کوئی چیز نہیں چھپاتا۔ اگر اس نے تمہاری mail دیکھ لی تو مجھے

بہت پر اہم ہو جائے گی۔ ابھی بھی تمہاری mail میں نے پڑھتے کے ساتھ ہی Delete کر دی ہے۔ کبھی کوئی بات ہو تو تم مجھے آفس فون کر سکتی ہو۔ وہ کبھی کوئی بہت خاص بات ہو تب ڈرنہ میں خود ہی تمہیں فون کیا کروں گا۔ اس کا لوجہ شینسی اور دو ٹوک قسم کا تھا۔

”آپ فکر مت کریں۔ میں نے پہلے ہی آپ سے کہا تھا کہ میری وجہ سے آپ دونوں کی زندگی میں کوئی رابلنٹ نہیں آئیں گی۔“ اس نے ایک بار پھر اسے یقین دہانی کروائی تھی۔

”ٹھیک ہے پھر میں فون بند کر رہا ہوں۔ کل یا برسوں میں تمہیں پیسے بھی بھیج دوں گا۔ خدا حافظ۔“ اس کا جواب سننے بغیر اس نے فون بند کر دیا تھا۔

وہ کمرے سے باہر نکل کر لاؤنج میں آئی تو زبینہ آئی اور انکل وہاں بیٹھے نظر آئے۔ وہ دونوں سفیر کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اس کی اتنی طویل کم شدگی ان دونوں کے لیے بہت پریشان کن تھی۔

”آؤ بیٹا! انکل اسے دیکھ کر شفقت بھرے انداز میں مسکرائے۔ وہ ان دونوں کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔

”سفیر کا فون آیا تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے۔“ اس اطلاع پر ان دونوں کا چو نکنا لازمی تھا۔

”کہاں غائب تھے حضرت اتنے دنوں سے تم نے پوچھا نہیں؟“ انکل اس کی خبر ملنے پر قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولے۔ آئی بیٹے کی خیریت پوچھنے کے بجائے بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔

سفیر اور صبا کی شادی شدہ زندگی کے اس گیارہ ماہ کی مختصر مدت میں یہ دوسرا موقع تھا جب انہیں صبا سے ساسوں والی رویتی جیلسی ہوئی تھی۔ بیٹے نے اتنے دنوں کی غیر حاضری کے بعد انہیں فون کرنے اور اپنی خیریت سے آگاہ کرنے کے بجائے اپنی بیوی کو فون کرنا پسند کیا تھا۔

”وہ ٹورنٹو میں نہیں تھے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”یہ کہے سنے بغیر غائب ہونے کی اچھی عادت ہے۔ تم نے اسے کچھ کہا بھی کہ خاموش رہیں؟“ وہ بیٹے سے

خفا نظر آئے۔

”انہوں نے سمیعہ سے شادی کر لی ہے۔ وہ دونوں گھومنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔“ اس نے اسی پرسکون لہجے میں انہیں یہ خبر سنائی۔

”کون سمیعہ؟“ آئی نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔

جب کہ انکل ایک دم صوفے پر سے اٹھ گئے۔ تقریباً چلاتے ہوئے انہوں نے ”کون سمیعہ؟“ کہا تھا۔

”سمیعہ! مارگریٹ وہ مسلمان ہو گئی ہے۔ اب اس کا نام سمیعہ ہے۔“

وہ چند لمحوں پہلے اس لڑکی سے حسد کر رہی تھیں اور اب وہ خود میں اس سے نگاہیں ملانے کی ہمت نہیں پا رہی تھیں۔ انکل کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ بہت نڈھال سے انداز میں وہ صوفے پر گر گئے۔ آئی کی طرح انہوں نے بھی اس سے نظریں نہیں ملائی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بالکل چپ بیٹھے تھے۔ (باقی آئندہ)

زی ٹی وی کا مشہور پروگرام

کھانا خزانہ

نیا ایڈیشن

سنجیو کپور

خوبصورت تصاویر کے ساتھ

حسین و خوبصورت گیٹ اپ

قیمت صرف = 250 روپے

ملنے کا پتا:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی

بالآخر غم اور رنج کی شادی ہو گئی۔ اور صبا اپنے جذبات کا گنا گھونٹ کر خاموش ہو گئی۔ وہ احتجاج بھی نہیں کر سکی۔ اس لیے کہ اگر غم نے ہی اسے قابلِ توجہ نہیں سمجھا تھا۔ وہ اسے چھوٹی بچی ہی سمجھتا رہا۔ جبکہ وہ اپنی عمر سے کہیں گہرے کا سفر طے کر چکی تھی۔ شادی کی رات، جذبات کی شدت میں بے اختیار غم کے مرے کی دُعا مانگی۔ شادی کے بعد غم اور رنج کی لاہور چلے گئے۔ غم اپنے اپنی خوشیوں کی سب سے بڑی دشمن نظر آتی ہے اور پھر جھینوں میں اسے بادل خواستہ سب کے اصرار پر غم کے پاس لاہور آنا پڑا۔

۳

تیسری قسط

وہ آئی کی صدمے اور غم نے غصہ کا تانہ انداز کرتے ہوئے فوراً ہی ان کے لیے پالی لے آئی تھی۔

”آئی پالی پی لیں۔“ اس نے گلاس ان کے لبوں سے لگایا۔

”آپ حوصلہ کریں آئی! یہ شادی سفیر کو لادی کرنا تھی۔ جو چیز ہونے لگی اس کے ہوجانے پر غموس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”سفیر نے اچھا نہیں کیا بالکل اچھا نہیں کیا۔ صبا! ہمیں صاف کرو۔ ہم نے تمہارے ساتھ بہت بڑی قربانی کر ڈالی ہے۔“ وہ اسے اپنے گلے سے لگا کر روئے لگیں۔

”سب ان کی وجہ سے ہوا ہے“ ان کی ضد اور غصے کی وجہ سے۔ اولاد کو اپنی رعایا سمجھتے ہیں۔ مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں ان کا ساتھ دوں۔ یہ نہیں سوچا کہ وہ بیٹا بھی تو آخر ان ہی کا ہے۔ کیا اس میں ان جیسی ضد اور غصہ نہیں ہو گا۔ ان کی ضد اور غلط فیصلے نے ہم سب کو تو نقصان پہنچایا ہی ہے۔ مگر سب سے زیادہ تمہارا نقصان ہوا ہے۔ تمہارے ماں باپ کو کیا منہ دکھاؤں گی میں صبا! بڑے دھمکے کر کے لالی تھی تمہیں۔ ان کے پاس سے بہت وعدے کیے تھے۔ یہ تھا وہ سب۔“ انہوں نے اسے خود سے دور ڈالتے ہوئے اس بات پر غور کیا۔

ایک اندر وہ ہمیشہ کی طرح اپنے سیکے جانے لگی تو

”ہاں“ ہم دونوں بھی بالکل خیریت سے ہیں۔“ وہ شاید اب فون بند کرنا چاہ رہا تھا اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے اس نے جلدی سے یہ سوچ کر کہ مجھ وہ چاہیں کب فون کرے جلدی سے پوچھا۔

”آپ دونوں نے کراچی گئے کے بارے میں کیا سوچا؟“

”نی الحال کافی طویل عرصہ تک ہمارا کراچی آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بہت صاف اور دو ٹوک انداز میں انکار کیا تھا۔ وہ اس کا لڑا واضح انکار سن کر سن رو گئی تھی۔ وہ اس سے وعدہ کر کے گیا تھا کہ ضرور واپس آئے گا اور اس نے اسے ایک مرتبہ یہ بھی بتایا تھا کہ وہ وعدے سے بچنے والا انسان نہیں ہے۔

”لیکن آپ نے تو کہا تھا؟“ بہت ہی مرہ لہجے میں اس نے بولنے کی کوشش کی مگر سفیر نے اس کی بات سنی ہی کٹ دی تھی۔

”ہاں مجھے یاد ہے کہ میں نے کیا کہا تھا۔ اس وقت میرا ارادہ بھی تھا آنے کا۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ مگر سید پاکستان آنے کے لیے تیار نہیں۔ میں نے اس سے محبت کی ہے میں اس کا دل دکھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر کبھی وہ خوشی سے راضی ہو گئی تو ہم لوگ پاکستان آجائیں گے۔ ورنہ جہاں وہ رہنا چاہے میں وہیں اس کے ساتھ رہوں گا۔“ اس کا لہجہ بہت مستحکم اور دو ٹوک تھا۔

اسے سفیر کے فون کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چار دن بعد ہی اس کا فون آگیا تھا۔ وہ آئی سے بات کرنا چاہتا تھا مگر وہ اس سے سخت ناراض تھیں سو انہوں نے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ فون چمکے اس نے ہنس کر کہا تھا۔ اس لیے سفیر تک آئی کا انکار بھی اسے نہ پہنچا تھا۔

”آئی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ لیٹی ہوئی ہے۔ آپ بعد میں فون کر لیجئے گا۔“ اس نے براہ راست یہ کہنے کے بجائے کہ وہ اس سے ناراض ہیں اور بات نہیں کرنا چاہتیں۔ محول جواب دیا تھا۔

”اب بھی وہ ساری بات سمجھ گیا تھا۔“

”متم شوا کہی ہو؟“ اس بارے میں مزید کوئی بات نہ بغیر اس نے معمول کے انداز میں اس کی خیریت پوچھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ اور سید کیسے ہیں؟“

اس نے بھی جواباً ”خیریت پوچھی تھی۔“

”ہاں“ ہم دونوں بھی بالکل خیریت سے ہیں۔“ وہ شاید اب فون بند کرنا چاہ رہا تھا اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے اس نے جلدی سے یہ سوچ کر کہ مجھ وہ چاہیں کب فون کرے جلدی سے پوچھا۔

”آپ دونوں نے کراچی گئے کے بارے میں کیا سوچا؟“

”نی الحال کافی طویل عرصہ تک ہمارا کراچی آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بہت صاف اور دو ٹوک انداز میں انکار کیا تھا۔ وہ اس کا لڑا واضح انکار سن کر سن رو گئی تھی۔ وہ اس سے وعدہ کر کے گیا تھا کہ ضرور واپس آئے گا اور اس نے اسے ایک مرتبہ یہ بھی بتایا تھا کہ وہ وعدے سے بچنے والا انسان نہیں ہے۔

”لیکن آپ نے تو کہا تھا؟“ بہت ہی مرہ لہجے میں اس نے بولنے کی کوشش کی مگر سفیر نے اس کی بات سنی ہی کٹ دی تھی۔

”ہاں مجھے یاد ہے کہ میں نے کیا کہا تھا۔ اس وقت میرا ارادہ بھی تھا آنے کا۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ مگر سید پاکستان آنے کے لیے تیار نہیں۔ میں نے اس سے محبت کی ہے میں اس کا دل دکھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر کبھی وہ خوشی سے راضی ہو گئی تو ہم لوگ پاکستان آجائیں گے۔ ورنہ جہاں وہ رہنا چاہے میں وہیں اس کے ساتھ رہوں گا۔“ اس کا لہجہ بہت مستحکم اور دو ٹوک تھا۔

اپنے وعدے سے سکر جانے پر قلعا ”کوئی تسمف اس لیے میں نہ تھا۔ اپنی بات مکمل ہوتے ہی اس نے بغیر خدا حافظ کے فون بند کر دیا۔ وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

اس نے بابا کے استفسار پر سفیر کی واپسی میں چار مہینے بعد کی بتائی تھی۔ جب کہ یہاں تو سات مہینے گزر چکے تھے۔ یعنی اس کی شادی کو ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ اس کے ہر چکر پر بابا ٹیڈی یا ماماں سے کوئی نہ کوئی

انہیں تو میرا خیال ہے بابا سے بھی زیادہ خوشی ہوگی۔ اور رہا ہوں کہ کہیں وہ خوشی سے پاگل ہی نہ ہو جائیں۔" وہ گھر کی طرف جانے والے راستے پر دو الگ دو الگ بڑے ہلکے پھلکے انداز میں بول رہا تھا۔

اس کے پورے جسم پر کچھ پائٹ طاری تھی، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔

"میں گھر نہیں جاؤں گی ار تفتی بھائی! پلیز مجھے گھر مت لے کر جائیں۔" سٹیٹنگ پر رکھے اس کے ہاتھ پر اس نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھ کر چلائے ہوئے کہا۔ وہ نما ڈیڈی، بابا کی کاسا سنا نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے اپنے ہاتھ پر رکھا اس کا ہاتھ بڑے غصے سے جھٹک کر رو رہا تھا۔

"کیوں نہیں جاؤ گی تم گھر؟ اپنی آنکھوں سے دیکھنا سارا قحط۔ بہت مڑا آئے گا تمہیں۔" وہ سرد آواز میں بولا۔ ار تفتی نے گاڑی گھر کے پورچ میں لا کر روکی، بہت تیزی سے وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور پھر اس کی طرف اگر اسے ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے اتارا اور ٹھیکتا ہوا اندر لے آیا تھا۔ ان کے اندر قدم رکھتے ہی سب کا موبائل بجا تھا۔ ار تفتی نے اس کا بیگ چھیننے والے انداز میں اس کے ہاتھ سے لیا اور پھر اس میں سے موبائل نکال کر اسے آف کر دیا۔ لاؤنج خالی رہا تھا۔ شاید مہمان کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں اور معاذ بھی سو رہا تھا۔

اس کے بیٹھنے کے چند سیکنڈز بعد ہی لاؤنج میں رکھے فون کی کھنک بجی تھی۔

"جی صبا میرے ساتھ آئی ہے۔" ار تفتی کل ریپو کر رہا تھا۔

"مجھے پتا تھا آپ کی کل ہے، اسی لیے میں نے موبائل آف کر دیا تھا۔" اس کا انداز گستاخانہ تھا۔

"وہ نہیں پرے گھر آپ سے بات نہیں کرے گی۔ بہتر ہوگا اگر آپ کچھ دنوں تک یہاں رابطہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہم آپکی میں گفتگو کریں پھر آپ سے بات ہوگی۔" بہت درختی سے انہیں جواب دیتے ہوئے اس نے ریپو سن ڈیا۔

وہ صوفے پر گر سی گئی۔ اسے سانس لینے دشواری ہو رہی تھی۔

"کیا لگتا تھا تمہیں؟" وہ رات کب تک چلا تھیں تم؟ کیا ہم لوگ تمہیں احقر اور پاگل نظر آتے؟ یا اتنے لاچار کہ گینڈا نہ جاسکتے ہوں۔" انداز ترک کر کے اب وہ براہ راست غصے کا انداز تھا۔ وہ صوفے سے نیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

انس لینے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ ار تفتی ایک اس پر ڈالتے ہوئے اٹھا، اس نے اسے سی آن کہا۔ ریٹناں کو آواز دے کر بلایا۔

"ایک گلاس جوس لے کر آؤ، فوراً۔" آنکھیں بند کیے ار تفتی کی تشویش میں ڈوبی آواز دی۔ پھر اسے جلد ہی ریٹناں کی آواز آئی۔ وہ گلاس ار تفتی کو دے رہی تھی۔

"جوس پیو۔" وہ اس کے برابر میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ اس کی آواز میں رہی تھی۔ اس کے لیے ابھی بھی غصہ اور ناراضی تھی، مگر اس غصے کے پیچھے چھپی ہوئی تشویش بھی محسوس کی جاسکتی تھی۔ اس نے گلاس اس کے منہ سے لگا دیا تھا۔ زبردستی کے منہ میں جوس اندر مل رہا تھا۔ اس نے کوئی مزاح نہیں کی تھی۔ وہ جوس پینے لگی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیے ہوئے وہ پورا گلاس خالی کر چکی تھی۔

"مگر اٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تو ہمیں بس لے جاؤ تو کچھ دیر سو جاؤ۔ خود کو تیار کر لو آتے والے وقت کے لیے۔ جو کچھ ہوئے والا ہے وہ تو تمہیں ہر ملے فیس کرنا ہی ہے۔" وہ بے رخی سے اسے مشورہ ہوا لاؤنج سے نکل گیا تھا۔

وہ ماما اور ار تفتی کے ساتھ بیٹھی شام کی چائے پینے لگی۔ جب بابا اور ڈیڈی گھر آئے ڈیڈی کی ایک نظر ڈالتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ بابا سب کچھ بتا چکے ہیں۔ اس نے ڈیڈی کی آنکھوں میں اس سے پہلے ایسا کرب اور ایسی تسکین کب تھی؟ شمن کی موت پر پہلی شمن کی موت پر اس

ان کا اتنا ہی اندھا حال اور ٹوٹا ہوا دل تھا۔ وہ خشک اور لاپرواہ لگتا تھا۔ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماما کی طرف تشویش سے دیکھ رہی تھیں۔

اس میں ذرا طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ فکر کی بات نہیں ہے۔ تھوڑی دیر ریٹ کر کے گاتو سے منسلک جائے گی۔ ڈیڈی کی جگہ بابا نے ماما کو لے لیا تھا۔

ڈیڈی نے بھی زبردستی مسکرا کر اپنی طبیعت کے لیے اس کی فکر مندی اور کی اور پھر اپنے کمرے چلے گئے۔ ماما بھی ان کے پیچھے کمرے میں چلی گئیں۔

ڈیڈی ہو صبا؟ بابا اسے پہلے ہی دیکھ چکے تھے مگر اب کیا تھا۔ ان کا لہجہ ار تفتی کی طرح طنزیہ تھا۔ ماما ہوا نہیں تھا۔ اس میں ویسی ہی محبت تھی جیسے ہوا کرتی تھی۔

بابا! وہ بابا! اس کی نظریں جھٹک گئی تھیں۔ اس نے چائے کے ٹھونٹ لیتے ہوئے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

ایک رات کے کھانے تک اپنے کمرے ہی میں تھے۔ ماما نہیں سوتا دیکھ کر تھوڑی دیر بعد وہیں پہنچیں۔ آٹنی تھیں۔ بابا بھی وہیں آکر بیٹھ گئے۔ وہ دراصل انداز میں ماما اور صبا سے باتیں کر رہے تھے۔ اسی طرح صبا بھی وہ لوگ، ہمیشہ آپس میں کیا کرتے تھے۔ وہ چپ بپ بھی مگر بابا زبردستی اسے کر کے بولنے پر مجبور کر رہے تھے۔ معاذ کی نظر ہاتھ میں لیے اپنی اسپورٹس کار اڑاتا تھا۔ ار تفتی کے کوئی مہمان آئے ہوئے تھے وہ روم میں بیٹناٹن سے باتیں کر رہا تھا۔ کھانے کے پہلے اس کے مہمان وہاں گئے تھے وہ سب کچھ بیکل پر اسی کا انتظار کر رہے تھے وہ فون کی بیل بجنے پر رک گیا۔

اب آج زحمت مت کیجئے کسی اور دن اسے کھائے گا۔ آج ہم لوگ بہت مصروف ہیں۔" بہت مت مذہبانہ ہونے کے باوجود گستاخی کا عنصر

لیے ہوئے تھا۔ ڈائٹنگ روم میں وہ سب اس کی آواز سن رہے تھے۔ سوائے ماما کے وہ سب جانتے تھے کہ وہ اس وقت کس سے بات کر رہا ہے۔ ماما معاذ کی پلیٹ میں کھانا ڈالنے میں مصروف تھیں۔

کھانے کے بعد ان سب نے ساتھ بیٹھ کر چائے پی۔ معاذ کی گورنر اسے سنانے کے لیے کمرے میں لے گئی تو ماما بھی ان لوگوں کو شب بخیر کہتی اس کے ساتھ چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد لاؤنج میں وہ چاروں رہ گئے تھے۔ وہ تینوں بالکل خاموش تھے، ان سب کو ماما کے سو جانے کا انتظار تھا۔ کچھ دیر بعد جب ار تفتی کو یقین ہو گیا کہ وہ سو گئی ہوں گی تو وہ اٹھا اور لاؤنج کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں۔ وہ گم صم سے انداز میں اس کی ساری کارروائی کو دیکھ رہی تھی۔ بابا نے بی بی بند کر دیا۔ ڈیڈی نے اپنے ہاتھوں پر جمی نگاہیں اٹھا کر اتنی دیر میں پہلی مرتبہ صبا کی طرف دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ کرب تھا، اذیت تھی۔ وہ بہت بوڑھے اور کمزور لگ رہے تھے۔

"صبا! مجھے معاف کر دو میں تمہارے لیے درست فیصلہ نہ کر سکا۔ ایک بہترین انسان تمہارے لیے منتخب نہ کر سکا۔ اپنی طرف سے میں نے اور تمہاری ممانے ایک بہترین رشتہ تمہارے لیے چنا تھا۔ ہماری سوچ غلط ثابت ہو گئی۔ خاندان کے لوگوں نے وہ حوا کا کیا کیا کوئی غیروے جگہ اپنے ڈیڈی کو معاف کر دینا۔" وہ آنکھوں میں درد و غم کا طوفان لیے جی سے معافی مانگ رہے تھے۔ اس کی زندگی میں یہ دن بھی آتا تھا کہ ڈیڈی کو اس سے معافی مانگنا پڑی۔ وہ کلپ کر رہی تھی۔

"تمہارا اور بیٹے کا کوئی قصور نہیں ہے تحقیق اسب ماما باپ کی طرح تم دونوں بھی اپنی لولہ کی بہتری ہی چاہتے تھے۔ تم دونوں نے سوچ سمجھ کر ایک بہترین فیصلہ کیا تھا۔ اس رشتے میں ایسی کوئی خالی بظاہر نظر نہیں آ رہی تھی جو انکار کرنے کا سبب بنتی۔ بابا نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مددگار انداز میں انہیں سمجھایا۔

”ہم نہیں سمجھ سکے تھے مگر یہ تو سب کچھ جان چکی تھی۔ اسے شادی کے اول روز سفیر نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا۔ آپ اس سے پوچھیں یہ کیوں خاموش رہی۔ کیوں نہیں ان کا جھوٹ اور دھوکا ہمارے سامنے عیاں کیا۔ کیوں نہیں اسی روز گھر آکر ہمیں بتایا کہ یہ بات ہے ار تفضی نے الزام عائد کرنے والے انداز میں کہا۔“

”محض اس لیے کہ ہمیں دکھ نہ ہو۔ واہ کیا خوب جواز ہے یہ۔ ایسی باتیں کتنے عرصے تک چھپ سکتی ہیں کیا اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ سر جھکا کر خود پر لگنے والے الزامات سن رہی تھی۔“

”ار تفضی! صبا کو یوں مت کہو۔“ بابا نے اسے ٹوکا۔
”میں کیوں اسے کچھ نہ کہوں بابا! آخر کیوں؟ کیا اسے احساس ہے اس بات کا کہ اس نے ہم سب کے ساتھ کیا کیا ہے۔ کیا سمجھتی ہے یہ خود کو؟ کسی المیہ ناول کا مرکزی کردار۔ صبر اور ایثار کا پیکر اسے بتائیں کہ حقیقی زندگی میں اس طرح کی ہیروئیز کو سروں پر بٹھانے کے بجائے پیروں تلے روند ڈالا جاتا ہے۔ بے حد غصے میں تھا۔“

”وہ شخص کس طرح اس کا ذکر کر رہا تھا۔ جیسے یہ زبردستی اس کے سر پر مسلط ہے۔ اور صرف اس کی خواہش پر اس نے یہ رشتہ برقرار رکھا ہوا ہے ورنہ کب کا ختم کر چکا ہوتا۔ کیا اس کے اندر عزت نفس اور خودداری بالکل ہی ختم ہو گئی ہے۔ اسے سفیر کے ساتھ اتنا شرمناک معاہدہ کرتے ہوئے ذرا سی بھی بے عزتی محسوس نہیں ہوئی۔ ان لوگوں نے اگر ہمیں دھوکا دیا ہم سے جھوٹ بولا تو اس نے بھی ان کی پوری پوری مدد کی ہے۔ یہ اگر اسی روز سب کچھ بتا دیتی تو پتا چلتا انہیں کہ کسی کی بیٹی کی زندگی سے کھیل کر انہوں نے خود اپنی عزت کو داؤ پر لگایا ہے۔“ وہ مخاطب بابا سے تھا مگر دیکھ اسی کو رہا تھا۔

”جو ہونا تھا وہ ہو چکا ار تفضی! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ صبا کو ہمارے علم میں ساری بات لانی چاہیے تھی۔“
”صبا! تم نے یہ سب چھپا کر صرف خود پر ہی ظلم

نہیں کیا، ہم سب پر بھی ظلم کیا ہے۔“ ڈیڈی نے اس کی طرف بہت دکھ سے دیکھا تھا۔ ان کی آواز بھرا ہوئی تھی۔ اس نے بابا کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

”اس نے ہم میں سے کسی کے بارے میں نہیں سوچا۔ کیا اس کی زندگی صرف اسی کی ہے کہ یہ اس کے ساتھ جو مرضی سلوک کرتی پھرے۔“ بابا سے کہنے لگے ہوتے وہ اب براہ راست اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کسی شخص کی زندگی صرف اسی کی زندگی نہیں ہوتی صبا شفیق! اس ایک زندگی کے ساتھ دوسری بھی سی زندگیاں بھی جڑی ہوتی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ تم اپنے لیے کوئی دکھوں سے بھرا ہوا راستہ چن لو اور ہم میں سے کسی کو کوئی فرق نہ پڑے۔ تم اپنے لیے ذلت بھری زندگی کا انتخاب کرو اور ہم سکون سے رہ لیں۔ کسی جگہ تمہاری تذلیل ہو تو وہ تذلیل صرف تمہاری نہیں ہوگی ہماری بھی ہوگی۔ اور صبا اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ میں کسی جگہ پر بے عزت ہوا تھا۔“

اس کی آواز میں دکھ بولنے لگے۔ وہ ایک دم ہی صوفے پر سے اٹھ کر لاؤنج سے باہر نکل گیا تھا۔

ساری رات وہ بابا اور ڈیڈی وہیں بیٹھے رہے تھے۔ فجر کی اذان سن کر ڈیڈی وہاں سے اٹھے ان کے جانے کے بعد بابا بھی صوفے پر سے اٹھنے لگے تو اس نے ان کا بازو پکڑ لیا۔ وہ چونک کر اس کی طرف ملے۔
”بابا! میں علیحدگی نہیں چاہتی، آپ لوگ پلیز صبا گھر بسا رہنے دیں۔“ وہ ان کا بازو جکڑے التجا کر رہی تھی۔ لاؤنج کے اندر قدم رکھتے ار تفضی نے اس کی بات سن لی تھی اور زندگی میں پہلی مرتبہ اس کا دل ہلا کہ وہ صبا کے منہ پر کھینچ کر پھٹ مارے۔ بابا وہاں سے صوفے پر بیٹھ گئے۔

”بیٹا! ہر اچھی لڑکی اپنا گھر پسانا چاہتی ہے۔ کوئی لڑکی خوشی سے ایسا فیصلہ نہیں کرتی۔ نہ ہی ماں باپ کو اس سے ایسا چاہتے ہیں۔ مگر کوئی ایسی بات تو ہونے چاہیے کہ سمجھوتے کے بارے میں سوچا جاسکے۔“

گھر شوہر سے ہوتا ہے تمہارا شوہر تمہارے پاس

نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہو گا۔ جب گھر بڑھی نہیں تو اس کے اچھڑنے پر غم کیسا؟" ار تفضلی خاموشی سے لاؤنج سے واپس پلٹ گیا۔ وہ صبا کے رویے کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

اسے احساس ہو گیا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو صبا کے اس رویے کا سبب ہے۔ کوئی بات کوئی وجہ تو اس کی نگاہوں سے لوثا ہل ہے۔ اسے احساس ہوا تھا کہ صبا کے رویے کا یہ الجھاؤ الجھی سے نہیں ہے۔ تب سے اس نے بہت سوچا پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ شمن کے بعد سے ہی بہت بدل گئی ہے۔ بالکل کھوئی کھوئی زندگی ہے۔ بیزار شروع شروع کی بات دوسری ہو گئی۔ تب شمن کا غم تازہ تھا۔ مگر آہستہ آہستہ وہ سب ہی زندگی کی طرف آگئے تھے۔ لیکن صبا نہیں آئی تھی۔ کیوں؟

صبا کی زندگی میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو وہ ان سب سے چھپاتی تھی۔ وہ اس نتیجے تک پہنچ گیا تھا مگر وہ وجہ کیا تھی جس سے وہ تھوڑا غم تھا۔

مما سے یہ بات کب تک چھپائی جاسکتی تھی۔ انہیں یہ بات پتا چلتی ہی تھی۔ بابا نے بڑے صاحب لفظوں میں انہیں اس بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ وہ مانت رہ گئی تھیں۔

"میری بیٹیوں کو خوشیاں داس نہیں آتیں۔ پتا نہیں کس کی نظر گلی ہے ان کی خوشیوں کو۔ ایک کی زندگی میں خوشیاں نہیں تو ان کی عمر بہت تھوڑی تھی۔ اور دوسری کی زندگی میں خوشیاں سرتے سے کبھی نہیں ہی نہیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ ڈیڈی انہیں سمجھانے لگے۔



ظفر کا فون آیا تھا بابا سے صبا کی ضد کے بارے میں بتا رہے تھے۔ وہ مسلسل اسی ضد پر اڑی تھی کہ "میں طلاق نہیں لوں گی۔ چاہے جو بھی ہو جائے" میں اس رشتے کو برقرار رکھوں گی۔ "ظفر نے فون پر اسے بلا دیا۔ "ظفر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" بابا نے اس کے

کمرے میں آکر اسے اطلاع دی۔ وہ آج صبح سے اپنے کمرے میں بند تھی۔ وہ خاموشی سے فون سننے لگی۔

"صبا! اب تم کچھ نہیں بولو گی۔ اب جو فیصلہ ہو گا، ہم لوگ کریں گے۔ بہت کھیل چکیں تم اپنی زندگی کے ساتھ۔" اس کا انداز حلیہ تھا۔

"اگر تم ہمارے فیصلے کے خلاف جنکس اور تم نے اب کوئی تماش کیا تو میں زندگی بھر تمہیں اپنی شکل دکھاؤں گا اور تمہاری طرف دیکھوں گا۔ میں بھول جاؤں گا کہ میری صبا نام کی کوئی بہن بھی تھی۔ تمہاری خاتونوں نے یہ دن دکھایا ہے۔ ورنہ میں اس لوگ کے سچے کام تو ڈرتا۔" وہ خاموشی سے ظفر کی باتیں سن رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے اس نے ار تفضلی کی سنی تھیں۔ اس سے بات کر کے وہ دوبارہ بابا سے بات کرنے لگا۔

سب کی یہی خواہش تھی کہ اس کا سفیر فیروز کے ساتھ ہر تعلق ختم کر دیا جائے۔ وہ بے بسی سے سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گھر پر زینہ آئی اور اٹکل تھکے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ سب لوگ ذرا تنگ دھم میں تھے۔ وہ برابر والے کمرے میں بیٹھی اپنی قسمت کا فیصلہ ہوتے دیکھ رہی تھی۔ ار تفضلی اسے ذرا تنگ دھم میں آنے سے منع کر گیا تھا۔

"میں نے کچھ برا سوچ کر ایسا نہیں کیا تھا۔ میں نے آپ لوگوں سے بہت سی باتیں چھپائیں" میں مانتا ہوں۔ مگر میری نیت بری نہیں تھی۔ مجھے صبا سے بہت محبت ہے۔ وہ میری بہن نہیں بلکہ میری بیٹی ہے۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں بڑا۔ آپ لوگ ہمیں ایک موقع دیں۔ میں خود کینڈا جاؤں گا۔ سفیر سے کہوں گا کہ وہ اس عورت کو طلاق دے۔ دیکھوں گا میں کیوں کر میری بات کیسے نہیں مانتا۔ میری بہن صبا ہی تھی اور وہی رہے گی۔ جو عزت اور جو مقام ہم نے اسے دیا ہے وہ کسی اور کو کبھی دے ہی نہیں سکتے۔" اس نے اٹکل کی آواز سنی۔

"صبا اور بیٹی؟ کاش ایسا سمجھا ہوتا آپ نے۔" ار تفضلی کی طرف سے آواز آئی۔

"اب کسی سمجھوتے کی کوئی گنجائش نہیں ہے فیروز! تم لوگ بے کار میں اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔ یہ ہم سب کا مشترکہ اور بالکل اٹل فیصلہ ہے۔ اس میں کسی رد و بدل کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔" بابا غصوں سے بول رہے تھے۔

"آپ صبا کو بلائیں" میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ یہ التجائیہ آواز زینہ آئی کی تھی۔

"صبا! آپ لوگوں سے نہیں ملے گی۔ اب جو بات کہی ہوئی وہ ہم لوگ کریں گے۔ اس کے سر پر اس کے بڑے موندھو ہیں۔ اور وہ اس کی بہتری اس سے زیادہ بہتر انداز میں سوچ سکتے ہیں۔ وہ دونوں میاں بیوی مایوس اور نامراد واپس لوٹ گئے تھے۔



سفیر کا فون آیا تھا وہ صبا سے بات کرنا چاہتا تھا۔ زینہ آئی اور اٹکل کی طرح اسے سفیر سے بات کرنے سے نہیں روکا گیا۔

"صبا! تمہارے گھر والے بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اس رشتے کا ختم ہو جانا ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے۔" سلام دعا کے فوراً بعد اس نے یہ بات کہی۔

"بہت بوجھ ہے میرے دل پر۔ کوئی قصور نہ ہوتے۔" وہ بھی مجھے ہر لمحہ ایسا لگتا ہے جیسے میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں تمہاری زندگی کو بچہ کر رہا ہوں۔ میرا ضمیر مجھے مانت کرتا ہے۔ حالانکہ اس رشتے کو میں نے تمہاری خواہش پر ہی برقرار رکھا تھا۔ پھر بھی میرا دل یہ جان رہتا ہے۔ میں سید کے ساتھ اپنی زندگی لکھن اور پر سکون انداز میں نہیں گزار پا رہا۔ سید نے مجھ سے اس شرط پر شادی کی تھی کہ میں اس سے ملنے کرنے سے پہلے تمہیں طلاق دے دوں۔ میں تم سے کبھی وعدے کا پابند تھا نہیں نے اپنا وعدہ نبھانے کی خاطر اس سے جھوٹ بولا۔ اگر اسے یہ پتا چل گیا کہ میں نے تمہیں نہیں چھوڑا تو وہ تو پھر زندگی میں کبھی مجھ سے ہٹ کرے گی ہی نہیں۔ شکر کہ ظفر اور ار تفضلی

یہاں آگئے۔ اور انہوں نے مجھے اس پریشانی سے باہر نکال دیا۔ وہ دونوں مجھ سے یہی کہہ کر گئے تھے کہ میں تمہیں طلاق دے دوں۔" اس کے لہجے میں طہائیت تھی۔

"میں تمہیں طلاق بھیج رہا ہوں صبا! مجھے پتا ہے تمہیں اس بات سے بہت دکھ ہو گا۔ مگر صبا! تمہارے اور میرے لیے بہت اچھا فیصلہ ہے۔ تم میں کسی چیز کی کمی نہیں زندگی مجھ پر اگر ختم نہیں ہو جاتی۔ دیکھنا تمہیں ایک بہت ہی محبت کرنے والا شخص ملے گا۔ وہ جو تمہاری زندگی کو خوشیوں سے بھر دے گا۔" اس کے الوداعی جملے اسی طرح جملوں سے بھرے ہوئے تھے۔ جیسے کہیں میں دھکی سا اٹکل رکھنے والے وہ افراد ایک دوسرے سے جوش کے لیے جا رہے ہوں۔ پہلے او آ گیا کرتے ہیں۔



دو شے جس کی سب کو تمنا تھی، آزادی کا وہ روانہ اس کے ہاتھ میں آیا تھا۔ وہ حیران ہو رہی تھی کہ یہ لوگ کس بات پر اتنے افسوس ہیں۔ ان کی خواہش پوری ہوئی ہے۔ بجائے خوش ہونے کے وہ لوگ رو رہے تھے۔

اس نے لاؤنج میں گئی اس تصویر کو ایک نظر دیکھا۔ اب وہ اس تصویر کے سامنے کبھی سفیر فیروز کی بیوی کی حیثیت سے جا کر کھڑی نہیں ہو سکے گی۔

"تم نے دیکھا نا" میں نے اس نام کو اپنے نام کے ساتھ جوڑے رکھنے کی کتنی کوشش کی۔ دیکھا نا تم نے ہنگریہ لوگ۔ انہوں نے مجھ سے وہ نام چھین لیا۔ میں اپنا گھر بسائے رکھنے کے لیے جس حد تک جاسکتی تھی گئی مگر سب ختم ہو گیا۔" وہ اس تصویر سے نگاہیں ہٹا کر اپنے ہاتھوں میں سر قہقہہ کر بیٹھ گئی۔

"صبا! اس طرح اپنی مت دیکھو۔" وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"مما کے پاس جا کر بیٹھو۔ دیکھو انہیں وہ رو رہی ہیں انہیں چپ کرنا۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں

سے اٹھانے لگا۔ وہ اٹھ کر اس کے ساتھ ماما کے پاس آئی۔

”میں کہتی تھی تاکہ میرا دل جھوٹ نہیں بول رہا۔ مجھے صبا خوش نہیں لگتی۔“ انہوں نے روئے ہوئے اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔

وہ چپ چاپ ان کے سینے سے لگی رہی۔ ماما کی زندگی میں یہ دکھ اس کی وجہ سے آیا تھا۔ ماما کی آنکھیں دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں کی طرح تھیں۔

”اسکی کے منہ سے یہ بات سن کر ماما خوشی سے گنگ رہ گئی تھیں۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا اس کی بات پر۔ ماما بلیا ڈیڈی، لہن تینوں کے چہروں پر اور تھنی کی بات نے خوشیوں کے رنگ کھینچ دیے تھے۔ ”میں سوچ کر رہے ہو اور تھنی؟“ اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں اب سوچتا ہوں کہ کاش پہلی مرتبہ جب یہ بات بلیا نے مجھ سے کہی تھی میں ہوں کہ دتا تو دھاری زندگیاں کسی المیہ سے تو دوچار نہ ہوتیں۔“ وہ افسردگی سے بولا۔

”میرے دل میں یہ بات آئی تھی اور تھنی! لیکن پھر میں نے سوچا کہ تم نہیں مانو گے اس لیے خاموش رہا۔ تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے اور تھنی! بلیا نے مجھ سے بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ اس نے باپ کا سر فخر سے اونچا کر لیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں تھی۔ دھنیاں نے اگر پیغام دیا کہ ماما اسے بلا رہی ہیں۔ وہ ان کے کمرے میں آئی تو وہاں ماما کے علاوہ ڈیڈی بلیا اور اور تھنی بھی موجود تھے۔ اس کے اندر آنے پر سب نے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”بھئیو بیٹا!“ بلیا نے اس کے لیے اپنے برابر میں جگہ بنائی تھی۔

”بیٹا! اس وقت ہم نے تمہیں ایک بہت ضروری بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔ مجھے پتا ہے میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔“ بلیا نے بہت محبت اور شفقت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پہلے بھی ایک مرتبہ یہ بات ہو چکی ہے۔“ اس نے اور اور تھنی نے اس کے لیے انکار کر دیا تھا۔ اس نے ہم تم سے یہ بات کر رہے ہیں۔ اس میں ہم سب کی خوشی ہے، ہم سب کی بہتری ہے۔ ہم جاننے ہیں تمہارے لیے اس رشتے کو قبول کرنا بہت مشکل ہے لیکن صبا ان حالات میں اس سے بہت فیصلہ تمہارا اور اور تھنی کے لیے وہ سزا کوئی نہیں ہو سکتا۔ ماما سب کی خوشی کے لیے یہاں کہہ دو۔“

بلیا کا لہجہ مان بھرا تھا۔ وہ ان کی بات سن کر بالکل ہونے والی دو مہینوں سے اٹھی جیسے اسے کسی زبردستی سنا ہے اس لیے اس کے چہرے پر مہمور اور ٹانہ بند کی اور اشتعال سارے کے سارے اثرات آسانی سے بڑھے جاسکتے تھے۔

”صبا! اور تھنی نے خود تم سے شادی کی خواہش اظہار کیا ہے۔ تمہیں میں اپنی محبت کا واسطہ دے کر کہہ رہی ہوں کہ انکار مت کرنا۔ تمہارے لیے اور تھنی سے اچھا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔“ اس آنکھوں میں اشک کے لیے اس سے مخاطب تھیں۔ اس کی نظریں اور تھنی پر جمی تھیں۔ وہ ایک ایک قدم اس کے بالکل سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

”آپ کو یہ بات سوچنے اور سمجھنے کے لیے ذرا سی فکر شرم نہیں آتی مسز اور تھنی غنیمت! کہاں گئی وہ غنیمت کی محبت اور کہاں گئے وہ معاف کے لیے کبھی سوچیں۔“ بلیا نے کر آنے کے دعوے، مجھ سے ہمدردی جتانے کے چکر میں آپ نے غنیمت کے بارے میں ایک پل کے لیے بھی نہیں سوچا۔“

”صبا! بات یوں نہیں ہے میری جان! اوہ! میرے پاس بھئیو! تم بات کو بالکل غلط انداز میں سمجھ رہی ہو۔“ بلیا بڑے پیار سے اسے اپنے پاس بلا رہے تھے مگر وہ کچھ سننے اور سمجھنے پر آمادہ نہیں تھی۔

”میں کچھ غلط نہیں سوچ رہی بلیا۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”ان کے ساتھ مسئلہ کیا ہے میری بھئی میں نہیں آتا۔ پہلے ہی اتنی ڈیڈی تھنیوں کو پینہ انداز میں گئے۔ کس نے کہا تھا انہیں وہاں جانے کے لیے۔“

”یہ بات خوش! انہیں کیا تکلیف تھی۔ میری بھئی! میں اسے جیسے چاہے گزارتی ہوں۔ ان کو کیا حق ہے! وہ اپنی اپنی زندگی گزارنے کے لیے بیٹھے۔“ بلیا نے آپ سب سے بھی بڑھ چڑھ کر اس سارے مسئلے سے لپٹ لیا۔ انہیں میرے ماما باپ اور بھائی کے بارے میں میری فکر سے اب میری اسی فکر میں یہ بات کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ انہیں یہ بات مان کر ان کی اس عظمت اور نیکی سے میرے دل میں ان کی قدردانی و منزلت اور بڑھ جائے گی۔“ وہ بلیا کے اڑ میں جمی۔

تھنی بغیر کسی تاثر کے خاموشی سے اس کا نظریہ مبرا یہ کیا بد تیزی ہے۔ ”ڈیڈی مزید خاموش رہنے کے لیے اس نے جیسے ڈیڈی کی تڑپ کو دیکھا۔“

”صبا! اور تھنی غنیمت! تم واقعی ایک عظیم انسان ہو۔“ بلیا کی حتمی بولی، مجبور اور تھنا کرن کو اپنانے کے لیے تیار ہو گئے ہو۔ تم سے اچھا اور نیک انسان اس کے سامنے پر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“ وہ ابھی اسی انداز میں اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی کہ بلیا نے آواز اڑائی اسے ایک دم خاموش ہو جانے پر مجبور کیا۔

”صبا! صبا! اب مزید میں یہ بد تیزی بالکل نہیں کر سکتا۔“ وہ بہت غصے سے صوفے پر گئے تھے۔ انہیں اٹھنا دیکھ کر بلیا بھی فوراً اٹھ کر ان کے کندھے پر اپنے ہاتھ سے دباؤ ڈال کر بھائی اور کتنے اور غصہ کرنے سے روکا۔

”آپ لوگوں سے بالکل صاف صاف کہہ رہی ہوں کہ یہ بات مجھ سے کہنے کی کو شش مت کیجئے۔“ بلیا نے حواسوں میں نہیں سمجھی۔ اسے خود نہیں کیا کیا بول گئی ہے اور کس کس کے سامنے یہ کہہ رہی ہے بھائی بھائی بھائی سے نکل گئی۔ گئی ہے کمرے میں آکر وہ دھشت بھرے انداز میں

بہت دیر گزر چکی تھی مگر اس کا اضطراب ختم نہیں ہو رہا تھا۔ ماما اور ڈیڈی کو بتا دینا اس کے لیے نہ خیر نہ بد تھی اور نہ بچپن مل سکتا تھا۔ وہ ان کے کمرے میں آئی۔ ماما نماز پڑھ کر جائے نماز تہہ کرتے ہوئے اٹھ رہی تھیں۔ جبکہ ڈیڈی بلیا پر خاموش بیٹھے تھے۔

”آہم سو رہی ڈیڈی۔“ وہ ان کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

”صبا! تمہیں سو رہی مجھ سے نہیں! اور تھنی سے کتنا چاہیے۔ تم نے آج اس کے ساتھ کس قدر بد تیزی کی ہے۔“ ڈیڈی نے اس کے شرمندہ سے چہرے پر گہری نگاہیں ڈالتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا۔

”میں ان سے بھی معافی مانگ لوں گی ڈیڈی! پلیز۔“ آپ تو پہلے مجھے معاف کر دیں۔ ماما آپ بھی۔ آپ کتنی عجیب میری بد تیزی اور منہ پھٹ صبا کس کس کھڑی ہے۔ دیکھیں وہ کس کس کھڑی! وہ ہمیں ہے۔“ ڈیڈی سے کہتے کہتے وہ ماما کی طرف گھوم گئی۔ وہ آہستگی سے چلتے ہوئے اس کے پاس آئی تھیں۔

”صبا! تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم ابھی کبھی بھی نہیں تھیں۔ ہم نے اپنے بچوں کو کبھی اس بات کی تربیت نہیں دی کہ وہ بڑوں کے سامنے اونچی آواز سے بولیں۔ اور تھنی نے یہ بات کر کے ہم سب کے جذبات کی توجہ کی تھی۔ ہم سب یہی چاہتے تھے مگر کہنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس نے ہم سب کی خوشیوں کا سوا۔ آج بھی ایک سے ایک اچھی لڑکی کا رشتہ اسے مل سکتا ہے۔ اس نے اگر ایسا سوچا تو تمہاری محبت میں میری محبت میں ہم سب کی محبت میں۔ تم نے اس کے خلوص کا مذاق اڑایا! اس کے لیے اتنے بڑے الفاظ استعمال کیے کہ میں اب تک حیران ہوں کہ کیا صبا اس طرح کے الفاظ بھی بول سکتی ہے۔“ ماما نے بلیا پر بیٹھے ہوئے اس کی طرف بہت افسوس سے دیکھا۔

”میں مانتی ہوں ماما! میں نے غلط باتیں کہیں۔“ بھئی میں سوچے سمجھے بغیر بتائیں میں کیا بول گئی۔ لیکن ماما یہ بات سنے ہے کہ میں اس بات کے لیے کبھی ہوں

نہیں کہہ سکتی۔ میں ار تفتنی بھائی کے ساتھ کرن اور بہنوئی ہونے کے علاوہ تیسرا کوئی رشتہ کبھی جو بھی نہیں سکتی۔ اس کی آواز آہستہ بھی مگر اچھ بہت ہو توک اس میں کسی ترمیم کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں تھی۔

”بیٹھے جاؤ صبا! ڈیڈی نے اس کے لیے اپنے پیچ پیچھے دوائے ہوئے بیٹھنے کی جگہ بنالی۔

”جو کچھ تم نے کہا ہے اگر تم واقعی ایسا ہی سوچتی ہو تو میں بھی کہوں گا کہ تمہیں اپنے دوست اور دشمن کی پہچان نہیں ہے۔ اور ایسے لوگ زندگی میں بہت نقصان اٹھاتے ہیں۔“ اس کے بیٹھنے کے بعد ڈیڈی نے سنجیدگی سے کہا۔

”نہیں ڈیڈی! مجھے ان کے خلوص اور ان کی محبت پر کوئی شک نہیں۔ وہ بات سن کر مجھے اتنی شرم اور روتا غصہ آیا تھا کہ میں اپنے حواسوں میں نہیں رہی تھی۔ غصے میں میرے منہ سے پتا نہیں گیا کیا کھل گیا۔“ اس نے فوراً ان کی بات کا جواب دیا تھا۔

”مما! ڈیڈی! پلیز میں آپ دونوں سے دیکو بسٹ کرتی ہوں کہ آئندہ یہ بات کبھی مت کہنے کا میں ار تفتنی بھائی کے ساتھ یہ رشتہ قائم کرنے کے بارے میں مگر کبھی نہیں سوچ سکتی۔“ اس نے ملتے جلتے لگا ہوں سے ان دونوں کو دیکھا۔

”پھر اگر ہم تمہاری کہیں اور شادی کے بارے میں سوچیں تو تم کیا کہو گی؟“ ڈیڈی نے بڑی سنجیدگی سے اس سے یہ سوال پوچھا تھا۔

”ڈیڈی! آپ مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں۔ ابھی میری پہلی شادی کو ختم ہونے کا وقت گزرا ہے مجھے سنبھلنے کا موقع دیں۔ پھر میں آپ کی یہ بات مان لوں گی۔“ وہ اب انہیں اس بات کے لیے انکار نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے ار تفتنی سے معافی نہیں مانگی تھی۔ وہ اس کا سامنا کرنے سے گھرانے لگی تھی۔

سوائے رات کے کھانے کے ان دونوں کا براہ

راست سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کتے جاتے نگر اور بونے پر وہ اس سے بات کیے بغیر خاموشی سے اس جگہ سے ہٹ جایا کرتی تھی۔

بابائے اسے وہ سب باتیں بتاتی تھیں جو صبا نے ان سے اس رات کہی تھیں۔ ”مما کے نظریے سے سوچیں تو اس کا رد عمل بالکل ٹھیک تھا ار تفتنی کو تو گزرتا ہے وہ اس معاملے سے باہر نکل آتی تو آہستہ آہستہ اسے سمجھایا جاسکتا تھا۔ رشتے بدلے جاسکتے ہیں۔ سوچیں بدلی جاسکتی ہیں۔ ہم پیار سے دھیرے دھیرے اسے سمجھاتے تو وہ اس رشتے کے لیے اپنے دل میں گنجائش پیدا کرنے پر آمادہ ہوئی جاتی۔“ ار تفتنی یوں خاموش رہا تھا جیسے اسے ان تمام باتوں سے براہِ پورا اتفاق تھا اور اسے اتفاق ہو بھی جایا اگر وہ صبا شفیق کو جانتا نہ ہو۔

اس گھر کا وہ سرا کوئی بھی فرد صبا کو اپنی اچھی طرح اور اندر تک نہیں جانتا تھا جتنا ار تفتنی جانتا تھا مگر اب گزشتہ کچھ عرصہ سے وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ صبا کو جانتا ضرور ہے۔ مگر سمجھتا نہیں۔ وہ کبھی صبا کو سمجھنا ہی نہیں سکتا۔

پہلی مرتبہ وہ صبا کے دوسرے پر اس وقت جو نکا تھا جب وہ لاہور اس کے اور غم سے کھپا پاس تکی تھی۔

”آپ کو میرے ذکر سے جڑ ہوئی ہے؟“ کتا اجڑی سا لہجہ لگا تھا اسے صبا کا۔ اس لیے میں بہت سے شکوے اور شکایتیں چھپی ہوئی تھیں جنہیں وہ اس وقت سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ چونکا ضرور تھا مگر کوئی بات سمجھا نہیں تھا۔

اس رات پہلی دفعہ اس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ صبا اس سے۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنی اس سوچ کو محسوس کیا تھا۔ بڑی شدت سے خود کو جھٹایا تھا۔

مگر اب وہ اپنی اس سوچ کو۔۔۔ احمقانہ کہہ کر جھٹلا اور بھٹا نہیں سکتا تھا۔ زندگی میں وہ سری مرتبہ صبا نے اس کے ساتھ بد تمیزی کی تھی اور اس بار اس نے اپنی بد تمیزی

اس سے معافی بھی نہیں مانگی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر اترائے لگی تھی اور اس سے بالکل بات نہیں کرتی تھی۔ وہ اس سے سلام دعا اور رسمی سی خیریت والی باتیں بھی نہیں کرتی تھی۔ اس کا گریز محسوس کر کے اس نے بھی اسے مخاطب کرنا چھوڑا ہوا تھا۔ اسے صبا کی اس روز کی باتوں سے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ مگر وہ اس سے ناراض نہیں ہو سکا تھا۔

بھائے اس سے نفرت کرنے کے وہ اس کے سامنے کا سبب تلاش کرنے بیٹھ گیا تھا۔ صبا نے اس کے ساتھ بڑے عجیب سے انداز میں بد تمیزی کی تھی۔ بہت عجیب طرح اس سے نفرت کا اظہار کیا تھا۔ ار تفتنی کے پاس سوچنے اور غور کرنے کے لیے اب اتنی سی باتیں تھیں۔ یہ بات تو بہر حال وہ سمجھ چکا تھا کہ صبا کی زندگی کی وہ انہیں جو اسے بے چین اور بے حل رکھتی ہے۔ اس کا تعلق اسی کی ذات سے ہے۔ صبا کی سب باتوں کا سلسلہ ار تفتنی غصہ فتنے کے ساتھ ہی مار لیتا تھا۔ وہ اس کی باتوں کو ختم کرنا چاہتا تھا مگر پہلے بات پوری طرح سمجھ تو لے۔

وہ صبا کے لیے ان کے کمرے میں کھانا لے کر آئی تھی۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ صبح سے کمرے میں تھیں۔ اندر تکی تو تھا۔ ”مما کے پاس بیٹھا مگر آیا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ان کا سر پارہا تھا۔

”مما! درد ٹھیک ہو گیا۔“ ساتھ ساتھ معصومانہ انداز میں وہ جملہ بھی دہرا رہا تھا۔

”ہاں بالکل ٹھیک ہو گیا۔“ ممّا ہلکا سا مسکرائی تھیں۔ انہوں نے اپنے ماتھے پر رکھا اس کا ہاتھ بے مانتہ چومنا تھا۔

”جاؤ! اب جا کر کھیل لو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا تو وہ سر ہلا کر اس سے اٹھا اور بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ وہ کھانے کی ٹرے لے کر ان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ ممّا

اس روز کے بعد سے ایک مرتبہ پھر بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔

وہ کھیل اور کھنڈ کے سارے بیٹھی اتنی بڑھ چالی اور کمزور لگ رہی تھیں۔ جیسے برسوں کی بیمار ہوں۔

”تپ لڑنا سوچتی کیوں ہیں۔ دیکھیں سوچ سوچ کر آپ نے خود کو بیمار کر لیا ہے۔“ اس نے وہ سنا والا ان کے منہ میں ڈالا۔ وہ ہولے سے مسکرائیں۔

”میں ٹھیک ہوں صبا! تم فیملی فکر مت کرو۔“ وہ آہستہ آہستہ لہجہ چہا رہی تھیں۔ ”صبا! کل رات میں نے خواب میں تمہیں دیکھا۔“ ان کی آواز بہت کھوئی کھوئی اور مدھم سی تھی۔ وہ نوالہ توڑتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو روک کر ان کی بات سننے لگی تھی۔

”بہت پیاری لگ رہی تھی وہ۔ اتنے پیارے کپڑے پہنے ہوئے تھے اس نے۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر گریہ لگی۔ اور میرے ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔

”مما! میں بہت اکیل ہوں۔ تپ میرے پاس آجا میں۔ آپ نے مجھے بچپن میں بھی کبھی اوریاں نہیں سنا میں۔ کبھی اپنے ساتھ لپٹا کر نہیں سلا یا۔ آپ کو کیا اپنی اس بیٹی سے بالکل محبت نہیں؟“ ممّا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ہولے ہولے وہ ایک پہل کے لیے بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔

”اس کے کپڑے میں اتنا شگہ اور اتنی ڈھیر ساری شکایتیں تھیں کہ میں رو ہی نہیں سکی۔ وہ بیڈ پر سے اٹھی تو میں بھی اس کے پیچھے اٹھ گئی۔ وہ مجھے اٹھاتا ہوا دیکھ کر اتنی خوش ہوئی، اس کے چہرے پر بہت خوب صورت مسکراہٹ بکھرنی لگی۔“

اس کا دل سوکھے پتے کی مانند کلنا تھا۔ ”مما! اس طرح کی باتیں مت کریں۔ پلیز۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ ٹرے اور میاں سے ہٹا کر ان کے بالکل قریب بیٹھ گئی تھی۔

”تم اکیلے ہے صبا! وہ اسی کھوئے کھوئے لیے میں بولیں۔

”مما! آپ ایسی باتیں مت کریں۔ آپ میری فکر میں بیمار ہو گئی ہیں نا“ آپ میری شادی کرنا چاہتی ہیں

ناں۔ میں شادی کے لیے تیار ہوں۔“ وہ سرا سیمگی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”جس سے میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں اس کے لیے تم نہیں مانو گی۔ اور اس کے علاوہ کہیں کا کوئی راجہ مہاراجہ بھی اب تمہارا ہاتھ مانگنے آجائے تو میں اس کے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ نہیں دوں گی۔ میں بہت وہمی ہو گئی ہوں صبا! اب تمہارے لیے ار تفضی کے علاوہ میں کسی پر بھی بھروسا نہیں کر سکتی۔ کاش ایسا ہو کہ مرنے سے پہلے جب میں آنکھیں بند کروں تو جو آخری منظر میری آنکھیں دیکھیں وہ یہ ہو کہ میری صبا تنہا نہیں، ار تفضی اس کے پاس ہے اور وہ اسے ہر دکھ اور ہر تکلیف سے بچائے رکھے گا۔ صبا مجھے ظفر پر بھی اتنا بھروسا نہیں جتنا ار تفضی پر ہے۔“

انہوں نے تکیہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ یوں جیسے وہ بولتے بولتے بہت تھک گئی ہوں۔ ”مما!“ وہ خوفزدہ انداز میں چلائی۔ اس نے انہیں پورا کا پورا جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ مگر انہوں نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ وہ ہر اسان نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے پاس رکھا، فون اٹھا کر ار تفضی کا موبائل نمبر ملانے لگی تھی۔ دوسری بیل پر ہی اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔ پورے پندرہ دن بعد وہ اس سے مخاطب تھی۔ بری طرح اٹکتے ہوئے بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں اس کے منہ سے صرف ”مما“ کا لفظ نکلا تھا۔ وہ اس کے لہجے کی گھبراہٹ اور کیکپاہٹ اس ایک لفظ سے ہی محسوس کر سکتا تھا۔

”کیا ہوا صبا! کیا ممما کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے؟“ اس کی آواز میں تشویش تھی۔

”ہاں، وہ بات نہیں کر رہیں۔ میں انہیں اتنی آوازیں دے رہی ہوں۔“ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں چلائی تھی۔

”تم ندیم کو فون دو۔“ وہ بہت جلدی میں بولا۔ اس نے چیخ کر ندیم کو آواز دی وہ بھاگتا ہوا فوراً کمرے میں آیا تھا۔ اس نے ریسیور اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے دو سیکنڈز تک خاموشی سے ار تفضی کی بات سنی

اور جواب میں ”جی ٹھیک ہے“ کہہ کر ریسیور واپس رکھتے ہوئے کمرے سے تیزی سے نکل گیا۔ ندیم اور ڈرائیور بڑی تیزی میں ممما کو ہاسپٹل لے کر جا رہے تھے۔ وہ ننگے پاؤں ہی ان لوگوں کے پیچھے بھاگتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

صبح سے انہیں صرف بخار ہی تو تھا۔ بخار ہی کی وجہ سے کمزوری بھی بڑھ گئی تھی۔ مگر اب وہ یوں پڑی تھیں جیسے نہ معلوم انہیں کتنی خطرناک بیماری لاحق ہو گئی ہو۔ ڈاکٹرز انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈاکٹرز کی سمجھ میں ان کی بے ہوشی نہیں آرہی تھی۔ وہ ار تفضی سے پوچھ رہے تھے کہ ان کے گھر میں کیا کوئی ایسی بات ہوئی ہے، کوئی لڑائی جھگڑا، کوئی ٹینشن، کوئی اچانک ملنے والی بری خبر۔

ار تفضی نے بابا اور ڈیڈی کو آفس فون کر کے ممما کی طبیعت کے بارے میں بتایا تو وہ دونوں بھی فوراً ہی وہاں پہنچے۔

کتنے گھنٹے گزر گئے تھے، وہ سب وہاں کھڑے ایک دوسرے کو حوصلہ دے رہے تھے۔ رات کے آخری پہر کہیں جا کر ممما کو ہوش آیا تھا۔ انہیں ہوش میں آنا دیکھ کر ان سب نے سکون کا سانس لیا۔ ہوش میں آتے ہی انہوں نے شمن کا نام لیا تھا۔ یہ سب لوگ ان کے پاس گئے تو وہ آنکھیں نیم وا کیے مسلسل شمن کا نام پکارے جا رہی تھیں۔

وہ بہت تکلیف میں تھیں۔ ڈیڈی کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کی جان واقعی صبا میں اٹکی ہوئی ہے۔ وہ بہت مشکل میں ہیں۔ اور ان کی یہ مشکل صبا ہی آسان کر سکتی تھی۔ وہ صبا کے پاس آگئے۔

”صبا! میں تمہیں کوئی حکم نہیں دے رہا۔ لیکن اگر تمہیں اپنی ممما سے واقعی محبت ہے تو پھر اسے ار تفضی کے علاوہ کسی پر بھی بھروسا نہیں۔ وہ تمہاری شادی صرف ار تفضی کے ساتھ ہی ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہے۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی خاموشی سے ڈیڈی کو دیکھ رہی تھی۔

”صبا! یہ وقت گزر گیا تو زندگی میں صرف پچھتاوے

وہ جائیں گے۔ اپنی مرقی ہوئی ماں کی آخری خواہش پوری کرو۔ وہ بہت تکلیف میں ہے صبا۔“
ان کی آنکھوں سے گرتے آنسو جانے نمازیں جذب ہو رہے تھے۔ اس نے ایک نظر آنکھیں ہاتھ کے سہارے اپنی سانسیں پوری کرتی ہوئی ماما کو دیکھا اور پھر ڈیڈی کو۔ انکار میں ادا ہونے والا ہر لفظ اور ہر جملہ اس کے منہ سے نکلنے سے انکاری ہو گیا تھا۔ اس نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ سوائے اقرار میں سر ہلانے کے۔
”بلیو! آنکھیں کھولو۔ دیکھو عیاشادی کے لیسان گئی ہے۔ ہم ابھی تھوڑی دیر میں اور قرضی کے ساتھ اس کا نکاح کروائیں گے۔“

ان کے منہ سے یہ جملہ نکلنے کی دیر تھی کہ مہمانے آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان کی بچھتی ہوئی آنکھوں میں آخری بار بہت گہری چمک اور بدگئی آئی تھی۔ انہوں نے آنکھیں پوری کھولی تھیں ایسے جیسے وہ اس منظر کو بہت اچھی طرح اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لینا چاہتی ہوں۔ کھن آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہاں نکاح کے تمام انتظامات ہو گئے تھے۔ مہمانے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ ہل نہیں سکتی تھیں۔ منہ سے کچھ بول بھی نہیں سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ اپنے ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتی تھیں۔ لیکن انہوں نے اپنی آنکھوں کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی ان کے پاس آگئی تھی۔ ان کے صرف ہونٹ ال رہے تھے۔ پوری کی پوری ان پر جھک گئی تاکہ ان کے ہونٹوں کی جھجک کو سمجھ سکے۔
”صبا! میں بہت خوش ہوں۔“ ماں کے کانپے لیوں لے لے آواز اس سے یہ بات کہی تھی۔

”صبا! میری دعا ہے کہ زندگی تم پر بیٹہ ماں کی گود کی طرح مریلا رہے۔ اس کا دامن بھی تمہارے لیے تنگ نہ پڑے۔“ اسے لگا ہوں کی زبانی دعا نہیں دیتا وہ چہ اس لمحہ کتنا روشن اور کتنا دلکش نظر آ رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں کتنا سکون اور کس قدر اطمینان تھا۔ وہ اب تکلیف سے کراہ نہیں رہی تھیں۔

وہاں اس وقت کمرے میں بابا ڈیڈی اور ار قرضی کے علاوہ چند افراد اور بھی موجود تھے۔ وہ سب ابھی ابھی وہاں آئے تھے۔ اس نے پورے ہوش و حواس میں اس نکل جانے پر حیرت کے تھے۔
”مما! آنکھیں کھولے اس منظر کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی مگر ان کے چہرے پر ادوی مسکراہٹ تھی۔ ان کی آنکھوں میں سکون تھا۔ وہ بہت مطمئن لگ رہی تھیں۔ وہ دونوں ان کے بالکل قریب کھڑے تھے۔ صبا اور ار قرضی ان کی آنکھیں آخری منظر ہی دیکھ رہی تھیں کہ ان کی صبا تھما نہیں۔ ار قرضی اس کے پاس ہے۔“

مجھ کو یقین ہے سچ کہتی تھیں۔ وہ بھی ای کہتی تھیں۔ جب میرے بچپن کے دن تھے چاند میں پریاں دہتی تھیں ایک یہ دن جب لاکھوں غم اور کل پڑا ہے۔ دن ایک وہ دن جب ایک ذرا سی بات پر دنیاں ہتی تھیں۔ ”مجھے تو میری ماما کی گود بیٹھ چاہیے۔ ساری زندگی۔ جب میں بوڑھی ہو جاؤں گی ناں تب بھی۔“ اور ابھی زندگی ساری کہاں گزری تھی ابھی تو بہت ضرورت تھی اس گود کی۔ اس مستابھری چھاؤں کی۔ گھنٹوں میں مریوے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

”صبا! تم نے ماما کو روکا کیوں نہیں؟“ ظفر اس کے پاس فریض پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بری طرح رو رہا تھا۔ وہ کل فلائٹ سے کراچی پہنچا تھا مگر ماما کو زندہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ سین اسی دن پہنچا تھا جب ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا چہرہ دیکھا تھا۔ ان کا آخری دیدار کیا تھا۔ ماں خود اپنے ہاتھوں سے گھر میں اتار آ تھا۔ اور اگر وہ کیا بات تو شاید زندگی میں کبھی سکون سے رہ جیسا تھا۔

دس دن ہو گئے تھے ماما کو گھنے ہوئے گھر اب دل کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا ابھی وہ کسی سے نکل کر سامنے آجائیں گی۔ سہا سارے گھر میں ماما آوازیں لگا رہا تھا۔

یہ گورنس تو صرف ار قرضی کی خواہش پر مہمانے رکھی گئی۔ وہ اس کے سب کلام خود کرتی تھیں۔ وہ انہیں سے دکھانے کا ان سے خدیں پوری کروانے کا بیانی تھا۔ وہ پانچ سال کا بچہ تھا بابا نے اسے بہت پیار کیا۔ یہ بات سمجھائی تھی کہ ماما کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس بلایا ہے۔ وہ ان کی بات سمجھ لینے کے باوجود بھی ادا تو اتر دیتے ہوئے دوتا شروع کر دیتا تھا۔

”میں مہمانے نماؤں گا۔ مہمانے پڑے پنوں گا۔“ کے ہاتھ سے دودھ پیوں گا۔“ وہ خدی سے انداز لگاتا رہنے بیٹھ جاتا۔ چالیسویں کے بعد جب ظفر مامہ والیں جانے کی تیاری کرنے لگے تو ڈیڈی سے بولے۔

”ظفر! بہت دیر لے امریکہ میں اب واپس آ جاؤ۔“ انہوں نے بیٹھ اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ ”اس کے کرکر کے واسطے میں نہیں آئے تھے۔ وہ ماما چاہتا ہے۔“ زحمت۔ وہ ریسرچ کرنا چاہتا ہے۔ وہ تائیں لکھنا چاہتا ہے۔“ لکھے۔ مگر اب بہت دیر لے لے رہے تھے۔

”ڈیڈی! میرا تو پہلے بھی واپس آنے کا ارادہ تھا۔ اب میں ماما کی زندگی میں واپس آ گیا ہوں۔ وہ مجھے کتنی خوش ہو تیں۔“ وہ اداسی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اب مجھے کچھ وقت دے۔ اس طرح سب چھوڑ کر واپس نہیں آ سکتا۔ لیکن یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں بہت جلد پاکستان واپس آ جاؤں گا۔“ وہاں پر میرا بھی دل نہیں لگے گا۔“ اس نے ان کی اہلی کو روک لی تھی۔

”اب! آپ مجھ سے بہت کیوں نہیں کرتیں؟“ نے پاس کھڑا بہت معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ ”میں اس میں بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔“ ”انداز پر دیکھو تک کر سیدھی ہوئی۔ اسے گھر لے کر گیا۔ آ رہا تھا۔ اس نے اسے سمجھ کر

اپنے پاس بیٹھا لیا۔ کتنے دنوں سے وہ معاذ تک کو نظر انداز کیے ہوئے تھی۔ وہ گورنس کے رحم و کرم پر تھا۔ ”کرو! کیا باتیں کرتی ہیں۔“ اس نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

”اقرضی! کتنی موٹی ہے ناں ہالہ جانی۔“ اسے بے ساختہ نہیں آئی تھی۔

”وہ کھانا کھانے میں غرتے نہیں دکھائی۔ اس لیے۔“ وہ اس کا طریقہ انداز فوراً سمجھ گیا تھا۔

”میں اس سے زیادہ اسٹراٹک ہوں۔ آپ ہماری ریسنگ کروا کر دیکھ لیں۔“

”میں بس مجھے یقین آ گیا۔ اب کیس سچ اس کے ساتھ ریسنگ کرنے کھڑے مت ہو جانا۔ اگر اس کے ساتھ لڑائی کی تو تمہارے ریسنگ دیکھنے پر پابندی لگاوا دوں گی بابا سے کہہ کر۔“ وہ تبھی انداز میں بولی۔ اسی وقت ریسنگ شروع ہو گئی۔

”سب کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ معاذ کو ساتھ لے ڈائننگ روم میں آگئی۔ سب نے کھانا شروع کر دیا تھا۔

”تمہاری کل کتنے بجے کی فلائٹ ہے؟“ بابا نے ظفر سے پوچھا۔ اس نے جواباً اپنی فلائٹ کا نام بتا دیا۔ ”یہ کسی فنیشن کا موقع نہیں اور نہ ہمارے دل اس بات کے لیے راضی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں باقاعدہ طور پر اپنے تمام قرضے جانے والوں کو صبا اور ار قرضی کی شادی سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ بلکہ کے انتقال کے بعد کسی کو پتا چلا کسی کو نہیں۔ بہتر رہے گا۔ اگر ہم کھر کوئی بی بی یا ڈر رکھ لیں اور اس میں تمام قرضے احباب کو دے دو گئیں۔“ بابا بہت سنجیدگی سے سب سے مخاطب تھا۔

”تب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بابا! ظفر نے فوراً ان کی بات سے اتفاق کیا۔ ڈیڈی نے بھی گردن ہلا کر ان کی تائید کی تھی۔

”پھر ظفر کے سامنے ہی کر لیں۔ کل چھٹی کا دن ہے۔ سب کو فائونٹ کر لیں۔“ ڈیڈی نے کچھ دیر بعد بابا کو مشورہ دیا تو وہ سر اثبات میں ہلا کر بولے۔

دونوں سے چھپا لیا تھا۔ وہ مخاطب ان دونوں سے تھے لیکن ان کی ساری توجہ صبا کی طرف تھی۔ بیٹے کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ اسے کچھ بھی سمجھانے اور بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ اس کی طرف بہت غور سے دیکھ رہے تھے مگر وہ نظریں جھکائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔ مزید کچھ کہنا انہیں بے موقع لگا۔ اسی لیے وہ اس کا ہاتھ پھونک کر صوفے پر سے اٹھ گئے۔ ایک نظر اس پر ڈال کر وہ ان دونوں کو شب بخیر کہتے کمرے سے نکل گئے۔

ان کے باہر جاتے ہی ار تفتنی بھی صوفے پر سے اٹھ گیا۔ وہ اپنے بڑے سا بیڈنگ ٹیبل کے پاس آکر کچھ لمبے لمبے رکھ اس پر رکھی اپنی اور شرم کی شادی کے دن کی تصویر کو اس نے بغور دیکھا تھا۔ وہ اس لڑکی کی طرف بہت دیکھ اور کرب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی محبت سے آج سے کئی سال پہلے ایک روز اپنی زندگی میں شامل کر کے یہاں لایا تھا۔ اس لڑکی سے اس نے محبت کی تھی۔ بے تحاشا اور والہانہ۔ اس نے بھی سوچا نہیں تھا کہ ایسا کوئی دن اس کی اور شرم کی زندگی میں آئے گا۔ جب کوئی تیسرا فرد ان کے درمیان جگہ بنائے۔ چند لمحوں ہی میں اس نے ان گزرے وقتوں کی کتنی ساری باتیں یاد کر ڈالی تھیں۔ ان وقتوں کی جو اس نے اور شرم نے مل کر گزارے تھے۔

"مجھے معاف کرنا شرم!" اس نے بے آواز سے مخاطب کیا اور پھر اس تصویر پر سے نظریں ہٹا لیں جسے نہ اس نے کبھی پہلے سے ہٹایا تھا اور نہ آئندہ کبھی ہٹانا چاہتا تھا۔ وہ پٹنا اور ماضی سے نکل کر حال میں آیا۔ اس حال میں جمال وہ لڑکی اس کے کمرے میں اس کی بیوی کی حیثیت سے بیٹھی تھی جسے اس نے کبھی بھی ان نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن اب اسے اس لڑکی کو اپنا نگاہوں سے دیکھنا تھا۔ اسے وہ مقام اور وہ عزت دینا تھی جو اس کا حق تھا۔ وہ لڑکی زندگی کے گزرے ہوئے سال میں کبھی اس سے محبت کر چکی تھی وہ بہت بھی جان چکا تھا۔ اب اس کے دل میں اس کے لیے کیا ہے؟

وہ نہیں جانتا تھا مگر وہ اس محبت سے انگو تھا جو پر سوں پہلے صبا شفیق کے دل میں اس کے لیے موجود تھی۔ اس محبت کے ساتھ بھر گیا ہوا اسے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ وہ ختم ہو گئی یا دل کے نسل خانوں میں پھنسا گئی۔ وہ اس کے دل اس بھید سے انجمان تھا لیکن اپنے پر صرف ایک قدم اٹھاتے ہی اس کی صبا پر نظر پڑی تو اس کے چہرے پر بکھری وحشت دیکھ کر وہ کسی قدر غافل ہو گیا۔

اس کے چہرے پر عجیب سی وحشت تھی خوف تھا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ اس کی طرف بالکل بھی متوجہ نہیں تھی۔ وہ سامنے صبا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کس چیز سے ڈر رہی تھی۔ ار تفتنی کی بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔ بے اختیار آگے بڑھ کر اس نے اسے آواز دی۔

"صبا! تم ٹھیک تو ہو۔ تم ساری طبیعت کیسی ہے؟" اس نے اس کا کندھا ہلکے سے ہلایا۔ اسے یوں ہلایا۔ کی دیر تھی وہ وحشت زدہ ہو کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر پوری قوت سے چلائی۔ وہ اس کے چلتے پر ہو گیا۔

"صبا! کیا ہوا ہے؟" اس کی چیخ کے آگے اس نے سول بال بالک دب گیا تھا۔ ار تفتنی نے اسے بہت دور سے بھنچوڑا تھا۔

"صبا! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" اسے بھنچوڑے ہوئے وہ چلا آیا اور اس کے بھنچوڑے اور چلتے پر اس کی چیخ نکلتی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ پھٹکتے ہوئے صوفے پر سے اٹھ کر پھر بھاگے ہوئے کمرے کے دروازے سے نکل گئی۔ ار تفتنی نے باہر نکل کر اسے دیکھا وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

"مما! یہ آپ مجھے کس آندائش میں ڈال گئی ہیں؟" میں وہاں کیسے جاؤں؟ مما! وہاں شرم کا خون پڑا ہے۔ شرم کی لاش پڑی ہے۔ اس پر بے ہوش خون ہی لگا ہوا ہے۔ شرم کا خون۔ اس کی لاش مجھے دیکھ رہی ہے۔ ان نگاہوں سے۔" تو آخر آنکھیں تم یہاں صبا شفیق کی ستر پڑی تھیں تھر تھر کاپ رہی تھیں۔ اس کا پورا جسم

نمایا ہوا تھا۔ وہ خوف اور وحشت سے لرز رہی تھی۔

"مما! آپ کو میری شادی کر دانا تھی تو کونر کسی سے ہی کر دیتیں میں کچھ بھی نہ کہتی مگر آپ نے میرے اس شخص کا انتخاب کیا۔ جس کے ساتھ میں مرکز کی دیرا رشتہ نہیں جوڑنا چاہتی تھی۔ مما! آپ نے مجھے ساتھ بالکل اچھا نہیں کیا۔ آپ کی خوشی صبا کو ملنا کہ وہ کسی آپ نے میرے نہیں سوچا۔ اس ایک رات کی مزا اور کتنی کافی ہو گئی تھی۔ کیا وہ رات صبا کی زندگی سے نکل نہیں سکتی۔ ماضی کا ہر لمحہ مجھے مل رہا ہے۔ بس وہ رات اس میں سے نکل جائے اور صبا کیسے ہو سکتا تو پھر صبا مر جائے۔ میرے اللہ صبا موت دے دے اسے زندگی سے نجات دے دے! میں شرم کاگ زندگی کی قید سے رہائی دے دے اسے! اس کے گناہ معاف کر دے۔" زندگی میں دوسری مرتبہ اپنے لیے اللہ سے موت مانگ رہی تھی۔ پہلی مرتبہ اس کے مرنے کے دوسرے دن مانگی تھی تب اس دعا کی شدت نہیں تھی جتنی آج تھی۔

ار تفتنی نے اسے کچھ ہی دیر رہ گئی تھی۔ وہ بیدار ہو کر اہمیت پریشان بیٹھا تھا۔ اسے صبا کی فکر تو تھی اس سے بھی زیادہ بایا اور ڈیڑی کی فکر تھی۔ وہ صبا کی کھینان اور سکون دینا چاہتا تھا۔ صبا کی جو بھی گداسے وہ خود بالکل اکیلے سلجھانا چاہتا تھا۔ صبا کی کسی مسئلے میں الجھنا اسے گوارا نہیں تھا مگر وہ اس کی اس سوچ کے راستے میں سب سے بہت تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ رات گزر رہی تھی ویسے ویسے اس کی زندگی بڑھتی جا رہی تھی۔ اگر صبح اٹھ کر بایا اور صبا کی بات چیت گئی کہ صبا اپنے کمرے میں سو گئی۔ صبا بہت زیادہ ڈسٹرب ہو جائیں گے۔ اس نے وہ دونوں کس قدر خوش تھے وہ ان کی فکر ات کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اچانک

ہی وہ کچھ سوچ کر سرگرمی ایش رے میں پھینکا اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے کمرے سے نکل کر وہ صبا کے کمرے کی طرف آیا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آیا اور آہستگی سے دروازہ واپس بند بھی کر دیا۔ وہ بیڈ کے پیلوں پر کودھے منہ بالکل سناکت پڑی تھی۔ وہ اس کے پاس آیا اور بالکل آہستہ سے اسے آواز دی۔ وہ اس کی ایک کیا۔ وہ سری اور تیسری پکار پر بھی پوچھی سناکت پڑی رہی تھی۔ ار تفتنی کو یک دم ہی اس کی فکر لاحق ہوئی۔ وہ بے اختیار بیڈ پر بٹھا اور کندھے سے پکڑ کر اسے سیدھا کیا۔ وہ سو رہی تھی یا بے ہوش تھی؟ ایک نظر میں اسے اندازہ نہیں ہو سکا۔ بایا اور ڈیڑی سے بہت کراب اس کی پریشانی کا رنج صبا کی طرف مڑ گیا تھا۔

وہ خواب میں بھی وہی منہ دیکھ رہی تھی جو ابھی چند لمحے پہلے اس نے جاتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ سرخ لپاس جھمنوں اور پھولوں کی جگہ سفید کفن نے لپی لی تھی۔ اس کمرے میں اب چاروں طرف خون تھا۔ وہ بہت دور سے چلائی تھی۔ بخار کی شدت کی وجہ سے اس سے آنکھیں نہیں کھولیں جا رہی تھیں لیکن وہ آنکھیں کھولنا چاہتی تھی تاکہ اس بھانک خواب سے چھٹکارا پاسکے۔ اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ کوئی بڑی آہستہ آواز میں اس کا نام لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی کے بالکل ٹھنڈے ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ وہ اس کا چہرہ تھپتھا رہا تھا۔ اسے جھگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں کھولنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ آنکھیں کھولنے پر اسے کوئی پھول نظر آئے نہ کوئی دامن اور نہ ہی کوئی لاش اور خون۔ اس نے بہت طہایت اور سکون محسوس کیا۔ شکر تھا کہ وہ اس ڈراؤنے خواب سے جلد بیدار ہو گئی تھی۔

"کیسا محسوس کر رہی ہو اب تم۔ بخار تو پہلے سے بہت کم ہے۔" اس نے آواز کی طرف چونک کر

دیکھا۔ وہ اس کے بالکل قریب بیٹھا اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی ٹیپیاں رکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ بالکل ایسی ہی جیسی بیٹھ ہوا کرتی تھی۔ یہ وہی تھا اسے ابھی اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ اس نے فوراً ہی اسے دھکا دے کر اپنے پاس سے ہٹانا چاہا مگر وہ صرف اسے ہاتھ ہی لگا سکی۔ دھکا دینے بجتی طاقت اس کے جسم میں بھی ہی نہیں۔ بے بسی کے شدید احساس میں گھر کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"کچھ چاہیے صبا!" وہ اس کے ہاتھ لگائے پر یہی سمجھا کہ شاید اسے کچھ چاہیے۔

"آپ میرے کمرے سے چلے جائیں۔" اسے خوشی ہوئی کہ وہ کچھ اور نہیں کر سکتی کم از کم بول تو سکتی تھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تمہیں بخار ہو رہا ہے۔" اس نے اسے ہٹانا چاہا۔

"مجھے جو بھی ہو رہا ہے آپ یہاں سے جائیں۔"

اس نے جواباً پٹانے کی کوشش کی مگر زیادہ زور سے پٹا نہیں سکی۔ اس نے اپنی آنکھیں اس طرح بند کی ہوئی تھیں جیسے اس کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھول کر کوئی اندر آیا تھا۔ وہ دھڑکیں مارتی اور اس کی آواز پہچان گئی تھی۔ وہ کچھ لے کر آئی تھی۔ وہ اس کے بارے میں اور غلطی سے کچھ بولی تھی۔

"ہاں یہ ٹرے یہاں نہیں پر رکھ دو۔" ارغٹنی نے اسے جواب دیا۔ ابھی شاید وہ واپس بھی نہیں گئی تھی کہ ایک دوسری آواز آئی۔ یہ ڈیڈی کی آواز تھی۔ ڈیڈی کی آواز سنتے ہی اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اس کے بالکل قریب کھڑے بہت تشویش سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ارغٹنی انہیں بیٹھنے کے لیے جگہ دیتا تھا اس کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔ اس کے اٹھنے ہی وہ پر سکون ہو گئی تھی۔ ارغٹنی بیڈ کے پاس ہی کھڑا انہیں اس کی طبیعت کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ اس کی باتیں سنتے ہوئے دیکھ صبا کو رہے تھے ان کی

آنکھوں میں اس کے لیے بہت فکر تھی۔

"آپ صبا کو ناشتہ کروائیں ڈیڈی! میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" وہ ڈیڈی سے کہتے ہوئے کمرے سے چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"طبیعت کیوں خراب کر لی بیٹا؟" ٹرے سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر بیڈ پر رکھتے ہوئے انہوں نے اس سے پوچھا۔ وہ جواباً خاموش رہی۔ وہ اب اس کے لیے سلاکس پر کھین لگا رہے تھے۔

"نیم بجی لگاؤں؟" انہوں نے آہستگی سے پوچھا اس نے فوراً سر ہلادیا۔ کل وہ پھر اور رات کے کھانے میں اس نے صرف چند لمحے کھائے تھے اور اب اچانک ہی اسے بھوک کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے دو دو کا گلاس خالی کیا ہی تھا کہ بابا بھی کمرے میں آ گئے۔

"ہم لوگوں کو ڈرانے اور پریشان کرنے کے احترام ہو رہے ہیں۔" انہوں نے مصنوعی غلطی سے اسے گھورا۔ وہ کچھ شرمندہ سی ہوئی زبردستی مسکرائی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں بابا۔"

"ہاں۔ کتنی ٹھیک ہو! یہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔ وہ بھی بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ بابا اور ڈیڈی دونوں کے چروں پر اس کے لیے بہت سارا فکر مندی اور پریشانی تھی۔ وہ بظاہر اس کے ساتھ اسے ادھر کی باتیں کر رہے تھے مگر ان کی آنکھوں سے اسے اور پریشانی چمک رہی تھی۔

ارغٹنی دوبارہ کمرے میں آیا تو آفس کے لیے ہو کر۔ "میں آفس جا رہا ہوں بابا! آپ لوگ تو میرے پاس۔" بابا نے سر ہل کر اسے جانے کی اجازت دی تو ان دونوں کو خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے اپنے خدا حافظ کہا۔

ڈیڈی مسلسل اس کے پاس بیٹھ رہے تھے۔ اس کو اس کے آکر سیدھا اس کے پاس آ لیا۔ اس نے اسے لپٹا کر خوب پیار کیا۔ وہ اس کے ساتھ کرتے ہوئے خوش ہو رہی تھی اور ڈیڈی اسے

خوش ہو رہے تھے۔ وہ دوسرے کھانے کے بعد لیٹ کر سو گیا تھا۔ شام تک اس کی حالت کا کھانا ان سب نے حسب معمول ساتھ دیا۔ کھانے کی میز پر بالکل خاموش تھی۔ معدی کی ہلکی ہلکی باتیں جو اب دے رہی تھی۔ وہ ملتا تھا کہ یہ خاموشی بلکہ جیڑاری صرف اور اس کے لیے ہے لیکن وہ انجان بنایا کے ساتھ اس کے کچھ مسائل ڈسکس کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اس کے فوراً بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی اور اس کے کمرے میں آئے تھے اسے دوا کھلا کر دے کر کے اپنے کمرے میں سونے چلے گئے۔

غالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ کمرے کی آواز پر وہ بے ساختہ چوکی۔

بلیک ٹاک کیے میرے کمرے میں کیوں آئے؟ اسے پاس آتے سینو ز بھی نہیں ہیں کہ کسی کو گھر لے۔" وہ بہت غصے سے چیختی تھی مگر اس کی بات پر دھیان دینے بغیر دروازہ کھلا اور اس کی بات کاٹ کر ہوا بہت سکون ہوا۔

اس نے کچھ بھی کہنا ہے وہ ضرور کہو مگر آہستہ آہستہ اپنے بغیر بھی بولو گی تو میں تمہاری باتوں کا اور سمجھ بھی اوں گا۔" وہ اب واپس آ کر کمرے کا کھانا بہت غصے میں اس نے بیڈ پر لیٹ کر باتوں پر پھیلا دیا۔ اس کا بیڈ پر بیٹھنے کا اس کے بیٹھنے سے پہلے وہاں سے اٹھ

اسے آرام سے بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے۔" اس کی جگہ سے پوچھا۔ "اس رشتے سے درمیان بہت سارے رشتے تھے کیا تم ہو گئے ہیں۔ تم مجھے بتاؤ تمہارے رشتے تم کس وجہ سے اتنی خین ہو۔" اس نے اس سے مخاطب تھا۔ بیڈ پر بیٹھے

ہوئے دوبارہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ سامنے کھڑی بہت غصے اور نفرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"وہ سارے رشتے میں نے نہیں، آپ نے ختم کیے ہیں۔ آپ نے رکھا تھا یہ پروڈنل مہما کے سامنے۔ اگر آپ نے یہ بات اپنے منہ سے نہ کہی ہوتی تو مہما کبھی مجھے اس شادی کے لیے مجبور نہ کرتیں۔" اس کے لیے میں وہ کتنی وہ گڑواہٹ تھی جو اس کے مزاج کا حصہ ہی نہیں تھی۔

"میری شادی کا انشوا اس طرح نہ اٹھتا اگر آپ نے خود کو مہما کے سامنے پیش نہ کیا ہو تا اور اگر فرض کر لیں کہ اٹھتا بھی تو مہما میرے لیے کہیں اور رشتہ ڈھونڈتیں۔ وہ آپ سے بھی انجانہ کر تیں۔ میری زندگی میں پیدا ہونے والی اس مصیبت کی وجہ آپ ہیں۔" وہ اس کی غلطی اور تقصیر سے اس کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں مان لیتا ہوں، ساری غلطی میری ہے لیکن تم یہ بھی تو سوچو کہ میری اس غلطی نے مہما کو کتنا سکون دیا ہے۔ اپنے منہ سے چاہے مجھ سے یہ بات نہ کہیں مگر میں جانتا ہوں کہ دل سے یہی چاہتی تھیں پھر وہ دل کی بات زبان پر نہ لاتیں اور یہ بخلتیں اپنے دل میں لیے ہی ہم لوگوں سے جدا ہو جائیں۔ تمہیں اچھا نہیں لگتا یہ سوچ کر کہ ہمارے اس رشتے نے مہما کو کتنی بڑی خوشی دی ہے۔" اس کا لہجہ بیشک کی سی نرمی اور مٹھاس لیے ہوئے تھا۔ اس میں ذرا سا بھی غصہ اور ناراضگی شامل نہیں تھی۔ وہ اس کی باتوں سے زیادہ اس کے لہجے پر مشغول ہوئی۔

"یہ جو آپ میرے ساتھ بہت اچھے اور پیارے رشتے کی کوشش کرتے ہیں، بہت پولاٹ بہت سوخت اسپوکن۔ مت بنا کریں میرے سامنے اتنے اچھے مجھے آپ کی اچھائیوں سے نفرت ہے۔ میری یہ بات آپ کلن کھول کر سن لیں مسٹر ارغٹنی! غصہ انہیں نے مہما کی وجہ سے مجھ پر کیا۔ اس رشتے کے لیے باقی بھری تھی لیکن میرا دل اس رشتے کو بھی تسلیم نہیں کر سکا۔"

مرتے دم تک ہمیں زندگی کی آخری سانس تک نہیں۔ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں ہمیں انکار نہیں کر سکتی۔ اب آپ میرے کمرے سے جا سکتے ہیں۔“ وہ اس پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈال کر اب دروازے کی طرف اشارہ کیے کھڑی تھی۔ گویا اسے باہر جانے کا راستہ بتا رہی ہو۔

”تم اس وقت بہت غصے میں ہو“ تم بعد میں بات کریں گے۔“ وہ جیسے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے بند پر سے اٹھ اٹھا۔

”آپ میرے ساتھ کبھی بھی بات کریں، میرا جواب پیش کی ہوگا۔ میں کبھی بھی اس رشتے کو دل سے قبول نہیں کروں گی۔“

تمہاری علیحدگی کا فیصلہ ہم نے خوشی سے نہیں کیا تھا۔ بعض فیصلے کرتے وقت دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے لیکن پھر بھی ہمیں وہ فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ ایسا ہی فیصلہ وہ بھی تھا۔ تم نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا تو ایسا میں نے بھی نہیں سوچا تھا۔ اگر مجھے اس رشتے میں قبول کرنا تمہارے لیے مشکل ہے تو میرے لیے بھی تمہیں اس بدلے ہوئے رشتے میں قبول کرنا بہت مشکل ہے۔ میں نے کبھی تمہیں اس نظریے سے نہیں دیکھا۔ تم جانتی ہو میں تم سے کتنی محبت کرتا تھا۔ اس کے بعد کسی دوسری عورت کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا میرے پاس کوئی تصور ہی نہیں تھا اور دوسری بھی کوئی اور نہیں تم پر۔ ایک ایسا فیصلہ تھا جو مجھے ہم سب کی بہتری کے لیے کرنا پڑا۔ ہمارے اس گھر کے لیے ہمارے والدین کے لیے ان کی خوشیوں کے لیے۔“ وہ اس کے سامنے آکر رک گیا تھا۔ ایک ایک لفظ اس نے بہت گھر گھر کر بولا تھا۔ یوں جیسے وہ ساری صورت حال اسے اچھی طرح سمجھنا چاہتا تھا۔

صبا کے چہرے پر مہجور ناثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس پر اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس پر وہی سختی وہی کھردرائی اور وہی تلخی ابھی بھی موجود تھی۔ وہ اسی طرح دروازے کی سمت اشارہ کرتی اس کے باہر نکل جانے کی حکمت تھی۔ ار تفتنی کو

ایسا لگا جیسے وہ کسی پتھر سے سر ٹکرا رہا ہے۔ وہ کچھ ہی غمیں چاہتی تھی۔ ار تفتنی کو اپنا مزید کچھ کرنا پڑا۔ بے کار نظر آیا۔ وہ ہار مانتے والے انداز میں دروازے کی طرف چلا گیا۔ اسے کمرے سے نکلتا دیکھ کر وہ بند پڑنے لگی۔

وہ مرنے چاہتی تھی مگر کس طرح مرے؟ وہ دل کے جھجکے کی سائلوں سے اپنے آپ سے نفرت کر رہی تھی مگر اب اپنے آپ سے یہ نفرت شدید ہوتی جا رہی تھی۔ اسے نہ خود پر ترس آتا تھا اور نہ سے ہمدردی ہوتی تھی۔ اسے بس خود سے نفرت تھی۔ صرف اور صرف نفرت۔ پہلے سے بھی زیادہ شدید نفرت۔



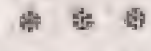
اسے یوں سب سے لا تعلقی اور یکاگی کا رویہ اختیار کر کے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ وہ سارا دن اپنے کمرے میں رہتی تھی۔ بابا اور ڈیڈی میں سے بھی کسی سے اسے کھانے کے لیے بلانے آتا تو وہ سب کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کر دیتی۔ رہنما صبا کے ہاتھ اس کے کمرے میں کھانا بھجوا دیتا تو وہ کھانا کھا لیتی۔ اس کا خیال تھا چند دنوں تک ناراضی کا اظہار کرنے کے بعد خود ناراض ہو جائے گی مگر جب اس کے دماغ میں کوئی تبدیلی نہ آئی تو ڈیڈی کی طرح بابا بھی اس بات پر غصیدگی سے لینے پر مجبور ہو گئے۔ وہ اس کے پاس آئے، نیوٹھ کی طرح پیاد بھرے لیے میں وہ اسے سمجھانے لگے۔

”صبا! اس طرح کر کے تم پیچھے کو تکلیف پہنچا رہی ہو۔ اگر اس کی خوشی کی خاطر تم اس شادی کے راضی ہوئی تھیں تو اب اس کی خوشی ہی کے لیے تمہیں اسے ماننا بھی ہوگا۔ تم نے اگر اپنی ماں کے اپنے دل کی مرضی کے خلاف ایک فیصلہ کر لیا ہے تو اب اسے نبھانا بھی۔ ورنہ تمہارا ایثار اور بیٹی صبا ہو جائے گی۔“ وہ بے حسی سے بیٹھی انہیں بولا۔ وہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی نرمی

نہیں ہو ا تھا۔ لگے یا وہ تم نے مجھ سے اس شادی کے لیے کہتے ہوئے کیا کہا تھا۔ میں جانتا ہوں، تم ایسا چاہتی تھیں۔ تمہارے لیے ار تفتنی کو شوہر کی حیثیت میں قبول کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ تبدیلی کے لیے ناقابل قبول ہے لیکن صبا! تم ار تفتنی کا رونا دھونا۔ تمہاری طرح اسے بھی تو یہ تبدیلی کر رہی ہوگی۔ اس نے بھی تو کبھی یہ نہیں سوچا کہ وہ تم سے شادی کرے گا۔ وہ اس تبدیلی کو قبول کرے گا تو تم کیوں نہیں۔ کو شش تو کرو بیٹا! میری جان کر دیکھو کچھ وقت لگے گا لیکن آہستہ آہستہ تم اپنی کو قبول کر لو گی۔ خود کو یوں سب سے الگ نہ رکھو۔ ار تفتنی کے ساتھ وقت گزارو۔ باتیں پہلے کی طرح۔ وہ تمہارا کزن بھی تو ہے۔ زندگی کا ہم سب انسان کے دل کو اللہ نے بڑا عجیب بنایا ہے۔ تبدیلیوں کو قبول کر لیتا ہے۔ وہ تمہارا بہنوئی بھی ہے۔ اب نہیں ہے۔ جب بہن نہیں رہی تو وہ رشتہ تو ہی ختم ہو گیا۔“ انہوں نے بڑی ہمدردی اور محبت سے اسے قائل کرنا چاہا مگر وہ قائل ہونے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ وہ اسی لا تعلقی سے خاموش بیٹھی رہا۔ اسے خود کو بہت سے بس برا محسوس کیا تھا۔

تفتنی بابا اور ڈیڈی کی پریشانی دیکھ رہا تھا۔ ڈیڈی جو بہت سے بہت خاموش اور گھٹے ہوئے رہتے تھے۔ اچانک ہی وہ ماں کو بھی نظر آنے لگے تھے۔ ڈیڈی کی کی وجہ سے آجس کے بعد شہام کا پورا دل پر لڑائے لگا تھا لیکن اس کی یہ تمام کوششیں اس گھر کی خاموشی اور دیرانی کو دور نہیں کر پاتی تھیں۔ اس گھر سے ماں کیا گئی تھی اپنے ساتھ ساری باتیں بھی لے گئی تھیں۔ وہاں اسے عورت کا وجود ہر جگہ ہر رشتہ میں ختم ہو جاتا تھا۔ وہاں اواسیوں کے پاس نہ تھا۔ وہاں نہ تھا۔ معذرت کے پاس نہ تھا۔ جھڑک کر بھاگ دیتی۔ وہ اس کی ڈانٹوں اور گھبراہٹوں کے باوجود بھی اس کے پاس جاتا نہیں بیٹھو۔ وہ اپنے ماں کی ڈانٹ اور مار پر روٹا اس کی گود میں

منہ چھپا کر ہے۔ وہ اس کے لیے اس کی ماں کی طرح ہی تھی۔ صرف ایک سال کی عمر میں اس سے سکی ماں چھین گئی تھی۔ ماں کے بعد وہ دوسرا سر اسے جو باکل ماں جیسا ہی لگا تھا وہ اسی کا تھا۔ وہ اس سے تھا تھا اس کے دماغ پر اس سے بد ظن تھا لیکن بھر بھی وہ اس کے پاس جاتا چاہتا تھا۔



ار تفتنی آفس کے کیم سے لاہور اور اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ وہاں سے دو دن بعد اس کی واپسی ہوئی تو اسے بابا کی ڈیڈی کی طبیعت کے بارے میں پتا چلا۔ ان کا بلڈ پریشر بہت بڑھا ہوا تھا۔ بابا ان کی طرف سے فکر مند تھے۔ ڈاکٹر کے پاس جانے اور دوا لینے سے بظاہر ان کا بی بی نارمل ہو گیا تھا مگر جو پریشانی انہیں لاحق تھی ان کے ساتھ اس کا زیادہ دیر تک نارمل رہنا ممکن نہیں تھا۔ ار تفتنی ان کی پریشانی اور بیماری کی وجہ سمجھتا تھا۔

بے درپے گھومنے انہیں بڑا حال کر دیتا تھا۔ کھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلنے سے پہلے وہ روزانہ کی طرح صبا کے کمرے میں گئے تھے۔ ار تفتنی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جا رہا تھا جب اس نے ڈیڈی کو صبا کے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کا لڑاؤ تھا کہ ڈیڈی صبا کے پاس سے آیا میں پھر وہ ان کے پاس جائے گا۔ وہ ان کے ساتھ ہلکی چٹائی کپ شپ کرنا چاہتا تھا۔

بہتر بیٹھ کر اس نے سائینڈ ٹیبل پر سے وہ کتاب اٹھا لی جو چھپنے دس بارہ دنوں سے اس کے زیر مطالعہ تھی۔ اسے رات میں کچھ نہ کچھ پڑھ کر سوئے کی عادت تھی اور یہ کتاب آج کل اس کی بیڈ بک بنی ہوئی تھی۔ ابھی اس نے پہلا کھل ایک پیڑا اگر ان ہی پر ہوا تھا کہ اسے صبا کی تو آواز آئی۔ وہ زور سے چلائی تھی۔ ار تفتنی کتاب بند پر رکھتے ہوئے گھبرا کر اٹھا۔ اگر اس نے ابو سے کچھ ان سیدھا بول دیا تو ان کی طبیعت فی الحال ایسی نہیں ہے کہ وہ اسے برداشت کر سکیں۔ وہ تقریباً بھانپتا ہوا اپنے کمرے سے نکل کر اس کے کمرے میں آیا تھا۔

”جسے دیکھو مجھے سمجھانے اور نصیحتیں کرنے چلا آتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا“ آپ لوگ مجھ سے آخر چاہتے کیا ہیں؟“ وہ بہت چڑچڑے انداز میں بڑی تلخی سے بول رہی تھی۔ ڈیڈی بیڈ پر بیٹھے تھے اور وہ سامنے دیوار کے پاس کھڑی تھی۔ ڈیڈی نے اس سے کیا کہا ہوگا؟ وہ نہیں جانتا تھا لیکن جواب میں جو کچھ وہ بول رہی تھی اسے وہ سن رہا تھا۔ اسے کمرے میں آتا دیکھ کر وہ ذرا بھی نہیں چونکی تھی۔

”میری شادی آپ لوگوں نے اپنی پسند سے کی تھی۔ جہاں آپ لوگوں نے کہا میں نے شادی کروالی۔ آپ لوگوں نے میرے لیے صحیح شخص کا انتخاب نہیں کیا۔ یہ غلطی آپ لوگوں کی تھی میرا اس میں کیا قصور تھا لیکن اس کی سزا مجھے ملی۔“ اس کے لہجے کی گستاخی نے ار تفتی کا خون کھولا دیا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے پاس آیا اور بے اختیار اس کے منہ پر ایک تھپڑ مار دیا۔ ”تم تمیز تہذیب سب بھول چکی ہو۔ تمہیں اتنا بھی لحاظ نہیں کہ اس وقت تم اپنے باپ سے مخاطب ہو۔“ وہ اتنی زور سے دھاڑا تھا کہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے لیٹے ہوئے بابا بھی چونک گئے تھے۔ وہ پھنپھن گئے پر ایک دم خاموش ہو گئی تھی۔ اپنے بائیں گال پر ہاتھ رکھے وہ سکے کے عالم میں کھڑی تھی۔ ڈیڈی بیڈ پر سے یک لخت اٹھ گئے تھے۔ انہوں نے نہ ار تفتی کو کچھ کہا اور نہ صبا کو۔ وہ خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھ گئے تھے۔

”کیا ہوا ہے شفیق؟“ بابا بوکھلائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

”کچھ نہیں۔“ وہ مختصراً جواب دے کر کمرے سے نکل گئے۔ انہوں نے نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں پہلے ڈیڈی کو دیکھا اور پھر ار تفتی اور صبا کو۔

”صبا! اگر ڈیڈی کو کچھ ہوا ناں تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ اسے وارننگ دیتا دروازے کی طرف بڑھا۔ بابا اس کی بات سن کر اس سے بھی پہلے کمرے سے نکل کر ڈیڈی کے کمرے کی طرف بھاگے تھے۔ ار تفتی بھی ان کے پیچھے پیچھے ڈیڈی کے کمرے

میں آیا تھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ ان دونوں کو مثلاً وہ یقین دلانے کے لیے مسکراتے ہوئے بولے۔

”آپ اس کی فکر کیوں کرتے ہیں ڈیڈی! آپ کے حال پر چھوڑ دیں، آپ اس کے لیے خود مت کریں پلیز۔“ وہ ان کے ہاتھ تھام کر بولا۔ پریشانی دور کرنے کے لیے مسلسل مسکراتے بہت دیر تک وہ اور بابا وہیں بیٹھے ان کے ساتھ کرتے رہے تھے۔ صبا کے بارے میں بات کرتے علاوہ وہ لوگ باقی ہر موضوع پر بات کر رہے تھے۔

”ار تفتی! تم جاؤ رات کافی ہو گئی ہے۔ میں شفیق کے پاس۔ ہم دونوں بھائی ابھی جاگ کر ساری باتیں کریں گے۔“ بابا نے گھڑی میں ایک دیکھ کر اسے سونے کے لیے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے دونوں کو شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکل آیا۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کے وہ لان میں آگیا تھا۔ مضطرب تھا یونہی لان میں بے چین پھرتے اسے ڈھائی گھنٹے گزر گئے تھے مگر اس کی بے چینی ختم ہوئی تھی۔

”تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں تمہیں ایک زوردار ماروں تو تم جواب میں کیا کرو گی؟“

”آپ مجھے کبھی مار ہی نہیں سکتے۔“

”بھئی فرض کر لو۔“

”مجھے بہت دکھ ہوگا میں روؤں گی۔“

”اوہ میرے خدا۔“ وہ اچانک ہی اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے صبا کو پھنپھناتا رہا۔ اس کے بے یقین کیا ہے۔ کتنا یقین تھا اسے اس بات سے کہ اسے کبھی مار نہیں سکتا۔ وہ اسے کبھی کوئی دکھ دے سکتا اور آج وہ اسے دکھ دے آیا تھا۔

”مجھے بہت دکھ ہوگا میں روؤں گی۔“ کیا اس

وہ رو نہیں رہی ہوگی؟ وہ ایک دم ہی کرسی پر سے اٹھ اور تیزی سے درمیانی راستہ عبور کر کے گھر کے آگیا۔ اس کا رخ صبا کے کمرے کی طرف تھا۔ کھول کر اندر آیا تو وہ جس دیوار کے ساتھ اس

ہوئی تھی اب اسی سے کمر نکالے گھٹنوں پر سر ٹکائی تھی۔ وہ اس کے پاس آگیا کارپٹ پر وہ اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

”ام سو ری صبا!“ اس نے اس کے سر پر ہلکے سے کھلا۔ اسے یہ بات یاد نہیں آ رہی تھی کہ سو ری میں صبا کو بولنا چاہیے۔ اپنے پچھلے تمام رویوں کو کمرے کے ہر فرد سے۔ خاص طور پر ڈیڈی سے۔

”مجھے تمہارے ساتھ اس طرح مس لی ہو نہیں سکتی تھی۔“ وہ گھٹنوں پر سے اس کا سر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”میں نے بہت غلط حرکت کی تھی اس بد تمیزی کی میرے پاس کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ رو نہیں رہی تھی دکھ بھی اس کی آنکھوں میں تھا کہ نہیں لیکن وہ اس کے بائیں گال پر ہاتھ رکھ رہا تھا۔ اسے خود پر نئے سرے سے غصہ

ڈیڈی دیر یونہی اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ بالکل صاف طرح دیوار سے ٹیک لگا کر اس کے برابر بیٹھ

”صبا! تمہیں پتا ہے ہماری ماں باپ ہمارے لیے جہاں کی طرف سے سب سے بہترین انعام ہوتے ہیں؟“ وہ نے ماں کھولی ہے بہت چاہنے والی ماں۔ کیا تم بات کا حوصلہ رکھتی ہو کہ باپ کو بھی کھو دو۔ باپ مار کرنے والے بابا کو کھو دو۔ مجھے اب بہت برے حالات آنے لگے ہیں۔ اپنے اتنے پیاروں کو صبح آنا فنا“ رخصت ہوتے دیکھا ہے نا صبا! میں بہت ڈر گیا ہوں۔ پہلے شمن پھر ماں اور مجھے بہت ڈر لگتا ہے صبا! کیا تمہیں نہیں ہمارے لیے دعائیں کرنے والے سب لوگ بہت رخصت ہوتے چلے جا رہے ہیں صبا! یہ سب سچ ہے۔ ہم ان لوگوں میں سے کیوں نہیں ہیں؟ ان کی قدر و منزلت ان کی زندگی میں نہیں ان کے مرنے کے بعد پہچانتے ہیں۔ بعد میں سب سے کیا حاصل۔ والدین سے محبت کرنی ہے۔ ان کی قدر کرنی ہے ان کی قدر کرنی ہے تو ان کی

زندگی میں کرو۔ عبادت گاہے پان گنوائے کے لیے بہت کچھ اب بچا ہی نہیں ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں یہ بے لوث اور انمول چاہت ہم سے چھین نہ جائے۔ ہمارا انگوٹہ دیکھو ایسا نہ ہو جو اس طرح جن کانل دکھائے کہ وہ دنیا ہی سے منہ موڑ جائیں۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کی آواز اتنی ہلکی تھی جیسے وہ سرگوشی کر رہا ہو۔ جملے کے اختتام پر جو اس نے سوالیہ انداز اختیار کیا تھا اس پر اس نے ایک دم چونک کر کارپٹ سے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ وہی چھوٹی سی ضدی سی صاحبہ تھی اور وہ وہی پیپور سمار ٹفنی۔ درمیان کے تمام سال جیسے کہیں غائب ہو گئے تھے۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”تم اس رشتے کو تسلیم نہیں کرتیں۔ میں اسے ماننے کے لیے چھپیں بھی، مجبور بھی نہیں کروں گا لیکن عبادت گاہے ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ بات صرف میرے اور تمہارے درمیان رہے۔ تمہارے لیے کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ میں تمہاری پانچ بیٹی سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ کیا تمہارا اور ڈیڈی کی خاطر ان کی خوشی کے لیے ان کی صحت اور ان کی سلامتی کے لیے انہیں یہ تاثر نہیں دے سکتیں کہ تم نے اس شادی کو قبول کر لیا ہے۔ ہم یہ راز کیا صرف خود تک محدود نہیں رکھ سکتے؟“ وہ دوبارہ اسی ہلکی آواز میں بول رہا تھا۔ اس نے صبا پر سے نظریں ہٹائی تھیں لیکن وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”صبا بابا اور ڈیڈی مجھے بہت عزیز ہیں، تمہیں بھی ہیں۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا صبا! تو ہم کیا کریں گے؟“ اس کے چہرے پر اوا سی اور فکر مند چھائی ہوئی تھی۔ خاموشی کا ایک طویل وقفہ ان دونوں کے درمیان آیا تھا۔ دوا پر لگا کلینڈر شاید ہوا سے ہلاتا تھا اس کے پتے پر وہ دونوں چوکنے لگے۔ گہری صبح کے ساڑھے چار بج رہی تھی۔ وہ بغیر کچھ کے اس کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔ اس نے صبا سے اپنی کسی بات کا جواب نہیں مانگا تھا۔ اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ اس کی بات سے

اتفاق کرتی ہے یا نہیں لیکن اسے جواب کا انتظار اور یہ انتظار زیادہ لمبا بھی نہیں ہوا تھا۔ بابا نے روزانہ کی طرح درجنوں سے اسے ملنے کے لیے بلوایا تھا وہ منع کر دیا کرتی تھی مگر وہ اسے ہاتھ ترک نہیں کرتے تھے۔ حیرت اور خوشی کے شعلے احسانات سے وہ اس وقت دو چار ہوئے جب اس نے باٹے پر دست چھپکائے ہوئے انداز میں ڈانٹنگ میں داخل ہوئی۔ کسی کی بھی طرف دیکھے بغیر اس سلام کیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے شرمندگی اور ندامت چھلکی ہوئی تھی۔ وہ نہ بابا کی طرف دیکھ رہی تھی اور نہ ڈیڈی کی طرف۔ بابا اس شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اس طرح ظاہر ہوئے گئے جیسے ان دونوں میں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

”آج تم بھی ہمارے ساتھ صبح سے ناشتہ کی خالی دودھ میں بھی کوئی مزاج۔“ انہوں نے اس سامنے آلیٹ کی پلیٹ رکھتے ہوئے کہا۔ اس پلیٹ اپنے سامنے کر لی اور آلیٹ کھانے لگی۔ بابا نے گاہے گاہے اس کی طرف دیکھ کر ضرور رہے تھے۔ انہوں نے اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ چھٹی کا دن اس لیے نہ بابا اور ار تفتی کو آس جانے کی فکر نہ تھی نہ معاذ کو اسکول کی ٹینشن۔ ناشتہ کرتے ہوئے سامنے پھیلائے ار تفتی معاذ کو اخبار کے اچھے صفحے میں سے اس کی پسند کی خبریں پڑھ کر دیتا تھا۔ وہ اپنے پسندیدہ کھلاڑیوں کی تصویریں ان کے متعلق دی گئی خبر سننا چاہتا تھا۔ ار تفتی اب اس میں اصل جملہ پڑھتے ہوئے اسے آسان لگتا تھا۔ ایسا کہ وہ اسے سمجھ سکے۔ بتاتے ہوئے ناشتہ مصروف تھا۔ ار تفتی اسے دیکھ کر کسی قسم کی خوشی کا اظہار کیے بغیر معاذ کے ساتھ مصروف رہتا۔ البتہ صبا کی طرف پوری طرح متوجہ تھے۔ ڈیڈی بھی تھے لیکن وہ بول کچھ نہیں رہے تھے۔ ”کیا خیال ہے آپ سب لوگوں کا؟“ انہوں نے گھومنے لگی۔ ”ناشتہ ختم کر کے سب اپنے اپنے کمرے چلے گئے۔“ ناشتہ ختم کر کے سب اپنے اپنے کمرے چلے گئے۔ جب ار تفتی نے ایک وقت سب کو جھانپ کر دیکھا تو اس نے ایک لمحہ کے لیے اس کی طرف دیکھا۔

”بابا! سب سے پہلے جواب معاذ کو ہی دینا تھا اور اس نے دیا بھی تھا۔“ بابا نے کہا۔ ”تمہارا صبا! امروں سے تمہارا چلنے کا؟“ اس نے براہ راست اسے مخاطب کیا۔ اپنی اسی ٹون میں وہ اس سے بات کیا کرنا تھا اس نے جواب دیا تھا۔ بابا کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ایک ہی لمحہ میں بابا کی پلیٹ ہو گئی وہ حیران تھے۔ رات میں صبا سے تفتی بد مزاجی کی گئی بابا کو وہ بات یاد تھی۔ معاذ اور صبا کی طرح بابا بھی جانے کی فکر ہو گئے تھے لیکن ڈیڈی کا جانے کا موڑ آفرین کے نام سے بیزار نظر آ رہے تھے۔ ایک دن جب ار تفتی بابا امروں نہیں ہے۔ وہ منع کرتے کر سی پر سے اٹھتے گئے تو وہ بہت آواز دیا۔

”آپ بھی چلیں پلین۔“ اس کی نظریں صبا پر تھیں لیکن وہ مخاطب ان سے تھی۔ ”پلین؟“ وہ پوچھا اور تفتی نہیں کرواؤ گے۔“ بابا نے تفتی کی طرف سے گھور کر ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ پہلے ہی بہت شرمندہ نظر آ رہی ہے۔ شرمندہ مت کرو۔ ڈیڈی ان کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گئے تھے لیکن ان کا جانے کی بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

رات کی باتوں سے انہیں سخت تکلیف پہنچی تھی۔ اب اسے بٹھا کر یہ بتائیں کہ انہیں اس صحت ہے اپنی جان سے بھی زیادہ اپنی جان کی فکر ہے اگر انہیں اس کے لیے خوشیاں خریدنی پڑیں گی۔

”تمہیں بتا رہا ہوں معاذ! جب چلنے کو کہیں تو فوراً مان جائو۔“ ار تفتی نے کیسٹ لگاتے ہوئے اسے وارننگ دی تو اس نے جھٹ گردن ہلا دی۔ وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر معاذ کے برابر میں بیٹھی تھی۔ وہ چہرے پر حیرت کا بہت واضح تاثر لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے مخاطب کرتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا لیکن وہ اس سے بات کیے بغیر وہ بھی نہیں سکتا تھا۔

”آپ ہمارے ساتھ کرکٹ کھیلیں گی؟“ ”لوگیاں کرکٹ نہیں کھیلیں۔ تم بابا لوگوں کے ساتھ کھیلنا نہیں چاہتے ہوئے نہ کھوں گی۔“ اس نے بغیر جھڑکے اس کی بات کا جواب دیا۔ اگرچہ لہجے میں وہ شوخی اور وہ شرارت نہیں تھی جو اس سے بات کرتے وقت خود بخود ہی پیدا ہو جاتا کرتی تھی لیکن سختی اور کرختگی بھی نہیں تھی۔

وہ لوگ ساحل پر آ گئے تھے۔ بابا، ار تفتی اور معاذ کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھے۔ یعنی تیزی سے معاذ کے موڈ تبدیل ہو رہے تھے۔ اتنی تیزی سے ان کے کھیل بھی تبدیل ہوتے جارہے تھے۔ اسے اتنی سی دیر میں ڈھیر سارے کھیل کھیلنے لگے۔ ڈیڈی بابا اور معاذ کے بلانے پر بھی کھیلنے کے لیے نہیں آتے تھے۔ ”میں اور صبا تماشا خان ہیں۔“ انہوں نے معاذ سے کہا۔ وہ ان لوگوں کو کھیلنے ہوئے دیکھ رہے تھے اور وہ ان کے برابر میں بیٹھی خود ان کو۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی ان سے معافی مانگنے کی۔ وہ بس خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ رشتہ بہت انمول اور بہت قیمتی ہے۔ اگر ایک بار کھو جائے تو پھر دنیا کی بھرپور دوا بارہ بھی ملتا نہیں ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہے تھے مگر پھر بھی اس کے احسانات سے بخوبی آگاہ تھے۔ باب تھے اس کے اس کی شرمندگی اور آنکھوں کی التجا بغیر دیکھے بھی محسوس کر سکتے تھے۔ وہ اس انتظار میں بیٹھنے نہیں رہ سکتے تھے کہ وہ معافی مانگنے کی تو میں تب ہی معاف کروں گا۔ بغیر کچھ کے انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ان کے اس طرح کرنے سے اس کی ہمت بندھ گئی تھی۔

ارتضیٰ، صبا کا تایا زاد بھائی تھا۔ صبا، ارتضیٰ سے سات سال چھوٹی تھی، وہ گھر بھر کی لاڈلی ہونے کے ساتھ ارتضیٰ کی بہت پیاری سی دوست بھی تھی۔ جس کا وہ ہمیشہ خیال رکھتا تھا۔ اور صبا اس سے بہت متاثر تھی۔
 ارتضیٰ کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس محرومی، غیر معمولی ذہانت، قابل رشک تعلیمی کارکردگی اور خداداد وجاہت کے باعث وہ بچپن سے ہی توجہ کا مرکز رہا۔ صبا اس پر بہت انحصار کرتی تھی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ، جذبہ ایک نئے رنگ میں ڈھل گیا اور اس کا احساس اسے اس وقت ہوا جب اس کی بہن ثمن سڈنی (آسٹریلیا) سے مستقل پاکستان آ گئی۔

ثمن کو بچپن میں اس کے ماموں اور عمائی اولاد نہ ہونے کی بنا پر بیٹی بنا کر لے گئے تھے۔ ایک حادثے میں وہ جاں بحق ہو گئے تو ثمن اپنے حقیقی ماں باپ کے پاس واپس آ گئی۔ یہاں آکر وہ بمشکل اس ماحول میں ایڈجسٹ ہو پائی اور ارتضیٰ نے اس ایڈجسٹمنٹ میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی دوران اس نے ثمن کو اپنے دل میں وہ مقام دے دیا جس تک صبا بھی رسائی حاصل نہیں کر سکی تھی۔ صبا اس کے لیے ہمیشہ ایک چھوٹی سی بچی رہی تھی۔ خود صبا اپنے جذبات سے لاعلم تھی۔ ارتضیٰ کی توجہ ثمن کی جانب پا کر وہ کشمکش کا شکار ہو جاتی۔ بیک وقت وہ شدید محبت اور رقابت کے جذباتوں میں گھر گئی تھی۔

منفرد کیفیات کے باعث اس کی اپنی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگی۔

بالآخر ثمن اور راضی کی شادی ہو گئی۔ اور صبا اپنے جذبات کا کلا کھونٹ کر خاموش ہو گئی۔ وہ احتجاج بھی نہیں کر سکی۔ اس لیے کہ راضی نے ہی اسے قابل توجہ نہیں سمجھا تھا۔ وہ اسے چھوٹی بچی ہی سمجھتا رہا۔ جبکہ وہ اپنی عمر سے کہیں آگے کا سفر طے کر چکی تھی۔ شادی کی رات، جذبات کی شدت میں بے اختیار ثمن کے مرنے کی دُعا مانگی۔ شادی کے بعد ثمن اور راضی لاہور چلے گئے۔ ثمن اسے اپنی خوشیوں کی سب سے بڑی دشمن نظر آتی ہے اور پھر چھٹیوں میں اسے بادل خواستہ سب کے اصرار پر ثمن کے پاس لاہور آنا پڑا۔

third part ke kuch pages
missing hain
aap us ki summary parh
ker guzara ker lein
copied from web

A handwritten signature in blue ink, featuring a large, stylized 'H' and a circular flourish on the right side.

ارتضیٰ، صبا کا تایا زاد بھائی تھا۔ صبا، ارتضیٰ سے سات سال چھوٹی تھی، وہ گھر بھر کی لاڈلی ہونے کے ساتھ ارتضیٰ کی بہت پیاری سی دوست بھی تھی۔ جس کا وہ ہمیشہ خیال رکھتا تھا۔ اور صبا اس سے بہت متاثر تھی۔
ارتضیٰ کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس محرومی، غیر معمولی ذہانت، قابل رشک تعلیمی کارکردگی اور خداداد وجاہت کے باعث وہ بچپن سے ہی توجہ کا مرکز رہا۔ صبا اس پر بہت انحصار کرتی تھی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ، جذبہ ایک نئے رنگ میں ڈھل گیا اور اس کا احساس اسے اس وقت ہوا جب اس کی بہن ثمن (اسٹریلیا) سے مستقل پاکستان آ گئی۔

ثمن کو بچپن میں اس کے ماموں اور عمائی اولاد نہ ہونے کی بنا پر بیٹی بنا کر لے گئے تھے۔ ایک حادثے میں وہ جاں بحق ہو گئے تو ثمن اپنے حقیقی ماں باپ کے پاس واپس آ گئی۔ یہاں آکر وہ بمشکل اس ماحول میں ایڈجسٹ ہو پائی اور ارتضیٰ نے اس ایڈجسٹمنٹ میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی دوران اس نے ثمن کو اپنے دل میں وہ مقام دے دیا جس تک صبا بھی رسائی حاصل نہیں کر سکی تھی۔ صبا اس کے لیے ہمیشہ ایک چھوٹی سی بچی رہی تھی۔ خود صبا اپنے جذبات سے لاعلم تھی۔ ارتضیٰ کی توجہ ثمن کی جانب پا کر وہ کشمکش کا شکار ہو جاتی۔ بیک وقت وہ شدید محبت اور رقابت کے جذباتوں میں گھر گئی تھی۔

منفاد کیفیات کے باعث اس کی اپنی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگی۔

بالآخر ثمن اور راضی کی شادی ہو گئی۔ اور صبا اپنے جذبات کا کلا کھونٹ کر خاموش ہو گئی۔ وہ احتجاج بھی نہیں کر سکی۔ اس لیے کہ راضی نے ہی اسے قابل توجہ نہیں سمجھا تھا۔ وہ اسے چھوٹی بچی ہی سمجھتا رہا۔ جبکہ وہ اپنی عمر سے کہیں آگے کا سفر طے کر چکی تھی۔ شادی کی رات، جذبات کی شدت میں بے اختیار ثمن کے مرنے کی دُعا مانگی۔ شادی کے بعد ثمن اور راضی لاہور چلے گئے۔ ثمن اسے اپنی خوشیوں کی سب سے بڑی دشمن نظر آتی ہے اور پھر چھٹیوں میں اسے بادل خواستہ سب کے اصرار پر ثمن کے پاس لاہور آنا پڑا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو تھوڑی دیر پہلے ہی لپٹی
 اٹھتی کی دیر اس وقت کو گھوڑی رہی۔ وہ عجیب
 سے احساسات سے بھرپور رہی تھی۔ اس تبدیلی کو
 قبول کرنا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ وہ نگاہ اور چلاؤ
 اٹھار اٹھتی سے نکل کر کمرے میں آئی تو کمرہ خالی پڑا
 تھا اسے وہاں ار تضحیٰ کی غیر موجودگی پر ہی اچھی لگی۔
 باہر آتے ہی وہ لگا جیت اسے کسی قید سے رہائی ملی ہو۔
 بیٹا اور بیٹی لاؤنگ میں بیٹھے اخبار کا مطالعہ کرتے
 ہوئے تھے۔ انہیں میں مختلف خیال پر تبادلہ خیال بھی
 کر رہے تھے۔ وہ ان دونوں کو سلام کرتے ہوئے کچن
 میں آئی۔ آج صبح دونوں بعد بلکہ ایک طویل عرصہ بعد
 اس کا اپنے گھر والوں کے لیے اپنے ہاتھوں سے ناشتہ
 بنانے کا دل چاہ رہا تھا۔ پریشان اسے کچن میں آتے
 اور پھر اتنی پھرتی سے کام کرتے دیکھ کر بڑی خوش نظر
 آ رہی تھی۔

”آج کمر میں بہت اچھا لگ رہا ہے۔ بڑی رونق
 لگ رہی ہے۔“ وہ کچھ جھجکتے ہوئے اپنے دل کی
 بات اس سے کہہ گئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے
 ساتھ لگائے ناشتے کی تیاری میں مصروف رہی۔
 رشتوں سے ناشتہ لگواتے ہوئے اس نے ندیم سے
 سب کو بلا کر لے آئے کے لیے کہا۔ وہ کچن سے نکل کر
 ”میک روم میں آئی تو وہاں سب آچکے تھے۔“

”کچن تو کچن میں سے خوشبو نہیں ہی الگ طرح کی
 آ رہی تھی۔“ بیٹا اسے دیکھ کر شوخی سے بولے۔
 ”آج ناشتہ میں نے بنایا ہے۔“ وہ جواباً مسکراتے

ہوئے کر رہی پر بیٹھ گئی تھی۔
 ”تم نہ بھی جانتا میں تب بھی لاؤنج میں بیٹھے ہوئے
 مجھے صرف خوشبو ہی سے پتا چل گیا تھا کہ آج کچن کو
 کس نے رونق بخشی ہوئی ہے۔“ وہ شرارتی موڈ میں
 تھا۔

”صبا کے پکائے ہوئے کھانوں میں کچھ الگ خوشبو
 ہوتی ہے بابا!“ ار تضحیٰ نے اخبار سے نظریں اٹھا کر
 انہیں دیکھا۔

”صرف صبا کے کھانوں میں نہیں بلکہ ہر بیٹی کے
 ماں کے، بہن کے، بیوی کے کھانوں کی خوشبو ایسی ہی
 ہوتی ہے۔ یہ خوشبو تو رشتوں کی ہے۔ ان کی تیاری
 میں محنت کے ساتھ ساتھ محبت بھی شامل ہوتی ہے۔
 یہ خوشبو محبت کی خوشبو ہے۔“ انہوں نے پیار بھری
 نگاہ صبا پر ڈالی۔

”بابا! آپ نے صبح صبح ادبی قسم کی گفتگو کرنا شروع
 کر دی ہے۔ بانی داوے بابا! جن کے گھروں کی خواتین
 پھوہڑ ہوتی ہیں، کیا ان کے کچن میں سے بھی محبت کی
 یہی خوشبو آتی ہے؟“ ار تضحیٰ بیٹا کو چھیڑ رہا تھا۔ ڈیڈی
 اس کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔ بابا کے لبوں
 پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اپنے کمرے میں آکر ار تضحیٰ سب سے پہلے
 ڈرائنگ روم میں آیا تھا۔ اس کمرے کے کونے کونے
 میں شمن کی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس کے کپڑے،
 اس کے میک اپ کا سامان، اس کی جیولری اور دیگر بہت
 سی اشیاء۔ شمن کی استعمال کی ان تمام چیزوں میں سے

کسی ایک جگہ کو بھی اس نے بھی یہاں سے ہٹانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وارڈروب کھول کر اس نے اس میں سے شمن کے سب کپڑے باہر نکال لیے تھے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے دل کو بہت تکلیف ہو رہی تھی لیکن اسے شمن کے سامنے کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ وہ جانتی ہے یہ بات کہ اگر تعضی ایسا ان سب لوگوں کی خاطر کر رہا ہے جن سے خود شمن کو بھی بہت پیار تھا۔ 'مما' ڈیڈی 'بابا' صبا، ظفر اور معاذ۔ اس نے وہاں صبا کے کپڑوں کے لیے جگہ کر دی تھی۔ ریشماں کو بلا کر اس نے ڈرنگ ٹیبل پر سے شمن کے میک اپ کا سب سامان ہٹا دیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے گیسٹ روم میں رکھا ہوا صوفہ کم بیڈ اپنی اسٹڈی میں لا کر رکھ دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ آفس کے لیے تیار ہونے لگا۔ بیچ ٹائم ہو چکا تھا لیکن اس کا کھانے کے لیے گھر پر رکنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ صرف دس منٹ میں وہ تیار ہو کر پورچ میں آگیا۔

"صبا کو بتا دینا میں آفس چلا گیا ہوں۔" گاڑی اشارت کرتے ہوئے اس نے ندیم سے کہا۔

* * *

معاذ اسکول سے آکر سیدھا اس کے پاس آگیا۔ بابا اور ڈیڈی گھر پر نہیں تھے اسی لیے وہ اپنے کمرے میں بھی۔ معاذ نے حسب عادت سب سے پہلے اسے اپنے اشارزہ کھائے پھر اس کے بعد آج میوزک کی کلاس میں کیا کیا ہوا سنانا شروع ہو گیا۔ وہ اگر بہت زیادہ دلچسپی لے کر اس کی بات نہیں سن رہی تھی تو جھڑکا بھی نہیں تھا۔

"ہا۔ جانی! آپ میری ماما بن گئی ہیں نا۔" معاذ کے اس سوال پر اسے کرنٹ سا لگا۔ وہ پوری کی پوری ہلک گئی۔

"تم سے کسی نے کہا معاذ!" اس کے منہ سے بہت سی باتیں نکلنے لگی۔

"مجھے ظفر بابا نے بتایا تھا اور بابا نے بھی۔" اس

نے مہاراجی اور "مما" سے جواب دیا۔ "معاذ! تمہاری ماما شمن ہے۔ تم نے کبھی اس کی تصویریں اور موویز۔" بجائے اسے سے جواب دینے کے وہ اسے نرمی سے بتانے لگی۔

"ہاں وہ تو ہیں لیکن اللہ میاں نے اپنے پاس جو بلا لیا ہے۔" اس نے جھٹ جواب دیا۔ "آپ کی بیلا کے ساتھ شادی ہو گئی ہے ناں؟" وہ اس سے بھی زیادہ بڑے بڑے اور مشکل سوالات کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اکیسویں صدی کے اس بچے سے وہ کسی بھی سوال کی توقع کر سکتی تھی۔ وہ اسے جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ اسے اقرار میں گردن ہلانی پڑی۔

"تیس آپ کو ماما بولا کروں؟" وہ اپنے اصل سوال کی طرف آگیا۔

"نہیں۔" اب کی بار اس کے جواب میں سختی شامل ہو گئی تھی۔ "اسکول سے آکر سب سے پہلے منہ ہاتھ دھو کر پونیفارم بدلنا چاہیے، باقی ساری باتیں اس کے بعد ہولی چائیس۔ جاؤ، جالز اغیتا آئی سے منہ ہاتھ دھلوا کر کپڑے بدل لو۔" وہ اس کے لہجے میں موجود سختی اور ریگانگی پر بد دل اور مایوس سا وہاں سے اٹھ گیا۔

"مما! معاذ مجھ سے ڈانٹیں کھانے کے لیے تمہارہ گیا ہے۔ شمن بھی نہیں ہے، آپ بھی نہیں ہیں۔ میں اس کے پاس ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس نہیں ہوں۔ وہ گورنس کے رحم و کرم پر رہ گیا ہے۔" اسے اس وقت کوئی بھی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ صوفے پر یونہی بیٹھی رہتی۔ اگر بابا اور ڈیڈی اندر نہ آگئے ہوتے تو انہیں دیکھ کر اسے مسکرانا پڑا۔

"کچھ پریشان لگ رہی ہو بیٹا!" ڈیڈی نے پتا نہیں کیسے اس کی پریشانی محسوس کر لی۔

"معاذ کی شاپنگ کرنی ہے ڈیڈی! اس کے پچھلے سیزن کے سب کپڑے چھو لے ہو گئے ہیں۔" وہ انہیں سنجیدگی سے بتانے لگی تو بابا مسکراتے ہوئے بولے۔

"اتنی سی بات پر پریشان ہے میری بیٹی! چلو ابھی چلتے ہیں معاذ کے لیے کپڑے خریدنے۔"

کب ابھی تھکے ہوئے آئے ہیں۔" اس نے انکار کیا لیکن اس میں زیادہ شدت نہیں تھی۔ یعنی اسے ان کی تسکین کی فکر بھی تھی اور وہ جانا بھی چاہتی تھی۔

"تسکین کا کیا ہے ابھی ایک کپ چائے کا پیوں گا اور بالکل فریش ہو جاؤں گا۔" وہ کھل کر مسکرائے۔ بابا اور ڈیڈی لباس بدل کر دوبارہ لاؤنج میں آئے تو اتنی دیر میں وہ ان کے لیے چائے بنا چکی تھی۔ وہ دونوں اس کے رویے میں پیدا ہوتی مثبت تبدیلیوں پر بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ بابا نے آفس میں موقع ملتے ہی ار تضحیٰ سے وہ جادوئی اسم بھی پوچھا تھا جو اس نے صبا پر بڑھ کر پھونکا تھا۔ ان کے شرارتی انداز پر اس نے ہنس کر اتے ہوئے انہیں بتانے سے انکار کر دیا تھا۔

معاذ لان میں کھیل کر اندر آچکا تھا۔ اس نے شاپنگ پر جانے کا سنا تو خود بھی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ اب بابا کے چائے ختم کر لینے کا منتظر تھا۔ ار تضحیٰ گھر واپس آیا تو بجائے اپنے کمرے میں جانے کے ایجنج میں سب لوگوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"ار تضحیٰ صحیح ٹائم پر آگیا ہے۔ اب میرے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم تینوں چلے جاؤ۔" بابا چائے کا کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے اس سے بولے۔ اسے بابا کی اس بات سے سخت کوفت ہوئی۔ خود پر بھی غصہ آیا کہ بابا کے سامنے یہ مسئلہ رکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کسی سے کچھ کہے بغیر وہ کل دن میں ڈرائیور کے ساتھ جا کر بھی تو شاپنگ کر سکتی تھی۔

"کہاں جاتا ہے؟" ار تضحیٰ نے بابا کی بات سننے کے بعد یہ سوال اس سے پوچھا۔

"محلہ کی شاپنگ کرنی ہے صبا کو۔" اس سے پہلے جواب بابا ہی نے دے دیا۔

"پلو۔" وہ فوراً اٹھ گیا تھا۔

"چائے والے لیو تھوڑا سستا ہو۔" بابا کے کہنے پر وہ بھی مسکراتے ہوئے بولا۔

"کہاں آگئی آفس سے اتنے سے تھوڑی دیر پہلے لیو تھی کب ہو گیا نہیں ہے۔" وہ لب کی بھی ملے

جانے سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اسے جانے کے لیے اٹھانی پر لے کر حلال دونوں سے بھی پتے جاتا ہوا پورچ میں چلا گیا تھا۔ وہ من سے شادی کے بعد بھی بے شمار مرتبہ اس کے ساتھ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ ابھی وہاں بیٹھنا اسے برا نہیں لگا تھا۔ آج اس سیٹ کا روانہ ہی اس نے بڑی دقتوں سے کھولا۔ ار تضحیٰ 'اکنیشن' میں چابی گھماتا گاڑی میں اس کے بیٹھنے کا منتظر تھا۔ وہ وہاں بیٹھی تو اسے ار تضحیٰ سے معاذ سے اپنے آپ سے دنیا کی ہر چیز سے نفرت ہونے لگی۔ شاپنگ کے لیے اس کا سارا شوق یک دم ہی ختم ہو گیا تھا۔ ار تضحیٰ اس سے دو مرتبہ یہ بات پوچھ چکا تھا کہ کہاں چلنا ہے اور وہ جیسے اس کی آواز ہی نہیں سن رہی تھی۔

"ہالہ جانی! بابا آپ سے بول رہے ہیں۔" معاذ پیچھے سے زور سے چلایا تو وہ چونکی۔ ار تضحیٰ نے اپنا سوال دہرایا۔

"کیس بھی۔" وہ بے دلی سے بولی۔ ار تضحیٰ نے اس سے مزید کچھ بھی نہیں پوچھا۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ بازار آکر بھی اس کی ہزاروں اور لا تعلقی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ار تضحیٰ خاموشی سے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

"بس کریں اب میں بور ہو گیا۔" اس کی شاپنگ ختم نہ ہوئی دیکھ کر معاذ نے کہا۔ اسے اب کپڑوں اور جوتوں کی دکانوں میں مزید کشش نظر نہیں آرہی تھی۔ معاذ کی وجہ سے اس نے مزید خریداری کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ار تضحیٰ کو گاڑی کی طرف جاتا دیکھ کر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے ایک دکان کی طرف لے جانے لگا۔

"مجھے کریون اسٹیکس چاہئیں۔" وہ اسے ہاتھ پکڑ کر اپنی مطلوبہ دکان پر لے آیا۔ وہ دونوں اس کے ساتھ وہاں آگئے تھے۔ وہاں آکر وہ مزید چیزیں خریدنے کے لیے بے قرار ہوا تھا۔ اسے پوسٹر فلرز بھی چاہے تھے۔ رنکس۔ میسنز بھی چاہے تھیں۔ وائر فلرز بھی چاہے تھے۔ ار تضحیٰ وہ سب چیزیں خرید رہا تھا۔ معاذ

اس خریداری پر پہلے والی خریداری کے مقابلے میں
کس زیادہ خوش تھا۔ اس نے وہاں سے الم فلم و ہیر
ساری چیزیں خریدی تھیں۔

”مبا! معاذ کا یہ شوق بالکل تمہارا جیسا نہیں ہے۔“
دکان سے باہر نکلتے ہوئے وہ بے ساختہ بولا۔ اسے صبا
کے لیے ایسی بہت سی چیزیں خریدنا اچانک ہی یاد آیا
تھا۔ اسے بھی تو معاذ کی طرح ہی کا شوق تھا۔ رنگ
برنگے پن پینسلز، مارکرز، کرپوز اور کلرنگ پینسلز
جمع کرنے کا۔ وہ جواباً ”جیپ رہی۔“

معاذ کو آکس کریم کھلا کر وہ لوگ گھر واپس آ گئے
تھے۔ ڈیڈی فون پر کسی سے بات کر رہے تھے اور بابا
وہیں بیٹھے لی وی دیکھ رہے تھے۔ ان دونوں نے ان
تینوں کو اندر آتے ہوئے بڑے غور سے دیکھا۔ کتنے
اچھے لگ رہے تھے وہ لوگ ایک ساتھ آتے ہوئے۔
معاذ ان کے کہنے سے بھی پہلے شاپنگ بیگ میں
سے انہیں اپنی خریداری دکھا رہا تھا۔ اپنے کلرز اور
پینسلز وغیرہ۔ بابا اس کی سب چیزیں بڑی دلچسپی سے
دیکھ رہے تھے۔ ڈیڈی بھی فون بند کر کے ان لوگوں کی
طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ بابا کا شوق دیکھتے ہوئے
انہیں معاذ کے لیے خریدے گئے کپڑے دکھانے
لگی۔

”اور تم نے کیا خریدا؟“ وہ سب کچھ دکھا کر
کپڑے واپس ڈالوں اور تھیلوں میں رکھنے لگی تو بابا نے
فورا ”پوچھا۔“

”میں نے؟“ وہ اپنی طرف اشارہ کر کے حیران
ہوئی۔

”مجھے اپنے لیے تو کچھ بھی نہیں خریدا تھا بابا!“ اس
کا جواب سن کر انہوں نے ار تفضی کی طرف خفگی سے
دیکھا۔

”تم نے صبا کو شاپنگ میں کرائی۔“

”اس نے کہا ہی نہیں۔“ وہ بابا کی خفگی پر شرمندہ
ہوا۔ اب وہ انہیں کیا بتا تاکہ وہ اس کے ساتھ شاپنگ پر
جائیگی۔ یہی چاہتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ گاڑی میں
بٹھ کر بیٹھنا چاہتی تھی۔ اس کی کرائی والی شاپنگ

لکھ میں ملے بغل کر رہتی تھی۔

”جی! وہ کیا بات ہے۔“ وہ ار تفضی کے جواب پر
مزید غماز ہوئے۔

”اس نے کہا نہیں اس لیے تم نے اس کے لیے
کچھ خریدا نہیں۔ وہ اپنے لیے کب کچھ بولتی ہے۔
میری بیٹی معصوم اور سیدھی سادی ہے۔ اس کا یہ
مطلب بھی نہیں ہے کہ تم اس کی سادی کا ناجائز فائدہ
اٹھاؤ۔“

”آپ خفا تو مت ہوں۔ اچھا میں صبا کو کل ساتھ
لے جا کر ڈھیر ساری شاپنگ کرواؤں گا۔“ وہ ان کا غصہ
ختم کرنے کے لیے فورا ”وعدہ کرنے لگا۔“

”میرے کہنے سے نال۔ خود سے تو تمہیں خیال
نہیں آیا۔“ وہ ہنوز برہم تھے۔ وہ بغیر برآمدے بابا سے
سواری کہنے لگا تھا۔ وہ معاذ کی چیزیں واپس تھیلوں میں
ڈالتے ہوئے یہ گفتگو سن رہی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد ار تفضی کمرے میں جلدی
چلا گیا۔ وہ بہت دیر بعد کمرے میں آئی تھی۔ وہ ہیڈ پر نیم
درا زلی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گمراہی (سائیکالوجی)

شائع ہو گیا ہے

خوبصورت ورقے، آفٹ پیمپلے، مضبوط جلد

قیمت 450 روپے

پتہ ذیل سے خریدیے

• مکتبہ عمران ڈائجسٹ، اردو بازار کراچی

• احمد نیوز ایجنسی، فریڈرکس کراچی

• سلطان نیوز ایجنسی، اخبار مارکیٹ لاہور

• اشرف بک ایجنسی، راولپنڈی • مہراں نیوز ایجنسی، حیدر آباد

بلدیہ ڈاک خانے مکتبہ عمران ڈائجسٹ کراچی

37 اردو بازار

آواز پر وہ بالکل نہیں چونکا۔ اس کی نظریں اسی طرح اسکرین پر مرکوز تھیں۔ اس نے نہ لی دی پر سے نظریں ہٹائی تھیں اور نہ اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ اسی طرح مسووی دیکھنے میں مگن رہا۔ وہ خود بھی وہاں ایک سیکنڈ کے بغیر تیزی سے اسٹڈی میں چلی گئی۔ اس نے اسٹڈی میں پیداہوئی تبدیلی کو بغور دیکھا۔ اسے کارپٹ پر لیٹنے میں بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اب یہ سہولت فراہم کی گئی تو اسے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ دوسرے دن شام میں آفس سے آکر وہ اس سے پوچھنے لگا۔ ”چلنا ہے شاپنگ کے لیے؟“ وہ معاذ کو ہوم ورک کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے فوراً ”انکار میں گردن ہلا دی تھی۔“ ”دیکھ لیں بابا آپ! میں اس سے شاپنگ کے لیے کہہ رہا ہوں یہ منع کر رہی ہے پھر آپ مجھے کچھ مت کہیے گا۔“ اس نے کچھ فاصلے پر بیٹھے بابا سے با آواز بلند شکایتی لہجے میں کہا۔ وہ ڈیڈی کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے اس کی شکایت پر انہوں نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”اب نہیں ہے اس کاموڈ تو کیا وہ زبردستی جائے۔“ انہوں نے پھر صبا کی طرف داری کی۔ ار تضحیٰ بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

”کیسے صبا! منع کر کے تم اچھا نہیں کر رہی ہو۔ یہی تو موقع تھا اس کی جیب خالی کروانے کا اور دیکھنا اب یہ جلدی جلدی بلکہ روزانہ تم سے شاپنگ پر جانے کے لیے کہا کرے گا یہ سوچ کر کہ صبا نے تو انکار کر ہی دینا ہے۔“ وہ اب صبا سے مخاطب تھے ڈیڈی بھی ان کے شرارتی انداز پر ہنسنے لگے تھے۔

”بے فکر رہیں بابا! میں اگلی بار انکار نہیں کروں گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے انہیں یقین دلایا۔ ار تضحیٰ ان سب کو ہتھکڑ کرنا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اپنے کمرے کا یہ ماحول کتنا اچھا اور مانوس سا لگ رہا تھا۔

انہی میں ظاہر سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ بابا اور

ڈیڈی کے سامنے وہ دونوں انہیں میں بہت باتیں کرتے تھے۔ بالکل پہلے والے انداز میں اور کمرے میں آکر وہ ایک دوسرے کے لیے بالکل اچھی ہو جایا کرتے تھے۔ ار تضحیٰ کو اپنے کسی دوست کے ہاں ڈنر پر جانا تھا۔ صبح ناشتے کی میز پر اس نے سر سرے سے انداز میں اس بات کا ذکر کیا۔

”تم صبا کو اپنے ساتھ کسی ڈنر اور پارٹی میں نہیں لے کر جاتے۔“ بابا چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اس سے بولے۔

”اس کاموڈ ہی نہیں ہوتا جانے کا“ اس لیے میں پوچھتا بھی نہیں۔“ اس نے اتنے اعتماد سے جھوٹ بولا جیسے یہ موضوع بڑی تفصیل کے ساتھ اس کے اور صبا کے درمیان زیر بحث آچکا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے پاس آنے والے اکثر دعوت ناموں میں دوبارہ سے مسز ار تضحیٰ غنیمت کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کے قریبی دوستوں کے علاوہ کاروباری حوالے سے ملنے والے انویٹیشنز میں بھی اس کے ساتھ ساتھ اس کی مسز کا بلاوا بھی ایک دفعہ پھر آنے لگا تھا۔

”صبا! یہ لوگوں سے میل جول سے بیزاری اور دنیا سے کٹ کر رہنے والا رویہ بالکل اچھا نہیں ہے بیٹا!“ بابا اب اس سے مخاطب تھے۔ وہ خاموشی سے ان کی نصیحت سن رہی تھی۔ ”بزنس ڈنرز اور پارٹیز میں چاہے یہ نہ جائے لیکن تم اپنے دوستوں کے ہاں تو اسے لے کر جایا کرو۔ نہیں جاتی تو زبردستی لے کر جاؤ۔ تمہیں شوہروں والا رعب جمانا بھی نہیں آتا۔“ وہ جیسے ار تضحیٰ کو اس کے ساتھ سختی سے پیش آنے کے لیے اکسارے تھے۔

”بابا! آپ میرے خلاف بول رہے ہیں۔“ اس نے بابا کی طرف افسوس سے دیکھا۔

”ایسی حرکتیں کرو گی تو تمہارے خلاف بولنا پڑے گا۔ ذرا دیکھو! کیا حالت بنائی ہوئی ہے اپنی۔ نہ کپڑوں کا خیال نہ میک اپ نہ جینا سنورنا نہ جیو کری۔ گھر سے نکلو گی تب ہی تمہارا حلیہ بھی صحیح ہو گا۔ سارا دن گھر پر رہتی ہو نہ کہیں جاتی ہو نہ کسی سے ملتی ہو۔“ اس

خواتین ڈائجسٹ پبلی کیشنز

کی ایک خوبصورت پیشکش

نامور مصنفہ رضیہ جمیل

کا "ساگر دریا بادل بوند"

کے بعد مشہور و معروف ناول

لکھنؤ صرف کا

اب کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

☆ خوبصورت سرورق

☆ مضبوط جلد

☆ آفست پیپر

قیمت صرف = 300/ روپے

کتاب منگوانے کے لیے

آج ہی = 330/ روپے

کامنی آرڈر یا بینک ڈرافٹ

ارسال فرمائیں۔

ملنے کا پتا

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی

کی طرف دیکھتے ہوئے ناراضی سے بولے۔

بھائی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں صبا! تم نے اپنی
سوئل لائف بالکل ختم کر دی ہے۔ ذرا بھی سوئل
نہیں رہی ہو تم نہ ٹیلی میں کہیں جاتی ہو نہ اپنی فرینڈز
میں۔ تمہاری دوست خود ہی بھولے بھٹکے فون کر لیں تو
بات کر لو گی خود سے تو میرا خیال ہے تم نے عرصہ سے
کسی دوست کو فون نہیں کیا۔ یہ یک طرفہ کارروائی بھی
کب تک چلے گی۔ آخر کار ایک روز تنگ آکر وہ لوگ
تمہیں فون کرنا بھی چھوڑ دیں گے۔"

ڈیڈی بھی بابا کی حمایت میں بولے تھے۔ ار تفضی
خاموشی سے چائے پیتے ہوئے صبا کو کی جانے والی
رہنمائی سن رہا تھا۔

"صبا آج تمہارے ساتھ جائے گی ار تفضی! بابا"
ار تفضی سے حکمیہ انداز میں بولے۔ وہ اب مزید کچھ
بھی نہیں کہہ سکتی تھی اس لیے خاموش ہو گئی تھی۔
اس کی تیاری کسی پارٹی یا ڈنر میں جانے والی تیاری
نہیں تھی۔ اس نے نہ میک اپ کیا تھا اور نہ کسی قسم
کی جیولری پہنی تھی۔ صرف بابا کے پہنائے ہوئے
نکسن جو اس نے اتارے ہی نہیں تھے وہ پہنے ہوئے
تھے اور گلے میں چین جو ہمیشہ ہی سے اس نے پہنی
ہوئی تھی۔

معاذ گھر پر بابا اور ڈیڈی کے پاس رک گیا تھا۔ صرف
وہ دونوں جا رہے تھے۔ ار تفضی نے گاڑی ریورس
کر کے جیسے ہی گھر سے باہر نکالی وہ اس کی طرف دیکھے
بغیر سیٹ سے انداز میں بولی۔

"مجھے ڈنر میں نہیں جانا۔ آپ مجھے میری فرینڈز کے
گھر ڈراپ کر دیں۔ واپسی میں مجھے وہیں سے پک
کر لے جائیں گے۔"

"وہاں بہت اچھی کید رنگ ہو گی صبا! تم انجوائے
کر لو گی۔" وہ اس کی بات پر حیران ہوئے بغیر مسات
سے اٹھانے لگی۔

کپلے کا تھا آپ مجھے کسی بات کے لیے مجبور

نہیں کریں گے۔" بہت عجیب لہجے میں وہ اس کی کوہلیا دلائے لگی۔

"ایڈریس بتاؤ اپنی فرینڈ کے گھر کا۔" اس نے مزید بحث کیے بغیر فوراً "نئی بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ پھر اسی خاموشی سے ارتضیٰ نے اسے اس کی دوست کے گھر پر اتار دیا تھا۔

صبا کی یہ حرکت اسے بہت بچکانہ اور اٹیچیوورلگ رہی تھی۔ اور صرف یہی حرکت نہیں اسے صبا کے بہت سے رویے اٹیچیوورلگ کرتے تھے اس میں اٹیچیوورلگی کی کمی تھی۔ لیکن اب وہ اسے کچھ سمجھانے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ وہ خود اپنے رویے میں تبدیلی لے آئے تو لے آئے ارتضیٰ اسے واقعی کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔



معاذ کی فرمائش پر وہ اس کے لیے چکن پاشا بنا رہی تھی اور وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے چکن میں اس کے پاس کھڑا تھا۔ اور کچھ نہ کچھ بولے جا رہا تھا۔

"خیر ضرور ڈال لے گا۔"

"مرچیں بالکل نہیں۔"

"آپ بھی میرے ساتھ کھائیے گا۔"

"معاذ! میں ڈسٹرب ہو رہی ہوں۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ مجھے سکون سے کام کرنے دو۔ جب بن جائے گا میں تمہیں بلا دوں گی۔" اس کے الفاظ اتنے سخت نہیں تھے، لیکن اس کا لہجہ بہت سخت تھا۔ وہ اس کے انداز پر "سم کر فوراً" پیچھے ہٹ گیا۔ اسے اس کے غصے سے ڈر لگا تھا۔ وہ چکن سے نہیں کیا بلکہ دروازے سے ٹپک لگائے خاموشی سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آنے لگے تھے مگر وہ انہیں روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے سب نظر آ رہا تھا۔ پھر بھی وہ بے حس سے انداز میں اپنا کام کیے جا رہی تھی۔ غصے اور جھنجھلاہٹ میں کام کرتے ہوئے شاید بے دھیانی کے سبب پھری سے اس کی انگلی پر کٹ لگا تھا۔ اس نے پھری جلیٹ میں رکھتے ہوئے اپنی انگلی کو

دیکھا۔ وہ میان والی انگلی سے ایک دم ہی خون نکلتے لگا تھا۔

معاذ بہت گھبرایا ہوا تیزی سے اس کے پاس آیا تھا۔ وہ اس کے آنے کو نظر انداز کر کے سنک کے آگے انگلی کر کے خوب تیز ٹھنڈے پانی سے اپنی انگلی دھوئے لگی۔

"آپ کے خون نکل رہا ہے بال جانی۔" وہ اس کے پاس کھڑا اچک اچک کر اس کی انگلی کو دیکھنے کی بدوجہ نہ کر رہا تھا۔ وہ بغیر کوئی جواب دے اپنی انگلی پانی سے دھوئی رہی۔ وہ بھاگتا ہوا چکن سے نکل کر بتائیں کہاں گیا تھا۔ وہ سنک کے آگے سے بیٹے ہوئے اس زخم پر ابھی بینڈیج لگانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ وہ فرسٹ ایڈ باکس اٹھا کر چکن میں واپس آ گیا۔ وہ اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس دیکھ کر ساکت رہ گئی تھی۔ وہ لاؤنج میں الماری کے اندر اتنا اوپر رکھا ہوا تھا۔ وہاں معاذ کا ہاتھ کیسے گیا۔ ندیم گھر پر نہیں تھا، ریشماں اپنے کوارٹر میں تھی۔ یقیناً وہ خود کسی نہ کسی طرح اوپر چڑھا تھا تاکہ فرسٹ ایڈ باکس نکال سکے۔ اگر وہ وہاں سے گر جاتا پھر؟ اتنا بھاری سافر سٹ ایڈ باکس اتنی اونچائی اور وہ چھوٹا سا بچہ۔ اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ فرسٹ ایڈ باکس زمین پر رکھ کر معاذ نے اسے جلدی سے کھولا اور پھر اپنی سمجھ کے حساب سے اس میں سے ایک مرہم نکالا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس کے سامنے زمین پر آکر بیٹھ گئی۔ اس نے خود ہی اپنی انگلی اس کے سامنے کر دی۔ وہ اس کے زخم پر بڑے نرم اور ملائم سے انداز میں مرہم لگا رہا تھا۔

"آپ کو بہت تکلیف ہو رہی ہے۔" اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

"پلے ہو رہی تھی۔ اب نہیں ہو رہی۔ تم نے آئینٹ لگایا ہے ناں۔ اس سے ساری تکلیف ختم ہو گئی۔" وہ بہت مطمئن ہو کر فخریہ انداز میں مسکرایا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اب بڑے غلط سلط انداز میں اس کی انگلی پر بینڈیج کر رہا تھا۔

"تمہارے لیے آئینٹ لینے جا رہی ہوں۔ حد

ہے بے یار و مددگار۔ اتنی گہری چوٹ ہے اور محترمہ
 سکون سے پھر رہی ہیں۔ "اس کے کانوں کے پاس ایک
 بست مانوس سی سرگوشی ہوئی۔ اس نے بے ساختہ معاذ
 کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ اسے پاگلوں کی طرح
 پیار کر رہی تھی۔ وہ اس کے سینے سے لگا رہی طرح
 حیران ہو رہا تھا۔ اتنی ناراضی کے بعد اچانک اتنا پیار؟
 "معاذ! تم اس دنیا کے سب سے پیارے بچے ہو۔
 تم بالکل اپنی ماما جیسے ہو۔ تم بالکل شمن جیسے ہو معاذ!"
 چھوٹی چھوٹی عاتقیں چاہے اس نے صبا کی لے لی ہوں۔
 لیکن وہ مزاج میں پورا کا پورا شمن جیسا تھا۔ ہو بسوا اسی
 جیسا شکل اگر اس نے باپ کی لی تھی تو مزاج پاں کا۔ وہ
 پہلی مرتبہ اس بات سے آگاہ ہوئی تھی کہ شمن کا بیٹا
 بالکل اسی جیسا ہے۔

"میری ماما بہت اچھی تھیں بالہ جانی؟" وہ اس کی
 بات سن کر بے اختیار پوچھ بیٹھا تھا۔

"ہاں، وہ بہت اچھی تھی۔ وہ اس دنیا کی سب سے
 اچھی لڑکی تھی۔ وہ بالکل تمہارے جیسی تھی معاذ!"
 اس نے بھی شمن کے بارے میں کسی سے کوئی بات
 نہیں کی تھی، آج اس کے بیٹے سے کر رہی تھی۔

"وہ بالکل شہزادیوں جیسی تھی۔ وہ ان لوگوں میں
 سے تھی جنہیں دیکھ کر زندگی سے پیار ہو جایا کرتا ہے۔
 جن سے مل کر خلوص، محبت، چاہت سب پر ایمان
 لانے کو دل چاہنے لگتا ہے۔" وہ اس کی بات سمجھ نہیں
 پارہا تھا۔ لیکن اسے اس کا یوں والہانہ انداز میں پیار
 کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کتنے عرصے بعد آج وہ اسے
 اس طرح پیار کر رہی تھی۔ وہ اب اس کے ساتھ باتیں
 کرنے لگی تھی، اس نے اسے جھڑکنا اور ڈانٹنا بھی
 چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس کے پیار کرنے کا انداز وہ نہیں
 بدلتا تھا جس کا معاذ عادی تھا۔ جس کی وہ اس سے توقع کیا
 کرتا تھا۔ چہرہ وہاں سے اٹھی، اس نے جلدی جلدی
 پاشا تیار کیا۔ پاشا پلیٹ میں نکال کر وہ اس کے پاس بیٹھ
 گئی۔ وہ کچن میبل کے آگے بیٹھ کر رہی پوچھ رہا تھا۔ وہ
 اسے اپنے ہاتھ سے گلہا رہی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ سے

اپنے ساتھ کر کے لے آئی۔

"آج تم میرے ساتھ سو جاؤ۔" اس کے کتے بچہ
 اس نے خواہ اسے اپنے قریب لے لیا۔ وہ اس کے ہاتھ پر
 سر رکھ کر خاموشی سے اس کا چہرہ تک دیکھتا تھا۔ وہ اسے
 کہانی سن رہی تھی۔ اس جنگل کی جس میں سب جاوے
 مل جل کر رہتے تھے۔ اس سے کہانی سنتے سنتے معاذ کی
 آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔

"بانی کہانی کل سناؤں گی۔ اب تم سو جاؤ۔" اس
 نے اس کے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

"اب میں آپ کو ماما بولوں گا تو آپ ناراض تو نہیں
 ہوں گی۔؟" اس نے اپنی آنکھیں بمشکل کھولتے
 ہوئے پوچھا۔ سونے سے پہلے شاید وہ اس سے یہ وعدہ
 لے لینا چاہتا تھا۔ اس خوف سے کہ کہیں شام میں اس
 کا موڈ دوبارہ پہلے جیسا نہ ہو جائے۔

"تمہارا جو دل چاہے، تم مجھے بواؤ۔" وہ دو تین
 منٹوں ہی میں گہری نیند سو گیا۔ وہ اپنے بالکل پاس لیٹے
 معاذ کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔

"تم میں کیا ہے صبا! میں تم سے کچھ بھی چھپا ہی
 نہیں پاتی۔ میرا دل خود بخود تمہاری طرف کھینچا ہے۔"
 اس کے کان ایک پیار بھری آواز کو سن رہے تھے۔

"تمہاری ماں بھی تمہاری طرح مجھ سے پیار کرتی
 تھی معاذ! تم اسی کے وجود کا تو حصہ ہو۔ تم بالکل اسی کی
 طرح مجھ سے پیار کرتے ہو معاذ! میں ڈانٹوں، جھڑکوں،
 اپنے پاس سے ہٹاؤں۔ بری طرح پیش آؤں، تم پھر بھی
 میری طرف بھاگ کر آتے ہو۔ وہ بھی ایسا ہی کرتی
 تھی۔ وہ اپنے پیار کے صلے میں مجھ سے کچھ نہیں مانگتی
 تھی۔ یہ بھی نہیں کہتی تھی کہ صبا تم بھی مجھ سے ایسا
 ہی پیار کرو۔ میں نے اس کے پیار کی قدر نہیں کی،
 معاذ۔ لیکن میں تمہارے پیار کی قدر ضرور کروں گی۔
 کیا ضروری ہے کہ صبا ہر محبت کے پھڑ جانے کے بعد
 ہی اس کی قدر کرے۔ تم جس نام سے چاہے مجھے بلاؤ
 معاذ۔ میں کچھ نہیں کہوں گی۔ میں تمہارے پیار کے
 آگے بار کئی ہوں معاذ۔ اور ساری زندگی میں اس پیار

وہ معاذ کے لیے سراپا محبت بن گئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح اس پر چاہت لٹانے لگی تھی بلکہ شاید پہلے سے بھی زیادہ۔ معاذ اگر اسے ملامت کر خوش ہوتا تھا تو بابا اور ڈیڈی بھی اس کے منہ سے صبا کے لیے یہ لفظ سن کر بہت خوش ہوتے تھے۔



معاذ کے اسکول میں سالانہ فنکشن تھا۔ میں ڈرامہ میں بھی ہوں اور تقریر بھی کروں گا۔ ٹیچر نے کہا پرس تو بس معاذ بنے گا۔ کھانے کی میز پر اس نے گردن اوچی کر کے بتایا تھا۔ وہ سب ہی اس کے انداز پر ہنس پڑے تھے۔ ”پھر تو اب تمہیں پرس معاذ کہنا پڑا کرے گا۔“ ڈیڈی ہنستے ہوئے بولے۔ اس نے گردن ہلا دی تھی۔ جتنے دن اس فنکشن کی تیاریاں اس کے اسکول میں ہوتی رہیں۔ وہ گھر والوں سے صبح شام اسی کے بارے میں کچھ نہ کچھ باتیں کرتا رہا۔

وہ ار تضحیٰ اور صبا سے وعدہ لے چکا تھا کہ وہ دونوں فنکشن میں آئیں گے۔ صبا کے وعدہ کر لینے کے باوجود اسے جیسے بے اعتباری سی تھی وہ ہر روز اس سے نئے سرے سے وعدہ لیتا تھا۔

”آپ بہت اچھا ڈریس پہن کر آئیے گا آپ اسٹک بھی لگائیے گا اور ہال بھی کھولیے گا۔“ اس کی اس معصومانہ سی فرمائش پر وہ ہنس پڑی تھی۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میک اپ کر کے آنا ہے۔

”آپ ویسے ہال بنائیے گا جیسے آپ نے پایا اور ماما کی شادی پر بنائے تھے۔“

اس نے ثمن اور ار تضحیٰ کی شادی کی تصویریں اور معدی اتنی بار دیکھی ہوئی تھی کہ اسے شادی کے دن کی گھر کے ہر فرد کی تیاری حفظ تھی۔

”معاذ! وہاں پر کوئی مجھے دیکھنے کے لیے نہیں آئے گا۔“ اس کے منہ سے تیاری کیپڑوں اور میک اپ کی گردان سننے سننے آخر کار کہہ بیٹھی تھی۔

”میں آپ کو اپنے فریڈ سے بلواؤں گا اور اپنے

سب نچوڑ سے بھی۔“ اس نے اس کی شکل پر افسوس کیا۔

”اگر میں ابھی طرح تیار ہو کر نہیں آتی تو تمہاری انسلٹ ہو جائے گی۔ اپنے فریڈز کے سامنے۔“ اسے دوبارہ ہنسی آئی تھی۔ اس کی بات دہنسی میں اڑانے اور ذرا سی بھی سنجیدگی سے نہ لینے کے باوجود وہ جب فنکشن میں جانے کے لیے تیار ہوئے لگی تو اس نے وہ سب کچھ کیا جو وہ اس سے چاہتا تھا۔ وہ جو اس نے اسے سمجھایا تھا وہ بھی اور وہ جو اسے سمجھا نہیں پایا تھا وہ بھی۔ سرخ رنگ کی بہت خوب صورت شلوار قمیص اور کیڑوں سے مناسبت رکھتی ہوئی نفیس سی جیولری پہنی تھی۔ اور میک اپ کیا تھا۔

اسے میک اپ کے بعد اپنا چہرہ خود ہی اجنبی اجنبی سالک رہا تھا۔ بالوں کی بیچ کی مانگ نکال کر برش کرنے کے بعد اس نے انہیں کھلا چھوڑ دیا تھا۔ دوپٹہ شانوں پر سلتے سے پھیلا کر وہ پوری طرح تیار تھی۔ اسے معاذ کی خوشی کا سوچ کر خوشی ہو رہی تھی۔ وہ اسے اس طرح تیار دیکھ کر کس قدر خوش ہو گا۔ صبح اسکول جاتے جاتے بھی وہ اس سے کتنے سارے وعدے لے کر گیا تھا۔



ایک میٹنگ سے فارغ ہو کر وہ ابھی ابھی اپنے آفس میں آیا ہی تھا کہ اس کے موبائل پر صبا کا میسج آیا۔ ”معاذ کے اسکول جانا ہے۔“ بے ساختہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ اسے ایسے یاد دل رہی تھی جیسے اسے اس کے بھول جانے کا خدشہ تھا۔ وہ صبا کے ساتھ طے کیے ہوئے وقت سے پہلے ہی گھر آ گیا تو یہ دیکھ کر ذرا بھی حیران نہیں ہوا کہ وہ تیار بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن اس کی تیاری پر ضرور حیران ہوا تھا۔ معاذ کا اس کی تیاری کے بارے میں راز ضرور اس کے کانوں میں پڑا تھا، لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس کی بات مان بھی لے گی۔ اسے صبا کے اندر پیدا ہوئی یہ تبدیلی بہت اچھی لگی۔ وہ آہستہ

گہرے زندگی کی طرف واپس آتی نظر آ رہی تھی۔ اور
اسے خوش دیکھنا ار تھنی کو بیٹا اچھا لگا تھا۔
فنکشن بھی شاندار تھا اور معاذ کی پرکار مٹس بھی
توقع کے عین مطابق شاندار تھی۔ اس سچ پر آتے ہی اس
نے اتنے لوگوں کے ہجوم میں بھی ار تھنی اور صبا کو کھ
لیا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی ہی خوشی
نکھر گئی تھی۔ معاذ کی زیر دست پر فار مٹس پر اس کے
لے زور دار تالیاں بھی تھیں اور اس کے لیے بچنے والی
وہ تالیاں اسے اپنے لیے لگ رہی تھیں جیسے اسے
سراپا جا رہا ہو۔ فنکشن کے اختتام پر سال بھر غیر
معمولی کارکردگی دکھانے والے بچوں میں انعامات
شیلڈز اور ٹرافیوں تقسیم کی گئی تھیں۔ اور ان انعامات
کو لانے والے آؤٹ اسٹیڈنگ اسٹوڈنٹس میں وہ بھی
شامل تھا۔ معاذ کے چہرے پر چھلکتی خوشی ان دونوں ہی
کو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ فنکشن کے بعد وہ اسے
اپنے پیچرز اور دوستوں سے ملوانے لگا۔ وہ جیسے اس کا
سب سے قیمتی میڈل تھی۔ جسے وہ فخریہ ایک ایک سے
ملوا رہا تھا۔

”یہ میری ماما ہیں۔“ ار تھنی دور کھڑا اسے صبا کا ہاتھ
پکڑ پکڑ کر مختلف لوگوں کے پاس لے جاتا ہوا دیکھ رہا
تھا۔ اس کا بیٹا آج بہت خوش تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے
ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ واپسی میں گھر جانے کے
بجائے وہ اسے شاپنگ سینٹر لے آیا تھا۔

”تم اپنا گفٹ ابھی لے لو۔ جو دل چاہے خرید لو۔“
اس نے بڑی فیاضی سے بیٹے سے کہا۔ اس نے آج
معاذ کو خوشی دی تھی۔ ار تھنی کے ساتھ فنکشن میں
آکر اس کی مرضی کے مطابق تیار ہو کر۔ اس سب
کے باوجود بھی وہ سچ سے خوش نہیں ہو پا رہی تھی۔
معاذ نے آج جتنے بھی لوگوں سے اسے اپنی ماں کی
حیثیت سے حعارف کروایا تھا وہ ان سب سے ملی
تھی۔ بہت اچھی بات بات چیت بھی کی تھی۔ لیکن
ایسا کرتے ہوئے اس کے دل پر کیا گزری تھی۔ یہ
حرف ہی کچھ ملتی تھی۔ اسے ان تمام لمحوں میں نور
سے شرم آتی تھی۔ وہ جلد کسی اور کی نگاہوں میں

ہوتا چاہیے تھا۔ اس جگہ پر وہی جتنی تھی۔ ار تھنی سچ
جگہ پر تھا۔ معاذ سچ جگہ پر تھا۔ صرف وہ غلط جگہ پر
تھی۔ لیکن وہ اس معصوم سے بچے کا کیا کر سکتی۔ وہ معاذ
کی خوشی کی خاطر مسکراتے پر مجبور تھی۔ وہ ان دونوں
کے ساتھ دوکانوں میں پھر بھی رہی تھی۔ معاذ جو چیزیں
پسند کر رہا تھا ان کے بارے میں اپنے کنکشن بھی
دے رہی تھی۔ لیکن اندر سے اس کا دل ایسا ہو رہا تھا
جیسے دھڑکنا ہی نہ چاہتا ہو۔ وہ لوگ ابھی شاپنگ کر رہی
رہے تھے کہ ار تھنی کے موبائل پر ڈیڈی کی کال آئی۔
انہوں نے آفس سے فون کیا تھا۔ وہ معاذ کے

اور اس کی کارکردگی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہ
جواباً ”مسکراتے ہوئے انہیں مختصر اظہار میں سب
کچھ بتانے لگا۔

”بس پھر تم شاپنگ کر کے سیدھے گھر آ جاؤ۔ میں
اور بھائی بھی گھر آ رہے ہیں، معاذ کی کامیابی سب مل کر
سیلبریشن کریں گے۔“ انہوں نے ار تھنی سے کہتے
ہوئے نون بند کر دیا۔

وہ لوگ گھر پہنچے تو بابا اور ڈیڈی وہاں پہلے سے موجود
تھے، کیک، آئس کریم، پیزا، مٹھائی اور بھی بہت سی
معاذ کی پسند کی کھانے پینے کی چیزیں میز پر سجا کر وہ ان
لوگوں کا انتظار کر رہے تھے۔ معاذ کی ٹرائی اور
سرٹیفیکیشن کو ان دونوں نے بڑی محبت سے دیکھا۔

”دیکھنا ار تھنی! تمہارا بیٹا تم سے بھی آگے جائے
گا۔“ ڈیڈی نے ار تھنی سے یہ سن کر کہ معاذ نے اتنے
سارے لوگوں کے سامنے حد درجہ اعتماد کے ساتھ
تقریر کی ہے، یہ کنکشن دیے تھے۔

”میں چاہتا ہوں ڈیڈی کہ یہ زندگی کے ہر میدان
میں مجھے پیچھے چھوڑ دے۔ اسے اپنے سے آگے بلکہ
بہت زیادہ آگے دیکھنے کی دعا کرتا ہوں میں۔“ ار تھنی
نے برملا اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ بابا بھائی اور بیٹے کی
لفٹو سے زیادہ اسے دیکھنے میں دلچسپی لے رہے تھے۔
انہیں صبا کو دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”معاذ! جاؤ جا کر صبا کو تو بلا کر لاؤ۔“ معاذ سے یہ بات
کہتے وقت ان کے لبوں پر بڑی شرمیلی مسکراہٹ

"میں کیا تھوڑی ہوں گا۔ آپ بھی تو ہوں گی۔"

اس نے بڑے اطمینان سے اس کا لہجہ سن کر ہنس دیا۔
تھا۔ وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے یہ بات تو ملے گی کہ میرا
کے ساتھ جانے کی اس پارے میں سوچتے اور فکر
کرنے کی پسند اس ضرورت میں تھی۔

"پاپا کا کام ختم ہو جائے گا۔ پھر ہم لوگ خوب
گھومیں گے۔" وہ پاپا بن رہا تھا۔ معاذ پاپا تھا۔ اسے
کسی نہ کسی طرح وہ بہلا ہی لیتی، لیکن یہاں تو مسئلہ بابا
کا آگیا تھا۔ یہ ایشو معاذ نے اٹھایا تھا اور اسے سب سے
زیادہ بابا نے پسند کیا تھا۔ وہ دل و جان سے چاہتے تھے کہ
صبا اور معاذ بھی ار ترضی کے ساتھ جائیں۔

"ار ترضی! لاہور میں کام ختم کر کے فوراً کراچی
آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شمالی علاقوں کی
طرف نکل جانا۔ یہی تو موسم ہے وہاں کی سردیاں
بارشیں اور برف باری انجوائے کرنے کا۔" انہوں نے
ار ترضی سے حکم انداز میں کہا۔ وہ ان لوگوں کو کل
کے بھیجتے آج بھیجنے کے لیے تلے بیٹھے تھے اور وہ سمجھ
نہیں پا رہی تھی کہ بابا کو کس طرح منع کرے۔ کافی دفعہ
اس نے مختلف بہانے بنا کر وہ لفظوں میں منع کرنے
کی کوشش کی، کبھی یہ کہہ کر آپ اور ڈیڈی اکیلے
ہو جائیں گے۔ کبھی یہ کہہ کر کہ پتا نہیں معاذ کا وہاں دل
لگے گا کہ نہیں، اگر دل نہیں لگا تو وہ بہت تنگ کرے
گا۔ لیکن اس کے تمام بہانوں کے ان کے پاس بنے
بنائے تیار جواب رکھے تھے۔ ار ترضی دیکھ رہا تھا کہ وہ
جاننا نہیں چاہتی۔ وہ اسے جانے کے لیے مجبور بھی
نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اکیلے میں بابا سے صبا پر
بات رکھے بغیر گفتگو کی۔

"بابا! فی الحال کہیں آؤ تنگ کے لیے میرے پاس
ٹائم نہیں ہے۔ مجھے لاہور سے فوراً واپس آنا
ہو گا۔ آپ جانتے تو ہیں کہ کوریا سے ڈیل کیشن آئے
والا ہے۔ مجھے لاہور سے آتے ہی اس مسئلے میں بہت
سماہم ورک کر کے رکھنا ہے۔ میں صبا اور معاذ کو اس
وقت تو بالکل ٹائم نہیں دے سکتا۔" بابا کو اس کی بات

تھی۔ معاذ کا حال کی شکل دیکھ رہا تھا۔

"بابا! کبھی تو ہیں۔" اس نے معصومیت سے
انہیں بتانے کی کوشش کی۔ ار ترضی اور ڈیڈی ان کی
شرارت پر مسکرا رہے تھے۔ جب کہ وہ ایک دم ہی
بھینپ سی گئی تھی۔

"یہ صبا ہے۔ اسے ہاں واقعی۔ صبا! تم اتنی خوب
صورت ہو یہ بات کن مجھے پہلی دفعہ پتا چلی ہے۔"
انہوں نے معصومیت سے حیرت اور ستائش کا تاثر دیا۔
"شفیق! تمہاری اس بگڑی ہوئی بیٹی کو میرا پوتا ہی
ٹھیک کرے گا۔" وہ ڈیڈی سے بولے۔

"بابا! میں بگڑی ہوئی بیٹی ہوں۔" اس نے روٹھے
لہجے میں کہا۔

"اب تو کہتے ہیں صبا! میری بہت پیاری اور اچھی
بیٹی ہے۔" اس نے انہیں خفگی سے یاد دلایا۔

"پیری اور اچھی بیٹی بابا کی بات اتنی جلدی اور
آسانی سے جو نہیں مانتی، ترضی آسانی سے معاذ کی مان
لیتی ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولے۔ وہ سب ساتھ
بیٹھ کر کھاتے اور باتیں کرتے ہوئے معاذ کی پہلی پہلی
کامیابی کا جشن منا رہے تھے۔

* * *

ار ترضی لاہور جا رہا تھا۔ اس کا لاہور جانا کوئی غیر
معمول واقعہ نہیں تھا۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں اس کا وہاں
کا چکر لگاتی کرتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھار کسی ضروری کام کی
وجہ سے اس سے بھی جلدی وہاں جانا پڑ جاتا تھا۔
اب کی بار یہ جانا غیر معمولی واقعہ یوں بن گیا تھا کہ معاذ
کے اسکول کی چھٹیاں تھیں اور وہ ار ترضی کے ساتھ
وہاں جانا چاہتا تھا۔ معاذ کے جانے کا مطلب تھا کہ وہ
میں ان کے ساتھ جائے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ
آپنا ار ترضی کے ساتھ چلا جائے۔ ار ترضی وہاں کام سے
جدا تھا۔ معاذ اس کے لیے گھر پر آیا کیسے وہ سکتا تھا۔
میں گھر پر آئے جیسے وہ گھر کے معاذ پاپا تو آفس میں
ہو جاتے تھے۔

انہوں نے کھانے کے حوالے کر دی تھی۔

"اپنی بیوی اور بیٹے کے لیے تمہارے پاس نام
نہیں ہے۔ بزنس رشتوں سے زیادہ اہم کب سے
ہو گیا ہے۔ معاذ کے پاس یہی وقت ہے۔ پھر اس کے
اسکول کھل جائیں گے۔ چاہے دو چار دن کے لیے ہی
جاؤ لیکن تمہیں ان دونوں کو کھانے پھرانے ضرور لے
جانا چاہیے۔ کچھ وقت تمہیں اور صبا کو ایک ساتھ اور
تنہا گزارنا چاہیے۔ اس سے تم دونوں کے درمیان بہتر
انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہوگی۔ اس کا حق ہے کہ تم اسے
وقت دو اسے اپنی زندگی میں سب سے اہم جگہ دو۔
تمہارے لیے بزنس اور دوسرے سب کاموں سے
پہلے ہونا چاہیے صبا اور معاذ کو۔" ار تفضی انہیں یہ
کیسے سمجھا تا کہ وہ انکار ہی صبا کی وجہ سے کر رہا ہے۔

بابا سے یہ بات وہ کہہ نہیں سکتا تھا اور کسی دوسری
تاویل سے انہوں نے قائل ہونا نہیں تھا۔

بابا اور ڈیڈی نے بڑے خوشی خوشی انہیں رخصت
کیا تھا۔ جہاز میں سارا وقت وہ خاموش بیٹھی رہی۔
معاذ کی تمام باتوں کے وہ ہوں ہاں میں جوابات دے رہی
تھی۔ ار تفضی اس کا اضطراب اور ٹینشن دیکھ رہا تھا۔ وہ
اسے ہمیشہ سے زیادہ دل گرفتہ اور مایوس لگ رہی تھی۔
اس نے اس گھر میں قدم رکھا جس میں وہ زندگی
میں دوبارہ کبھی آنا نہیں چاہتی تھی۔ پھولوں سے بھرا وہ
خوب صورت لمان بہت سونا اور خاموش لگا تھا اسے۔

"سنو وہ کہاں ہے؟" اس نے پھولوں سے بے آواز
پوچھا۔ وہ جواب میں بالکل خاموش رہے تھے۔ وہ
بہت آہستہ چلتی گھر کے اندر آگئی۔

"پہلے سارا گھر تو دیکھ لو تم دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔
میں نے اسے اتنی اچھی طرح سجایا ہے۔" اس کے
بالکل قریب ایک آواز ابھری۔ اس نے چونک کر اپنے
واپس ہاتھ دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

"امارتے کمرے کی دیواریں پر آف وائنٹ پینٹ
سجے اس کے ساتھ نیلے رنگ کے پردے اور کارپٹ
کس قدر خوب صورت اور رو مینٹنگ سا تاثر دے
رہے ہیں۔ کتنا حسن ہے اس رنگ میں کتنا رو مینٹس
ہے۔" وہاں سب کچھ ویسا ہی تھا کیس کوئی تبدیلی

نہیں تھی۔ ہر چیز اسی طرح اپنی جگہ پر موجود تھی۔
لیکن پھر بھی وہاں سب کچھ ویسا نہیں تھا۔

وہاں ایک کی گئی بہت بڑی تھی۔ سب سے بڑی
کی۔ وہ اپنے قدموں کو کھینچتے ہوئے لاؤنج سے نکل کر
ڈائننگ روم میں آئی تو جیسے لاؤنج سے ایک آواز آئی۔
"کبھی کبھی مجھے ڈر لگتا ہے محبت کے گھر
جانے کا ڈر۔ اس کے چہن جانے کا ڈر۔ پتا نہیں محبت
اتنی وہمی کیوں ہوتی ہے۔" اس نے مڑ کر لاؤنج میں
رکھے صوفے کی طرف دیکھا۔

"اور اوپر سے غصہ دکھا رہی ہو۔ اندر سے تو خوش
ہو رہی ہو گی کہ جس بندے کے پیچھے اتنی لڑکیاں پڑی
ہیں وہ میرے پیچھے پڑا ہے۔" اس نے زخمی نگاہوں
سے اس خالی صوفے کی طرف دیکھا۔

پھر وہ ڈائننگ ٹیبل کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ ٹیبل
کی سطح پر اس نے ہلکے سے ہاتھ پھیرا۔ "پتا نہیں کس
طرح یہ پتھر اور سبزیاں مکس کر کے اتنے مزے کی ڈش
تیار کرتی ہے۔" اس کے لیے یہ تعریفی جملہ جس نے
کہا تھا وہ وجود آج اپنی مخصوص کرسی پر سے غائب تھا۔
اس کے دل میں اک ہوک سی انہی۔ وہ فوراً "ڈائننگ
روم سے نکل گئی۔ سامنے نظر آتے کچن کی طرف
خود بخود ہی اس کے قدم اٹھے تھے۔

"خود ہی بد تمیزی کرتی ہو۔ پھر مظلوم سی شکل بنا کر
رونے بھی کھڑی ہو جاتی ہو۔" جس جگہ پر کھڑے ہو کر
یہ بات کہی گئی تھی وہ اسی جگہ پر آکر رک گئی۔

"زندگی میں بہت سی باتیں ہمیں ناگوار گزرتی
ہیں۔ مگر کسی ناگوار بات پر اس طرح ری ایکٹ کرنا
بالکل مناسب نہیں ہے۔ تمہارے گل کے روپے پر
مجھے بہت دکھ ہوا۔" وہ خاموشی سے اس جگہ کو تنک
رہی تھی۔ آج وہاں کوئی نہیں تھا جو اس سے کہتا۔

"نہیں ہوں بابا! میں تم سے ناراض کب کب تک
یہ رونی صورت بنائے رکھو گی۔" اس کے دل نے
شدت سے دھماکا لگی کہ کیس سے بھی وہ آجائے بالکل
اچھا لگ رہے آئے اور اگر اسے حیران کر دے۔ وہ اپنے
قدموں چلتی ہوئی کچن کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی

ہو گئی۔ لیکن اس کی نگاہیں ابھی بھی اسی جگہ پر تھیں۔

”آج ہم دونوں نے بہت فاسی طریقے سے ایک دوسرے سے محبت کا اظہار نہیں کر دیا؟“ دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے وہ بہت کمرے کمرے سانس لے رہی تھی۔ وہ روٹا چاہتی تھی بہت شدت سے اور چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی۔ مگر برسوں سے آنکھوں کے اندر جھپٹے ہوئے آنسو ایک بار پھر پھلنے سے انکاری ہو گئے تھے۔ آنسوؤں کا یہ گلاشیئر عمر بھر نہیں پگھلے گا وہ جانتی تھی پھر بھی رونے کی کوشش کر رہی تھی۔

کچھ ایسے گھاؤ بھی ہوتے ہیں جنہیں زخمی آپ نہیں دھوتے۔

بن روئے ہوئے آنسو کی طرح سینے میں چھپا کر رکھتے ہیں۔

اور ساری عمر نہیں دھوتے۔
غیندیں بھی مہیا ہوتی ہیں، سپنے بھی دور نہیں ہوتے۔

کیوں پھر بھی جاگتے رہتے ہیں۔ کیوں ساری رات نہیں سوتے۔

اب کس سے کہیں اے جان وفا

یہ اہل وفا

کس آگ میں جلتے رہتے ہیں، کیوں بجھ کر راکھ نہیں ہوتے۔

”صبا! ار تفضی نے اس کے پاس آکر بڑی آہستگی سے اسے پکارا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ اس کے قریب کھڑا بہت تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔ محلہ لان میں ہی کچھ دیکھنے لگا تھا۔ ار تفضی اسے لان میں چھوڑ کر اس کے پیچھے اندر آیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ار تفضی کی طرف دیکھا تو اسے اس کی آنکھوں سے بھاٹکا ہوا کرب اور درد صاف نظر آیا۔ وہ کتنی غافل اور تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔

ار تفضی خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ چمک کر وہ ایک دم دیوار سے اپنی اور ار تفضی پر نگاہ ڈالنے لگا۔

”بھاتی ہوئی اس کمرے میں آئی تھی جس میں پہلی بار صبا آئے۔ پھر یہی کمرہ۔ یہ پہلوں پر لٹکائے وہ بالکل سناٹا تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں آنے پر سب کچھ ہو گا۔ اسی لیے اس نے یہاں آنے سے بچنے کی بہت کوششیں بھی کی تھیں۔ لیکن زندگی نے نہ پہلے کبھی اسے معاف کیا تھا اور نہ اب اسے معاف کرنے پر تیار تھی۔ زندگی اس کے لیے ایک کے بعد ایک آزمائش تیار رکھتی تھی۔



”ماما کو کیا ہوا ہے بابا؟“ ار تفضی لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ معاذ بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔ ”بالکل چپ بیٹھی ہیں۔ مجھ سے بات بھی نہیں کر رہیں۔“ وہ یقیناً صبا کی تلاش میں کمرے تک گیا تھا اور اسے خاموش دیکھ کر مایوس ہو کر اس کے پاس آیا۔

”کچھ نہیں ہوا بیٹا۔“ اس نے جواب دینے کے ساتھ ہی اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ ”اے نہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ بابا۔“ وہ طبیعت کا سن کر فوراً ”اسے ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دینے لگا تھا۔

”ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ویسے ہی تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائیں گی۔“ اس نے بیٹے کو تسلی دی۔

”تم لی وی دیکھو نا معاذ“ اس کا ذہن صبا کی طرف سے ہٹانے کے لیے اس نے جلدی سے لی وی آن کر کے اس کی پسند کا کارٹون چینل لگا دیا تھا۔ وہ خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر کارٹون دیکھنے لگا تھا۔

صبا کی حالت دیکھ کر اسے خود اپنی حالت یاد آتی تھی۔ شمن کے مرنے کے بعد جب وہ پہلی مرتبہ لاہور آیا تھا۔ صبا تو اس طرح روئی نہیں، وہ تو اپنے بیڈ روم میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ وہاں اسے رونا ہوا دیکھنے والا کوئی نہیں تھا، وہ تنہا تھا اس گھر میں اس کمرے میں اور شمن کو یاد کر کے وہ اس دن کتنی دیر تک روتا رہا تھا۔ اسنے اور گھر کو اس نے نفی حسرت

سے دیکھا تھا۔ مگر جو اس نے اور جس نے مل کر پایا تھا۔ یہاں کے دروازے اور ان تمام محبت بھرے گھروں کے امین تھے جو اس نے اور جس نے یہاں اپنے تھے۔ انہوں نے اسے آج تک یاد تھا۔

وہ لوگ یہاں شام میں آئے تھے اور اب رات ہو چکی تھی۔ معاذ کو ہم کنگ رہی تھی۔ یہاں اب وہ مستقل تو رہتا نہیں تھا اس لیے گھر کی دیکھ بھال اور حفاظت کے لیے بس ایک چوکیدار رکھا ہوا تھا۔ باقی کوئی ملازم نہیں تھا۔ وہ یہاں بہت سے بہت دو تین دن کے لیے آتا تھا بلکہ کبھی تو صرف صبح سے شام تک کے لیے ایسے میں یہاں انسانی ملازمین کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اگر دو تین دن کے لیے بھی آتا تو صرف ناشتہ ہی گھر پر کرتا تھا اپنا اتنا کام وہ خود ہی کر لیا کرتا تھا۔ پھر نہ سچ اس کا گھر ہوتا تھا اور نہ ڈنر۔ اگر کسی کاروباری سچ یا ڈنر میں جانا نہ ہوتا تو وہ کہیں بھی باہر ہی سچ اور ڈنر کر لیا کرتا تھا، نہیں تو رضا کے گھر چلا جاتا تھا۔ اس وقت اسی لیے وہ معاذ کو ساتھ لے جا کر باہر سے کھانا لے آیا تھا۔ معاذ فاسٹ فوڈز کا شوقین تھا اسی لیے کھانے میں برگرز، سینڈویچز، فریج، فرائز اور پیسی موجود تھے۔

وہ سب چیزیں میز پر رکھ کر اسے بلانے کے لیے آیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ وہ سری دستک پر دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے سارے جسم کا خون ہی نچوڑ لیا ہو۔ اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ وہ اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے بہت دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ار تفضی نے ایک دو منٹ خاموشی سے اسے دیکھا پھر جیسے سوال میں بولا۔

”اباؤ کھانا کھاؤ۔“

”مجھے جھوک نہیں ہے آپ دونوں کھالیں۔“

اس نے صبح بھی بہت قحط لہجے میں کیا۔

”تھوڑا سا کھانا۔ معاذ ٹھیک ہے تمہارا انتظار کر رہا

تھے۔“ اس نے معاذ کو نام لے کر اصرار کیا تو فوراً ہی پارکنگ گئی۔

”آپ ہا میں“ میں آ رہی ہوں۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے چلت گیا تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ ان دونوں کے پاس ٹھیک پر آئی۔ معاذ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

”پاپا کے بیڈ روم میں میری بڑی تصویر لگی ہے۔ اتنا چھوٹا ہوں میں اس تصویر میں۔ ماما بھی ہیں اس میں اور پاپا بھی ہیں۔“ معاذ پورے گھر کا تفصیلی معائنہ کر چکا تھا۔ وہ اب اسے اس قسم کی اطلاعات فراہم کر رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس کی بات سنی۔

”چلیں، میری تصویر دیکھیں۔“ وہ کھانا کھا چکا تھا۔ اب اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اپنی تصویر دکھا سکے۔

”میں بعد میں دیکھ لوں گی معاذ!“ اس نے انکار کیا تو وہ ضدی لہجے میں بولا۔

”نہیں، ابھی دیکھیں۔“

”معاذ!“ ار تفضی نے تیزی سے نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”اچھے بچے ضد نہیں کرتے، بیوی کی بات فوراً“ مانتے ہیں۔“ وہ ار تفضی کے ٹوکنے پر خاموش ہو گیا، لیکن حسب عادت اس کا منہ پھول چکا تھا۔ ار تفضی اس کے منہ پھلانے کا نوٹس لیے بغیر ٹیبل سے اٹھ گیا تھا۔

وہ معاذ کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔ یہاں بابا اور ڈیڈی نہیں تھے جن کی وجہ سے اسے ار تفضی کے بیڈ روم میں جانا پڑتا۔ تھوڑی دیر وہ اس سے بھی ناراض رہا تھا پھر جب اس نے اسے اس کی پسند کی کہانی سنائی شروع کی تو کہانی سننے سننے ہی وہ اپنی ناراضی بھول گیا۔ کہانی ختم بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ سو گیا تھا۔

معاذ کا اپنے قریب ہونا اسے ان گھنٹوں میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ پر سر رکھ کر لٹا تھا اور وہ اس کے بازوؤں میں پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ معاذ جلدی سے بڑا ہو جائے۔ اتنا بڑا کہ اسے صبا کی بیاہوں کی ضرورت نہ رہے بلکہ صبا اس کی بیواہوں میں سکون ڈھونڈے۔

”جلدی سے بڑے وہ بڑے معاذ میں تھے اپنے
 دل کی سب باتیں کہہ کر کہ بہت محنت سے میرے
 اندر سے کس سے کہوں اور کتنا ہے مجھے جسے بھی بتاؤں
 گی مجھ سے غرت کرنے کے مجھے مجھے لڑتوں سے
 بہت اور کتنا ہے معاذ تمہیں یہ بتاؤں گی کہ میں نے
 تمہاری بات کی جگہ سمجھتی ہے تب بھی غرت نہیں کرے
 مجھ سے۔ تمہیں یہ بتاؤں گی کہ میں نے تمہاری بات
 سے اس کا اثر پر اور بڑا چھوٹا ہے تب بھی غرت نہیں
 کرنا مجھ سے۔ اگر تم نے اپنا پیار مجھ سے واپس لے لیا
 تو میں زندہ کس طرح رہوں گی۔“ وہ کتنی باندھے اس
 بچے کو دیکھ رہی تھی جسے اس نے جنم نہیں دیا تھا لیکن
 وہ اس سے پیار و سہمی کرتی تھی جیسا ایک ماں اپنے
 بچے سے کرتی ہے۔



صبح اس کی آنکھ اپنے وقت پر کھل گئی۔ معاذ بڑی
 بے غری سے گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ بھی کمرے سے
 نکلنے کے بجائے منہ دھو کر وہیں بیٹھی رہی۔ دروازے
 پر دستک ہوئی تھی وہ جانتی تھی باہر ار تفضی ہو گا۔ اس
 نے اٹھ کر فوراً ”دروازہ کھولا اور اسے دیکھتے ہی سلام
 بھی کیا۔ وہاں بابا اور ڈیڈی کے سامنے اس کے ساتھ
 بہت اچھی طرح بات چیت کرتے شاید وہ اس بات کی
 عادی ہو گئی تھی کہ اسے دیکھ کر سلام کرے ”سلام کا
 جواب دیتے ہوئے اس نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی
 اور پھر کمرے کے اندر آ گیا۔

”معاذ سو رہا ہے۔“ معاذ کو سوتا دیکھ کر اس نے
 نوک کالی کی اور پھر اس کے پاس جا کر بہت آہستہ سے
 اس کے گل پر چار کیا۔

”تم دونوں بچتے کر لینا اور لے کر آنا کہ رمت کو
 بھیج کر جو چیز کھانے کا دل چاہے ”منگو لینا۔“ وہ معاذ
 کے پاس سے بچے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔ وہ
 آفس جالے کے لیے تیار نظر آ رہا تھا اس نے جواباً
 ”ہاں“ دیا۔

”جی ہاں“ کے لیے تو اس نے معاذ کو ہٹا لیا تھا

لیکن گھڑی گھڑی اسے یاد آ رہی تھی کہ وہ
 سب باتیں پر اپنا کمر تھا لیکن میں تم سے کتنی
 محنت تو وہ یاد آ رہی اسے بھولنے کی کوشش کرتی تھی
 کہیں۔ وہ اس کا نہیں انجوا اسے کہنے آیا تھا وہاں
 چھٹیوں میں اسے ہر طرح سے انجوا اسے کہتے ہوئے
 اور خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ جو کیدار کو اس نے ہاتھ
 سے متعلق سلمان کی اسٹ بنا کر دے دیا تھی۔ جب
 تک سلمان آیا وہ معاذ کے ساتھ لی وی دیکھتی رہی۔
 جیسے ہی جو کیدار سلمان لایا وہ کچن میں آگئی۔ معاذ کو
 شوق سے کھاتا تھا اس نے اس سے کچ میں ہڈائی
 پکانے کا پوچھا تو اس نے جھٹ کر وہاں ہلا دی۔ اس نے
 بڑے اہتمام سے اس کے لیے بریانی پکائی رات بھر
 وہ لی وی دیکھنے کے بعد کچھ دیر اس کا سر کھاتا رہا پھر
 دیکھ کر کہ اس کا کام تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا
 کمپیوٹر کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ اسے کمپیوٹر پر
 مصروف دیکھ کر وہ کچن سے فارغ ہوتے ہی ظہر کی نماز
 پڑھنے کمرے میں آگئی۔ نماز پڑھ کر آئی تو معاذ کی کسی
 شے کے ساتھ باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ہری طرح
 چونکتے ہوئے تیزی سے لاؤنج میں آئی تو معاذ کے برابر
 میں ار تفضی بیٹھا نظر آیا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی۔
 ”تم دونوں کو لے جانے کے لیے لے جانے آیا تھا۔ میں
 نے سوچا تھا کہ لے کر کہیں باہر کرنا چاہیے لیکن معاذ کہہ
 رہا ہے کہ گھر پر کھانا پک چکا ہے۔“ اس نے مسکراتے
 ہوئے اس سے کہا۔ گھر پر بابا اور ڈیڈی کی وجہ سے بات
 کرنا وہ سری بات تھی یہاں اس سے بے تکلفانہ
 انداز میں گفتگو کرنا اسے بہت برا لگ رہا تھا پھر بھی وہ
 چپ تو نہیں رہ سکتی تھی اسے جواب دینا تھا۔

”ہاں وہ معاذ کی وجہ سے۔“ اس نے مختصر ”کہا۔
 ”جو معاذ کی وجہ سے پکایا ہے وہ مجھے بھی کھلا۔“
 اب آفس جا کر اکیلا کیا بیچ کر دے گا۔“ وہ اس کے
 تاثرات انجوائے کرتے ہوئے بظاہر سنجیدگی سے بولا۔
 اس نے اپنی مرضی سے کچی گھر گھر ہستوں کی طرح بازار
 سے کچھ منگوانے کے بجائے گھر پر کھانے پکایا تھا اور
 اب خود ہی اپنی اس تلاش پر جھنجھلائی ہوئی لگ رہی

تھی۔ اس کے چہرے کی اس جھنجھلاہٹ پر اسے لمبی آ رہی تھی۔

”میں سمجھ رہا تھا معاذ بچہ نہی کہہ رہا ہے۔ یہ تو واقعی بریائی ہے۔“ وہ بریائی کی ڈس دیکھ کر حیرت سے بولا۔ معاذ اس کی بات پر برامانے ہوئے فوراً بولا۔

”ماما نے مجھ سے پوچھ کر بریائی پکائی ہے۔“ کوئی بچہ سمجھ کر اس کی بات کا یقین نہ کرتا تو اسے بہت غصہ آتا تھا۔ معاذ کی طرح وہ بھی بہت شوق سے کھانا کھا رہا تھا۔ ”بابا ٹھیک کہہ رہے تھے، تم واقعی ماما جیسا کھانا پکانے لگی ہو۔ ایسی بریائی ماما پکاتی تھیں۔ اس کی خوشبو اور ذائقہ بالکل ویسا ہی ہے۔“ اس تعریف کے جواب میں اس کا نصیحتیں کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا لیکن پھر بھی اس نے بولا تھا۔ اپنے بچکانہ طریقوں میں کمی لانے کی وہ کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ کہتا ہے کہ مجھے پتا ہے تمہیں یہ رشتہ قبول نہیں ہے تو پھر واقعی اس بات کو بار بار اور چیخ چیخ کر دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کھانے کے فوراً بعد وہ واپس آئیں چلا گیا۔



رضانے اسے فون کر کے بہت اصرار سے بلایا تھا۔ وہ خود یہاں جب بھی آتا، رضا سے ملے بغیر نہیں جاتا تھا۔ اگر وہ صبا کے بغیر صرف معاذ کے ساتھ اس کے گھر جاتا تو وہ یقیناً برا مان جاتا۔ وہ لوگ اس کے گھر پہنچے تو رضا خود ان کے استقبال کے لیے گیٹ پر آیا۔ بڑے احترام اور خلوص سے اس نے اس سے سلام دعا کی اور اس کی خیریت دریافت کی پھر وہ معاذ کو جھک کر پیار کرنے لگا۔

”میں نے فائزہ کو بتایا کہ ار تضحیٰ صبا اور معاذ کے ساتھ لاہور آیا ہے تو وہ آپ لوگوں سے ملنے کے لیے میرے چچے لگ گئی۔ ہم لوگ وہاں پہنچے تو جو کیدار سے بچا چکا کہ آپ لوگ ابھی ابھی گھر سے اٹلے ہیں۔“ وہ ان لوگوں کو اندر لے کر آتے ہوئے اسے بتا رہا تھا۔ وہ یہاں آنے کے لیے پہلی طور پر تیار نہیں تھی۔ اس کا ان لوگوں سے ملنے کا بھی کوئی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن

پھر بھی اسے الما لاق ہونے کو مسکراتی تھی۔ اسے تکلیف نہ تھا اس کے لیے یہاں آنا۔ وہ اس گھر میں ایک بار پہلے بھی آئی تھی۔ تب کس حیثیت سے آئی تھی اور آج کس حیثیت سے۔ اس نے ان کے اس کونے کی طرف دیکھا جس پر وہ اور جن سہفت ڈرنگس ہاتھوں میں لیے کرسیوں بیٹھی تھیں۔ ان لوگوں کی آواز میں سنتے ہی فائزہ پکتنے اٹھ گئی۔

”بہت خوشی ہو رہی ہے صبا! تمہیں یہاں دیکھ کر۔“ ار تضحیٰ کو سلام کرتے ہوئے اس نے بڑی گرم جوشی سے اس کے ہاتھ تھامے۔ وہ سب صوفوں پر بیٹھ گئے۔

”معاذ ماشاء اللہ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ جب یہاں سے گیا تھا تو میرا خیال ہے پورے سال کا بھی نہیں تھا۔“ اس نے معاذ کو دیکھتے ہوئے محبت سے کہا۔ معاذ منہ پھلوائے خاموش بیٹھا تھا لیکن اس کی یہ خاموشی اور ناراضی زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکی تھی۔ وہاں اپنا ہم عمر بچہ دیکھ کر اس کا سوڈ بہت جلدی ٹھیک ہو گیا۔

”آجاؤ صبا! میں کچن میں ہوں، تم بھی وہیں آجاؤ۔“ فائزہ یقیناً ان لوگوں کے لیے کھانے کا اہتمام کرنے میں مصروف تھی، اس لیے مزید وہاں بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ وہ اٹھ کر اس کے ساتھ کچن میں آگئی۔

”آپ کو ہماری وجہ سے زحمت ہو رہی ہے، اس طرح اچانک زیادہ لوگوں کے ڈنر کی تیاری کرنی پڑ رہی ہے۔“ وہ چپ تو نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے کوئی نہ کوئی بات تو کرنی ہی تھی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو صبا! ار تضحیٰ بھائی مجھے سگے بھائیوں کی طرح پیارے ہیں۔ اگر اس وقت تم لوگ نہیں آتے تو مجھے بہت دکھ ہوتا۔ میں اور رضا تم لوگوں سے گھر پر ملنے بھی اس لیے گئے تھے کہ تم لوگوں کو باقاعدگی سے ڈنر پر انوائٹ کریں۔ اب اس وقت تو میں کچھ خاص اہتمام نہیں کر سکی ہوں لیکن تم لوگوں کی ایک شاندار سی دعوت مجھے لازمی کرنی ہے۔“ وہ اتنے برسوں میں ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔ فائزہ نے سلام میں مایہ نسر کس کرتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔

”تم بہت بدل گئی ہو سیدھا پہلے سے بہت دلی اور
کمزور لگ رہی ہو۔“ وہ جو لپٹا خاموش رہی تو فائزہ قہقہہ
ہنسی۔

”ار ترضی بھائی سے تمہاری والدہ کے بارے میں دیکھا
چلا تھا۔ اپنے دکھ کا اظہار لفظوں میں نہیں کر سکتی۔
پہلے حسن اور اب تمہاری والدہ آگے پیچھے کئے
ملو ملاوت ہوئے ہیں تم لوگوں کی فیملی میں۔ اتنے
علامات کے بعد انسان کچھ نہ کچھ تو بدل ہی جاتا
ہے۔“ اسے پتا تھا وہ کسی طور پر افسوس نہیں کر رہی
لیکن پھر بھی وہ خاموش رہی۔

”حسن کے بارے میں آج تک یقین نہیں آتا صبا!
وہ ہنستی مسکراتی خوش اخلاق اور مہربان سی لڑکی اس
طرح بالکل اچھا لگتا۔“ وہ بولتے بولتے خود ہی چپ
ہو گئی۔ ”ساتھ بھونے پھرنے کے پروگرامز بنانے۔
ایک دوسرے کے گھر پر بے تکلف آنا جانا۔ اب تو وہ
سب باتیں خواب جیسی لگتی ہیں۔“ وہ اپنا کام چھوڑ کر
اس سے حسن کے بارے میں بات کرتے ہوئے بے
حد ممکن لگ رہی تھی۔

”بالا وجہ میں نے تمہیں اس کر دیا۔“ چند سیکنڈز
کی خاموشی کے بعد اسے خود ہی اس بات کا احساس ہوا
کہ صبا اس کی باتوں سے بہت اس پر ہورہی ہوگی۔
”گام میں یہ کیاب میں مل دیتی ہوں۔ آپ چاول
دیکھ لیں۔“ وہ اس کی شرمندگی دور کرنے کے لیے
مسکراتے ہوئے کوکنگ ریج کے پاس تکی۔ فائزہ نے
پہلے قہقہہ منع کیا لیکن اس کے دوبارہ کہنے پر وہ
قرآنکھ چین اس کے حوالے کر کے چاولوں کی طرف
موجہ ہو گئی۔

”بہت اچھا فیصلہ کیا ہے تم لوگوں کے پیچھے
سنے۔ ار ترضی بھائی نے تمہاری اور اپنی شادی کے
بارے میں بتایا تو یقین کرو بہت خوشی ہوئی۔ تم تینوں
کے حق میں اچھا ہے یہ فیصلہ۔“ اس نے عورتوں کی
مخصوص غفرت کے تحت کر کے والے انداز میں
اس کے اور ار ترضی کے تعلقات کے بارے میں کوئی
سوچت نہیں کی تھی۔

حسن اور ار ترضی کی اپنی شادی بھی اس کی شادی
کے بارے میں نہیں اس قدر بڑھ کر کے اس نے
موضوع تبدیل کر دیا تھا۔

کھانے کے بعد وہ لوگ وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرے
تھے۔ ار ترضی کو اندازہ تھا کہ صبا میں زندگی بھر
دلی گئی ہے اسی لیے اس نے کھانے کے بعد ہی وہ
بعد جانے کا شور مچا کر رضا کے مزید رکنے کے اصرار کو
دبا دیا تھا۔ ان سے رخصت ہو کر وہ لوگ گاڑی میں
بیٹھے تو ار ترضی نے دیکھا کہ گاڑی میں بیٹھے ہی صبا نے
چہرے پر سے وہ خوش اخلاقی کا تاثر دیتی مسکراہٹ ہٹا لی
تھی۔

گھر آتے ہی وہ سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔
معاذ اور ار ترضی گھر کے اندر ابھی داخل ہوئے تھے اور
وہ ان سے پہلے ہی تیز قدموں سے اپنے کمرے کی
طرف چلی گئی۔



ار ترضی نے معاذ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے لچ
کرائے لے جائے گا۔ معاذ بہت خوش تھا دو بچے
ار ترضی نے فون کر کے بتایا کہ مصروفیت کی وجہ سے وہ
نہیں آ سکے گا۔ تو معاذ پر اس بڑ گئی۔ صبا نے اسے اس
کا پسندیدہ پراٹھا بنا کر دیا تو وہ بہل گیا۔ اب وہ بے چینی
سے شام کا انتظار کر رہا تھا۔ ار ترضی نے ڈنر یا ہر کرائے کا
وعدہ کیا تھا۔ لیکن ار ترضی کی واپسی پر اس کے ساتھ
ایک اور گاڑی اور اس میں سے اترتے دو افراد کو دیکھ کر
معاذ کی ساری خوشی ختم ہو گئی۔ ”غالباً وہ اس کے بڑے
سے متعلق ہی کوئی جاننے والے تھے۔ وہ معاذ کے لیے
کھانے کا بندوبست کرنے کچن میں آ گئی لیکن اس
نے ڈرائنگ روم میں چائے یا کافی بھجوانے کے
بارے میں ذرا بھی نہیں سوچا تھا۔“

وہ کچن میں اپنا کام مکمل کر کے معاذ کے پاس کمرے
میں آ گئی۔ اس کا مونا آف تھا۔ اس وقت وہ ار ترضی کے
ساتھ ساتھ صبا سے بھی ناراض تھا۔ اسے انکراؤ
کر کے وہ پیچھے پھسلیں اور کمرے اپنے گرو پھیلانے کوئی

ڈرائنگ بنانے میں مصروف تھا۔ وہ اسے منانے کی
کوشش کرے گی۔

"ایک تو آفس سے اتنی دیر سے آئے ہیں بیبا پھر
اب کمرے بھی آفس کا کام کر رہے ہیں۔ میں بات نہیں
کروں گا بیبا۔ ماما! ہم واپس کراچی چلتے ہیں بیبا کو
یہاں اکیلا چھوڑ کر۔" وہ باپ سے سخت ناراض تھا۔
اس سے اچھا تو وہ کراچی میں تھا۔ وہاں بیبا تھے ڈیڈی
تھے۔ یہاں تو ماما کے علاوہ اس سے بات کرنے والا کوئی
نہیں تھا۔ وہ منہ پھلا کر بڑی ناراضی سے بیٹھا تھا۔ کچھ
دیر وہ معاذ کے ساتھ باتیں کرتی رہی پھر اٹھ کر اس کے
لیے کھانا لینے کچن میں آگئی۔ وہاں چائے بنائے جانے
کے آثار نظر آئے تھے۔ یقیناً ار ترضی خود اپنے مہمانوں
کے لیے چائے بنا کر لے گیا تھا۔

وہ ایک سرسری نگاہ سے اس چیز کا جائزہ لیتے ہوئے
رُے میں چکن پائی اسپرائٹ کی بوتل اور گلاس رکھتے
لگی۔ آج اس نے معاذ کے لیے بڑے اہتمام سے
چکن پائی بنائی تھی۔ وہ رُے لے کر کمرے ہی میں
آگئی۔ معاذ کھانے میں اپنے لیے اتنا اہتمام دیکھ کر کسی
قدر بہل گیا تھا۔ ان دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔
کھانا کھاتے ہوئے وہ معاذ کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے
اس کی پسند کی باتیں کرتی رہی تھی۔ کھانے کے بعد وہ
دوبارہ ڈرائنگ بنانے بیٹھ گیا تو وہ بھی اس کے ساتھ
ڈرائنگ میں رنگ بھرنے لگی۔ معاذ کو فینڈ آرہی تھی
لیکن وہ فینڈ بھگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ باپ سے
ناراض تھا اور اسے یہ بات بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے
ناراض ہے مگر دوستی جاننے کی کوششیں کرنے کے
باوجود بھی وہ دس بجے سے زیادہ نہیں جاگ سکا تھا۔ دن
میں بالکل نہیں لیٹا تھا۔ وہ ڈرائنگ بناتے بناتے اس کی
گود میں سر رہے سو گیا تھا۔ اس کے سوتے کے بعد اس
نے بچے آرام سے اسے گود میں اٹھا کر نیچے پر لٹایا اور
خود بھی اس کے پاس لیٹ گئی۔ خاصی دیر بعد دروازے
پر دھتک ہوئی اسے یاد تھا۔ ار ترضی ہو گا۔ اس نے اٹھ
کر دیکھا تو...

"معاذ سو گیا۔" اس کے ذہن انہ کو لیتے ہی اس نے

پوچھا۔ وہ بغیر جواب دیے سامنے سے ہٹ گئی تو وہ
دور "ای اندر آ گیا۔"

"ابھی سو رہا ہے۔" معاذ کے پاس جاتے ہوئے اس
نے صبا سے پوچھا۔ اس نے گردن ہلا دی۔ وہ اس پر
بھکا آہستہ سے اس کے گل پر ہمار کر رہا تھا۔

"مجھ سے بہت ناراض ہو گا۔" اسے پیار کر کے
پتھپتھتے ہتے ہوئے اس نے مزید پوچھا۔ یقیناً اسے بیٹے کی
ناراضی کی بہت فکر تھی۔ وہ جواب میں ہاں یا نہیں
کہنے کے بجائے خاموش رہی۔ ار ترضی نے ایک پل
کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خاموشی سے دروازے
کے پاس کھڑی اس کے کمرے سے نکل جانے کی منتظر
تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ کل رضا کے کمرے جانے والی
بات پر اسے اب تک غصہ ہے۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر
کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی وہ دوبارہ معاذ
کے برابر میں لیٹ گئی تھی۔ صبح اس کی آنکھ کچھ تاخیر
سے کھلی۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے اپنے برابر میں
دیکھا۔ معاذ وہاں نہیں تھا۔ وہ ایک دم ہی بستر سے اٹھی
تھی۔ حالانکہ پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں تھی۔
وہ جاگ کر یقیناً ار ترضی کے پاس لان میں چلا گیا ہو گا
لیکن وہ پھر بھی بڑی تیزی سے باہر آئی تھی۔ باہر نکلتے
ہی اس کے کانوں میں معاذ کی آوازیں آئی تھیں۔ وہ
ار ترضی کے کمرے کی طرف آگئی۔

"میں آپ سے پکا ناراض ہوں، کبھی بھی دوستی
نہیں کروں گا۔" بیڈ پر آٹھی پالسی مار کر بیٹھا وہ اپنی
ناراضی کا شدت سے اظہار کر رہا تھا۔ وہ کمرے کے
دروازے پر رک کر اسے دیکھنے لگی۔ ار ترضی اس کے
پاس بیٹھا بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ آفس
جانے کے لیے مکمل طور پر تیار نظر آ رہا تھا۔ آج شاید
اسے کسی خاص میٹنگ یا میٹج میں شرکت کرنا تھی جس
کی وجہ سے وہ اتنے زبردست طریقے سے تیار ہوا تھا۔
بلیک نوٹیس سوٹ ڈائنٹ شرٹ۔

"مایا سوری پولیس کے پھر بھی دوستی نہیں
کرے گی؟" وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"پھر بھی دوستی نہیں کروں گا۔ کبھی بھی نہیں کروں

کہ "میرزا کو تو میں بولا۔ اور تضحیٰ اس کی بات سے نہ کر
 دیر لپٹ کر لیا۔
 "میرزا آج کچھ کے لیے چلیں بہت سارا
 کھوس پھر بھی دوستی نہیں ہوگی۔" وہ اپنی مسکراہٹ
 ہلاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔
 "مجھے کیا ہے؟ آپ نے کڑی نہیں جاکیں گے۔"
 وہ ہانپنے سے انکار کرنے لگا۔ اور تضحیٰ نے جب ساخت
 اسے اپنی گود میں بٹھالیا۔

"میں اور تضحیٰ ٹھنڈے آج ۲۹ دسمبر کو صبح ساڑھے آٹھ
 بجے اپنے پیارے معاذ سے یہ وعدہ کر رہا ہوں کہ آج
 شام ٹھیک پانچ بجے گھر آجاؤں گا اور اس کے بعد کا سارا
 وقت معاذ کا ہوگا۔ جہاں معاذ کے گا، ہم وہاں چلیں
 گے۔ جب تک اس کا گھر واپس آنے کو دل نہیں
 چاہے گا، واپس نہیں آئیں گے۔ جہاں معاذ کے گا،
 وہاں ڈنر کریں گے۔" اسے اپنے بالکل قریب کیے وہ
 بڑی سنجیدگی سے وعدہ کر رہا تھا۔ معاذ نے بے یقینی سے
 اسے دیکھا۔

"پر اس کریں۔"

"پر اس" بالکل پکارا پر اس۔ ادھر گھڑی پانچ بجائے
 گی، ادھر پانچ گھر میں موجود ہوں گے اور معاذ کے پاپا کبھی
 جھوٹ نہیں بولتے، کبھی جھوٹا پر اس نہیں کرتے۔
 شاید کل کی اس کی ناراضی نے اور تضحیٰ کو ڈسٹرب کیا تھا،
 اسی لیے اس وقت وہ اس طرح اس سے وعدہ کر رہا تھا۔
 معاذ کی آنکھوں میں بڑی پیاری سی چمک تھی۔ اس کی
 ساری ناراضی ایک دم ہی دور ہو گئی تھی۔

"اب تو پاپا سے لڑائی نہیں ہے نا۔" وہ اس کے
 گالوں پر پیار کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔ معاذ نے نفی میں
 سر ہلا دیا تھا۔

"پاپا تم سے بہت پیار کرتے ہیں معاذ! کل رات
 ناراض ہو کر سوئے تھے تو پاپا کو ساری رات نیند نہیں
 تکی تھی۔" معاذ حیرت اور خوشی سے اس کی طرف
 دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس درجہ شدت سے کبھی اس
 کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ اس پر اپنا
 حوالہ سارے غیب و کشف کی بجائے اس کی ضد و

دانش و بہت بھی کر لیا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ بالکل
 مختلف انداز میں بیٹے سے باتیں کر رہا تھا۔ سب کو اس پر
 ان دونوں کو دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے پٹنے
 کے بجائے دروازے پر ہی رہ گئی تھی۔
 "آپ پاپا جاتیں؟" اس کے چہرے کو ہاتھوں میں
 تھام کر اس نے پوچھا تو معاذ نے فوراً "گھر دن ہلا دی۔ وہ
 اسے گود سے اتار کر بیڈ پر بٹھاتے ہوئے خود اٹھ کھڑا
 ہوا تھا۔

"تیار رہنا، ٹھیک پانچ بجے۔" اس نے گویا معاذ کو
 یاد دہانی کروائی۔ اس نے بڑے زور و شور سے جھوم کر
 گردن ہلا دی تھی۔ اور تضحیٰ ایک پیار بھری نگاہ اس پر
 ڈال کر بریف کیس اور موبائل اٹھاتے ہوئے
 دروازے کی طرف کھواہ صبا نے دیکھا کہ اس کے
 کوٹ پر اچھی خاصی شانیں پڑ گئی تھیں۔ اپنے سوٹ
 کی پروا کیے بغیر اس نے جس طرح معاذ کو گود میں بٹھا کر
 پیار کیا تھا، اس نے اس کی تیاری کو تھوڑا سا خراب
 کر دیا تھا لیکن وہ اس بات سے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔
 اس نے ہاتھوں سے بھی ان شانوں کو ٹھیک کرنے
 کی کوشش نہیں کی تھی۔ مڑتے ہی اس کی نگاہ صبا پر
 پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"چکن پاپی بہت مزے کی تھی صبا! وہ دروازے پر
 آکر اس کے پاس ٹھہر گیا۔

"رات اتنی زبردست بھوک لگ رہی تھی، کچن
 میں جھانکا تو چکن پاپی دیکھ کر مزہ آ گیا۔" وہ ہولے سے
 ہنسا۔ جیسے اپنی بھوک اور ندیدے پن کو انجوائے کر رہا
 ہو۔ وہ جواباً "خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

ناشتے کے بعد معاذ اکیلا ہی فٹ بال کھیلنے لگا۔ وہ
 آج بہت خوش تھا۔ ساتھ کھیلنے کے لیے اس کے پیچھے
 بھی نہیں لگا تھا۔ وہ کچن سمیٹنے میں لگی ہوئی تھی۔
 اور تضحیٰ ناشتہ کیے بغیر چلا گیا تھا۔ کچن میں آتے ہی وہاں
 صرف رات کے برتنوں کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا
 تھا۔ صبح معاذ کو منانے میں یقیناً اس کا بہت وقت صرف
 ہو گیا تھا اور پھر شاید اس کے پاس اپنے لیے ناشتہ بنانے
 اور کرنے کا وقت نہیں بچا تھا۔

وہ ہاگن سے فارغ ہو کر معاذ کے پاس لائن میں آئی۔
 باہر نکلتے ہی سرد ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔ سردی
 کی شدت کا اندازہ تو اندر بھی ہو رہا تھا لیکن باہر نکل کر
 وہ اسے اپنے انداز سے بھی زیادہ لگی۔ اسے
 سردیاں اچھی لگتی تھیں۔ سردیوں کا موسم سردیوں کی
 بارش اس نے ہمیشہ انجوائے کی تھی مگر معاذ کے لیے
 اسے یہ موسم ذرا زیادہ ہی سرد لگا۔

”معاذ! باہر بہت ٹھنڈ ہے اندر آکر کھیل لو۔“ وہ
 اس کی بات مان کر فوراً اندر آ گیا۔ وہ اب لاؤنج میں
 فرش پر فٹ بال کھیلتا پھر رہا تھا۔

دھماکی بجے وہ اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔
 ”ماما! چلیں تیار ہوتے ہیں۔ آپ میرے کپڑے
 نکال دیں۔“ وہ اس کی بے قراری پر غصہ ہوتی ہنس
 رہی تھی۔

”بھی پانچ بجنے میں بہت دیر ہے جانو! اتنی جلدی
 تیار ہو کر کیا کرو گے۔ تھوڑی دیر سو جاؤ میں تمہیں
 ساڑھے چار بجے اٹھا دوں گی۔ تیاری کے لیے آدھا
 ٹھنڈ بہت ہے۔“ ہنسی روکتے ہوئے اس نے اسے
 پیار سے سمجھایا لیکن وہ سونے کے لیے تو ہرگز آمادہ
 نہیں تھا۔ اس کے بہت پیچھے لگنے پر صبا کو اس کے
 کپڑے نکالنے کے لیے کمرے میں اتار پڑا۔ جتنی دیر
 میں اس نے کپڑے نکالے اتنی دیر میں وہ ہاتھ روم
 جا کر خوب اچھی طرح رگڑ رگڑ کر منہ ہاتھ دھو کر آ گیا۔
 جو کپڑے اس نے نکالے تھے وہ اس نے بخوشی پہن
 لیے۔ سو میٹرنے میں بھی اپنی عادت کے مطابق کوئی
 غم نہیں کیا۔

”اب آپ بھی تیار ہو جائیں۔“ وہ اب صبا کے
 پیچھے لگا تھا کہ وہ تیار ہو۔ اس کا نہیں جانے کا کوئی موڑ
 نہیں تھا لیکن وہ معاذ کی معصومانہ سی خوشی کو ختم نہیں
 کرنا چاہتی تھی۔

”معاذ! اگر تم اور پاپا ملے جاؤ۔ میں کمرے رہ لوں۔“
 اس نے دیر سے اس سے پوچھا۔

”نہیں! آپ بھی جاؤ گی۔“ وہ کچھ تھاں سا ہوتا
 تھوڑی دیر کی طرف بھاگتا اس کے جو جو کپڑے اس کے

ہاتھ میں آتے جا رہے تھے اور انہیں کھینچ کھینچ کر باہر
 نکال رہا تھا۔

”تم ساری ساری کا علیہ بگاڑو گے۔ ہنو میں خود
 نکال لیتی ہوں۔“ وہ اس کے بغیر جانے کے لیے کبھی
 نہیں مائلے گا وہ جانتی تھی اسی لیے مزید کچھ کہے بغیر خود
 ہی کپڑے نکالنے لگی۔

وہ ہلکی پھلکی تیاری کے ساتھ اس کے سامنے آئی تو
 وہ بے اختیار بولا۔

”ماما! آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔“ اس نے
 بڑی سچائی سے اس کی تعریف کی۔

”تم بہت حسن پرست ہو معاذ!“ بے ساختہ اس
 نے معاذ سے یہ بات کہی اور پھر خود ہی چونک کر بالکل
 خاموش ہو گئی۔ معاذ کے بارے میں یہ رائے وہ ایک
 مرتبہ پہلے بھی دے چکی ہے۔ اسے اچانک ہی اپنی کہی
 وہ پرانی بات یاد آئی تو وہ بالکل خاموش ہو گئی۔

”یہ کیا ہوتا ہے؟“ معاذ حسن پرست کا مطلب
 نہیں سمجھا تھا۔ وہ حیرت سے اس سے اس بات کا
 مطلب پوچھ رہا تھا۔

”یہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔“ ایک گہری سانس لے کر
 وہ سیدھی ہوئی اور ہولے سے اس کے سرخ گالوں کو
 چھوا۔ سوٹ کے ساتھ کا دوپٹہ اوڑھنے کے بجائے اس
 نے سیاہ کشمیری کڑھائی والی گرم شال اوڑھ لی۔ وہ
 دونوں کمرے سے نکل کر واپس لاؤنج میں آئے تو موسم
 کچھ اور بدلا ہوا لگا۔ ہلکی ہلکی سی پھوار بارش میں بدلتی
 نظر آرہی تھی۔

”لگتا ہے خوب زوردار بارش ہوگی۔ اگر بارش
 ہوئی تو کیسے جاؤ گے معاذ!“ بڑی شرارتی مسکان چہرے
 پر لیے وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔

”بارش ہوگی تو بھی جاؤں گے۔“ اس نے پر زور
 انداز میں کہا۔ ساڑھے چار بج رہے تھے۔ وہ بیوی آن
 کر کے وقت گزارنے لگی۔

معاذ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کمرے میں جا کر پوریج
 میں بیٹھ گیا تھا۔

پانچ بجنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ انتظار

کی گھڑیاں ہیں ختم ہونے والی تھیں اور پھر گھڑیاں
نکلیں گے جیسے لیکن وہ نہیں آیا۔
”یہ ابھی تک کیوں نہیں آئے؟“ سوچا سوچ رہا ہے
تھے اور پچھلے پندرہ منٹوں میں وہ پندرہ دن مرتبہ اس
سے سوال کر چکا تھا۔

”آنے والے ہوں گے بیٹا! دیکھو بارش بھی آ رہی
تیز ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ رات میں نہیں پھنس
گئے ہوں۔“ وہ مسلسل اس سے یہی کہہ رہی تھی۔

”آنے والے ہیں“ آنے والے ہیں“ آپ کتنی دیر
سے یہی کہہ رہی ہیں۔“ ساڑھے پانچ بجے اس کے صبر
کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ اب اسے فون کر رہا تھا۔ صبا
نے اسے ٹوکا نہیں تھا۔ ریسپور کان سے لگائے وہ
دوسری طرف سے کال ریسپو کیے جانے کا منتظر تھا۔
کافی دیر تک ریسپور کان سے لگائے رکھنے کے بعد اس
نے مایوس ہو کر ریسپور واپس رکھ دیا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے اس سے
پوچھا۔

”یہاں کال ریسپو نہیں کر رہے۔“ وہ بہت مایوس اور
او اس نظر آنے لگا تھا۔

”لاؤ“ میں ٹرائی کروں۔“ وہ اٹھی اور ار تفضی کا
موبائل نمبر ملا یا۔ اس کا موبائل آف نہیں تھا۔ ڈائل
ٹون بھی بالکل ٹھیک تھی پھر وہ کال کیوں نہیں ریسپو
کر رہا تھا۔ اس نے تین مرتبہ ٹرائی کیا۔

”میرا خیال ہے وہ راستے میں ہوں گے۔ یہ دیکھ کر
کہ گھر سے فون کیا جا رہا ہے، جان کر بات نہیں
کر رہے۔ سوچ رہے ہوں گے اب تو میں گھر پہنچنے ہی
والا ہوں۔“ ریسپور کریڈل پر رکھتے ہوئے اس نے معاذ
کو تسلی دی۔ وہ بغیر کوئی جواب دیے صوفے پر جا کر بیٹھ
گیا تھا۔

”کیا ہوا معاذ؟“ وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔
”پاپا نے مجھ سے مجھوت بولا۔ مجھوتا پر امس کیا۔“
وہ لپ کی وہ غلامانی سخت غصے میں تھا۔

”کڑی سزا ہے مجھ پر جاری تھی اور وہ اس چھوٹے
سے بچے کو کسی بھی طرح کی بات سمجھا نہیں پاری تھی

کہ معاذ تیار ہے پاپا مجھوت نہیں پالے اور کسی سے
ساتھ وہ مسخا۔ مجھوت بول بھی نہیں سمجھتا۔ ساتھ
بھی نہیں بول سکتے۔ وہ معاذ کو نہیں سمجھا سکتی تھی
لیکن فون بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ ار تفضی منتظر
مجھوت نہیں پوتا اور اپنے بیٹے کے ساتھ تو وہ بھی
مجھوت بول ہی نہیں سکتا۔ وہ اٹھی اور ایک مرتبہ پھر
فون ملانے لگی۔ اب کی بار وہ اس کے آفس فون کر رہی
تھی۔ دوسری طرف اس کی سیکریٹری نے فون انینڈ کیا
تھا۔

”سرتو تین بجے آفس سے چلے گئے تھے۔“ ار تفضی
سے متعلق اس کے استفسار کے جواب میں اس نے
بتایا۔

”وہ آفس سے کہاں گئے تھے؟“ اس نے خود
محسوس کیا کہ اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ ہے۔

”میں سمجھ کر کہہ نہیں سکتی میڈم! انہوں نے آج صبح
آفس آتے ہی اپنی سب اپاٹمنٹس کینسل کرادی
تھیں۔ شام چار بجے ایک میٹنگ تھی، انہوں نے
اسے بھی ملتوی کر دیا تھا۔ کہہ رہے تھے
کہ آج انہیں اپنا کچھ پر سنل اور بہت ضروری کام
ہے۔ وہ آفس سے جلدی چلے جائیں گے۔ لیج بھی
نہیں کیا تھا انہوں نے۔ جلدی جلدی ضروری کام نمٹا
کر وہ تین بجے آفس سے اٹھ گئے تھے۔“ وہ شاید اس
کی پریشانی کو محسوس کر گئی تھی، اسی لیے بہت تفصیل
سے بتایا تھا۔ وہ فون بند کر کے واپس معاذ کے پاس
آگئی۔ وہ ابھی بھی رو رہا تھا۔

”چلے گئے ہوں گے اپنی کسی میٹنگ میں۔“ وہ
روتے ہوئے غصے سے بولا۔

معاذ روتے روتے خود ہی چپ ہو گیا تھا۔ باہر بارش
پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ موسلا دھار اور گرج
چمک والی بارش۔ بادلوں کی گرج چمک ان کے بیچ
موجود خاموشی کو بڑے خوفناک انداز میں تھوڑی
تھوڑی دیر بعد توڑ رہی تھی۔ اسے بادلوں کی گرج چمک
کبھی اچھی نہیں لگی تھی۔ عجیب سا خوف اور دہشت
پیدا ہو جاتی تھی بادلوں کے گرجنے سے اور آج تو یہ شور

اسے جوت سے بھی زیادہ برا لگ رہا تھا۔ گڑی میں ساڑھے سات بجے، کچھ کر معاذ نے ایک مرتبہ پھر رونا شروع کر دیا تھا اس نے اپنے ساتھ لگا کر پیا کر کیا۔

”معاذ! پاپا آنے والے ہوں گے تم دیکھ لینا ان کی گاڑی خراب ہو گئی ہوگی۔“ اس سے یہ بات کہتے وقت اسے ایسا لگا جیسے وہ معاذ سے زیادہ خود اپنے آپ کو تسلی دے رہی ہے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ کہیں بھی تھا چاہے گاڑی خراب ہو گئی تھی یا جو بھی مسئلہ تھا وہ گھر پر فون کیوں نہیں کر رہا تھا۔ وہ اتنا غیر ذمہ دار اور لاپرواہ بھی نہیں رہا تھا اور پھر وہ موبائل پر کال کیوں نہیں کر رہا تھا۔ وہ اٹھی اور اٹھ کر ایک مرتبہ پھر اس کے موبائل پر کال کرنے لگی۔ چار مرتبہ اس نے کوشش کی بہت دیر تک بیل جانے دی مگر وہ جیسے بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے رضا کے گھر کا فون نمبر ڈھونڈا۔ فون اس کے ملازم نے اٹھایا۔ رضا اور فائرہ گھر پر نہیں تھے وہیں رکھے ٹیلی فون انڈکس میں اسے رضا کے علاوہ ار تفضی کے کچھ اور جاننے والوں کے فون نمبرز بھی مل گئے۔ ان میں سے کسی کو بھی اس کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔

ریسپونڈر ایس رکھ کر وہ گم صم سی فون کے پاس کھڑی تھی۔ وہ یہاں رضا کی فیملی کے علاوہ کسی کو بھی نہیں جانتی تھی۔ وہ اس طوفانی بارش میں کس کے پاس جائے کس سے کہے کہ ار تفضی غصہ فر کو ڈھونڈ کر لے آؤ۔

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے نو بج چکے تھے۔ معاذ روتے روتے صوفے پر ہی سو گیا تھا۔

وہ کمرے سے اس کے لیے کپل اٹھا کر لے آئی۔ اس پر کپل ڈالتے ہوئے اس نے جھک کر اس کے کانوں پر ٹھہرے آنسو صاف کیے پھر اس کے ماتھے پر ٹھہرے بالوں کو پیار سے سنوارتے ہوئے اسے پیار کرنا چاہا۔ وہ اسے پیار کرنے کے لیے اس کے گل پر جھکی ہوئی تھی کہ ایک دم ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ اتنا تراب کر بھی وہ اسے پیار کرنے پر اسے اچانک ار تفضی کا

پانچ سال پہلے ایک طمہ مصورت سی شام کسی نے اسی وہاں اتنا دل میں ہی شدت کے ساتھ معاذ کو پیار کیا تھا۔ آخری بار پیار کیا تھا۔

”تم تو اسے ایسے پیار کر رہی ہو شمن ایسے یہ تم سے کہیں دور جانے والا ہے۔“

”اللہ نہ کرے جو کبھی معاذ مجھ سے دور ہو۔“ پانچ سال پہلے کی وہ شام زندہ ہو کر اس کے سامنے آ گئی ہوئی تھی۔

”ہونے دو خراب میرا بیٹا میری گود میں آ کر خوش ہو رہا ہے۔ اور میں یہ سوچ کر اسے خود سے دور کروں کہ کہیں میری ساڑھی نہ خراب ہو جائے۔“

”پاپا تم سے بہت پیار کرتے ہیں معاذ کل رات ناراض ہو کر سوئے تھے تو پاپا کو ساری رات نیند نہیں آئی تھی۔“ وہ خوف سے کانپتی مسلسل معاذ سے دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔

”اور معاذ کے پاپا کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ کبھی جھوٹا راس نہیں کرتے۔“ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے ٹکرا کر رک گئی تھی۔

بہت زور سے باؤل گرجے تھے اور ساتھ ہی فون کی بیل بھی بجی تھی۔ آج یہ آسمانی بجلی کہاں گرنے والی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ لیکن اس کا دل؟ وہ کیوں اس طرح تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ اس نے خوف سے اپنے سے چند قدم کے فاصلے پر رکھے ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف دیکھا۔ اس کے قدموں نے اٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ یہ فون نہیں سنے گی۔ فون کی بیل مسلسل بج رہی تھی۔

کہاں سے تھا یہ فون؟ کون اس سے بات کرنا چاہتا تھا؟ اسے کیا خبر سنائی جانی تھی۔

”تم میرے ساتھ ایسا مت کرنا“ ار تفضی غصہ فر ایسا مت کرنا جیسا شمن نے کیا تھا جیسا ممانے کیا تھا۔“

فون کی بیل بج بج کر خود ہی خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے کانوں پر سے ہاتھ ہٹائے اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ سوا دس ہو رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے سوا دس بجے ایسا لگ رہا تھا جیسے آدھی رات گزر چکی ہو۔ لاؤنج کے

علوہ پر راکر اندھیرے میں بیٹھا تھا۔
 باہر بجلی دیکے ہی ہلک دہلی گئی۔ باہل دیکے ہی
 نہ خاک انداز میں گرج رہے تھے۔ بارش اسی شدت
 سے برسی رہی تھی۔

سرووں کی بارش اسے کتنی پسند تھی۔ وہ اس موسم
 کو گھر آکر انجوائے میں نہیں کر رہا۔

"پتھر پانی بہت مڑے کی بھی مہا؟" اس کے کانوں
 میں اس کا صبح کا وہ بلند گونجا۔ اسے یاد آ رہا تھا صبح وہ
 ناشتہ کیے بغیر چلا گیا تھا۔ اس کی سیکرٹری کہہ رہی تھی
 کہ اس نے سچ بھی نہیں کیا اور کل رات؟ پتھر پانی کی
 تعریف اس نے یونہی کی تھی۔ کھایا تو بہت تھوڑا سا
 تھا۔ "مجھے اس کے لیے ناشتہ بنانا چاہیے تھا۔ اب بھی
 پتا نہیں اس نے کھانا کھایا ہو گا یا نہیں۔"

وہ اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔
 "جلدی سے واپس آ جاؤ میں تمہارے لیے خود کھانا
 بناؤں گی۔ تمہیں اس دن میرے ہاتھ کی بریانی اچھی
 لگی تھی ناں۔ میں اس دن سے بھی اچھی بریانی پکاؤں
 گی۔ تمہیں میرے ہاتھ کی کافی پسند ہے نا۔ میں
 تمہارے لیے اپنے ہاتھ سے کافی بناؤں گی۔"

اچانک بجنے والی فون کی بیل نے اس کی ساری
 سوچوں کو درہم برہم کر دیا۔ یہ فون کیوں بار بار بج رہا
 ہے۔ وہ کوئی فون نہیں سنے گی۔ اس نے فون کا تار بڑی
 بے دردی سے کھینچتے ہوئے فون اٹھا کر دور پھینک دیا
 تھا۔ اب یہ بیل نہیں بجے گی۔ اس نے سکون کا سانس
 لیا۔ وہ پھر دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے کھڑی
 ہو گئی۔

"صبا! ہمارے پاس گوانے کے لیے بہت کچھ اب
 بچا ہی نہیں ہے۔" وہ جیسے اسی دیوار سے ٹیک لگائے
 اس کے برابر کھڑا تھا۔

"میرے پاس تو واقعی اب گوانے کے لیے کچھ بھی
 نہیں بچا۔" اس نے آہستہ سے شکستہ لہجے میں اس
 سے کہا۔ لیکن وہ وہاں ہوتا تو اس کی بات کا کوئی جواب
 نہ دیتا۔

وہ اس کی بد قسمتی پر اسے تھپڑ مارنے کے بعد خفا

میں سہائی پائے آ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھیں گلے
 ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی زندگی میں اس شخص کے علوہ
 وہ سب کچھ کوئی نہیں تھا۔ وہ اس کی غلطیوں کو اتنی آسانی
 سے نظر انداز کرتا تھا۔ وہ اس کی بد قسمتی پر اس سے
 ناراض ہونے کے بجائے اٹا خورائے مٹاتا تھا۔ اور جو
 اسے تکلیف دینے والے سے انتہائی حد تک
 نفرت کرتا تھا۔

"واپس آ جاؤ ار تھنی! پلیز واپس آ جاؤ۔" اس نے
 بڑی شدت سے اسے پکارا۔ ساڑھے گیارہ بج چکے
 تھے۔ وہ کب سے کھڑی رہ گئی تھی۔

"مما! آپ نے کہا تھا کہ آپ کو اپنے کتے بیٹے

بھی اتنا بھروسہ نہیں ہے جتنا ار تھنی پر ہے۔ آپ کو

یقین تھا کہ وہ مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔ بیٹ

میری حفاظت کرے گا۔ مجھے ہر دکھ اور ہر تکلیف سے

بچائے گا۔ پھر آج میں تنہا کیوں ہوں ممما؟ وہ میرے

ساتھ کیوں نہیں ہے؟ وہ میرے پاس کیوں نہیں ہے؟

آپ نے مجھے دعا دی تھی ممما! کہا تھا کہ صبا زندگی تم پر

ہمیشہ ماں کی گود کی طرح مہربان رہے گی اس کا دامن

کبھی تمہارے لیے تنگ نہیں پڑے گا۔ لیکن زندگی

کبھی مجھ پر ماں کی گود کی طرح مہربان نہیں ہوئی ممما۔

اس نے قدم قدم پر مجھے آزمایا ہے۔ قدم قدم پر مجھے

تکلیفیں دی ہیں۔ دیکھیں ممما! آج اس طوفانی بارش

اور اجنبی شہر میں آپ کی صبا بالکل تنہا ہے۔" اچانک

اس کے دل میں شدت سے یہاں سے بھاگ جانے کی

خواہش ابھری تھی۔

باہر سڑک پر بھی مکمل اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ صرف

بجلی کے چمکنے سے لمحہ بھر کے لیے روشنی ہوتی اور پھر

اندھیرا۔ اس نے اپنے گھر کے گیٹ سے باہر ایک

گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکتی دیکھیں۔

وہ بے ساختہ دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ وہ اس لمحہ

سب کچھ بھول گئی تھی۔ یہاں تک کہ معاذ کو بھی۔

اسے بس یہ یاد تھا کہ اسے اس گھر سے کیسے چلے جانا

چاہیے۔ کیسے دور بہت دور۔ وہ اب زندگی کو بھی یہ

موقع نہیں دے گی کہ وہ صبا شفق کو آدھائے

آنے والے نے بجائے گیت پر نکل کر لے کے چلا
سے خود ہی گیت کھول لیا تھا۔ گیت کھانے کی آواز پر
چوکیدار فوراً "باہر نکلا اور پھر آنے والے کو دیکھ کر
ٹھٹھکی ہو کر واپس اندر چلا گیا۔ اس نے گیت کے اندر
قدم رکھنے والے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ دیکھتا
چلا جاتا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگتے ہوئے اس
اندر آنے والے کو نظر انداز کر لی گئی کھولنے لگی۔

"کیا ہوا صبا؟" اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے گیت سے
نکلنے سے روکا تھا۔ اس نے چونک کر اس آنے والے کو
دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا وٹم ہے وہ کسی اور کی
شکل میں اس کی شکل دیکھ رہی ہے۔ اس کے سامنے
کوئی اور کھڑا ہے۔ شاید رضایا پھر شاید اس کا کوئی اور
دوست۔ وہ تیزی سے اس کے پاس آ گیا۔

"صبا" یہ آواز اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی یہ شکل
اس کا اوٹن ہو سکتی تھی لیکن یہ آواز بے ساختہ وہ
اس کے قریب ہوئی۔

"تم پریشان ہو رہی تھیں صبا؟" وہ بہت تشویش
سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اوپر
آہستہ سے ہاتھ رکھا تھا۔ وہ جیسے اچانک ہی کسی خواب
سے جاگتی تھی۔

"کہاں گئے تھے؟" وہ بہت زور سے چیختی تھی۔

"وعدہ کر کے گئے تھے پانچ بجے آؤں گا۔ کیوں نہیں
آئے؟ یہ بھی نہیں سوچا کہ صبا اور معاذ اکیلے ہیں۔" وہ
اس کے بازوؤں کو جھنجھوڑتے ہوئے اور تیز آواز میں
چلائی۔

"صبا! میں۔" اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر
وہ کچھ سننے پر آمادہ نہیں تھی۔

"تم کتنی تھیں۔" صبا ار تضحیٰ تمہارا بہت خیال
رکھے مجھ۔ یہ خیال رکھا ہے میرا؟ اس انجان شہر میں
مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔" اس پر ایک جنون سا سوار تھا وہ
اسی طرح اسے جھنجھوڑتے ہوئے چلا رہی تھی۔

"صبا! میں گھر پر فون کر رہا تھا تم فون کی ہی نہیں
رہی تھیں" اس کی جھنجھوڑنے والے پھر ار تضحیٰ کو بات مکمل
کرنے کی کوشش کی۔

"سب مر جائیں گے صرف صبا زندہ رہے گی۔"
اسے کوئی لعل نہیں کر سکتا اسے موت بھی قتل نہیں
کر سکتی۔ صبا زندہ رہے گی سب کو مرنا دیکھنے کے لیے۔
شمن کی لعل کی ماما کی اور اب آپ۔ اب آپ کی
باری ہے۔ مرنا چاہتے ہیں۔ صبا کو اکیلا چھوڑ کر جانا
چاہتے ہیں۔ "وہ اس کے سینے پر ہتھ مار رہی تھی۔
"صبا! مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ دیکھو میں تمہارے
سامنے کھڑا ہوں۔" اس نے ذرا سختی سے کہتے ہوئے
اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"دیکھو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں کہیں بھی نہیں
گیا۔ میں تمہارے پاس ہوں۔ میں کہیں چھوڑ کر
کیس نہیں جا رہا۔" اس نے بہت نرم لہجے میں اسے
یقین دلایا۔ اس نے ایک پل کے لیے اس کی طرف
دیکھا اور پھر پتا نہیں اسے کیا ہوا تھا اس نے ایک دم ہی
اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔

"مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔ میں کتنی اکیلی
ہو گئی تھی۔ مجھے اتنا ڈر لگ رہا تھا۔" اس کے سینے پر سر
رکھے وہ سسک رہی تھی۔

"مجھے ایسا لگا کہ شمن اماں اور ماما کی طرح آپ
بھی۔ آپ نے کہا تھا ہمارے پاس گنوائے کے لیے کچھ
نہیں بچا۔ میرے پاس تو واقعی اب گنوائے کے لیے
کچھ بھی نہیں بچا ہے۔" وہ رو رہی تھی۔ ار تضحیٰ نے
اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے کے گرد رکھا ہوا تھا اور
دوسرے ہاتھ میں ابھی بھی اس کے دونوں ہاتھ پکڑے
ہوئے تھے۔ وہ منہ سے کچھ بھی نہیں بول رہا تھا۔ وہ
بالکل خاموش تھا۔

"شمن اور ماما کی طرح مجھے چھوڑ کر مت جائیے گا۔
میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔ میں نے آپ سے محبت
کی ہے۔ آپ کو کچھ ہوا تو میں بھی مر جاؤں گی۔" وہ
اسی طرح روتے ہوئے بولی۔ اسے یوں روتے روتے
بتا رہی تھیں کتنے پل گزر گئے تھے۔

ار تضحیٰ نے اسے روتے سے منع نہیں کیا لیکن
اسے خود ہی روتے روتے نہ جانے کیا ہوا تھا۔ اس نے
اس کے پاس سے ہٹنے کی کوشش کی۔ اپنے کندھے پر

سے اس کا ہاتھ بٹانا چاہتا تھا۔ ار تھنی نے اس کے کندھے پر سے ہاتھ بٹالایا اور اس کے ہاتھ بھی چھوڑ دیے۔ وہ فوراً سیدھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ہاتھ پھیرنے کے بعد اسے اپنے سامنے کیا۔ اس کے ہاتھ پر اس کے آنسو تھے۔ وہ بے یقینی سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ رو رہی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے ہیں۔

پانچ سال بعد وہ روئی تھی۔ اور یہ تو طے تھا کہ اگر کبھی اس کی آنکھیں رونے کے قابل ہو سکیں تو سب سے پہلے انہیں کس بات پر رونا ہے۔ اسی بات پر جس بات کے بعد ان آنکھوں نے رونے سے انکار کر دیا تھا۔

اس کی بہن پانچ سال پہلے مری تھی۔ لیکن اس کے مرنے کا علم اسے آج منانا تھا۔

”شمن! وہ بہت زور سے چلائی تھی۔ ار تھنی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اب اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔

”شمن! شمن!“ پکارتے وہ زور زور سے رو رہی تھی۔ روتے روتے وہ بارش کے پانی سے بھری ٹھنڈی سچ گھاس پر بیٹھ گئی۔ لان میں بارش کی وجہ سے ہر طرف پانی ہی پانی ہو رہا تھا۔

”تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں شمن!“ اس نے روتے روتے گھاس پر اپنا چہرہ رکھ دیا تھا۔ وہ اب مزید خاموشی سے اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”صبا! اٹھو۔ اندر چلو۔ دیکھو بارش کتنی تیز ہو رہی ہے۔ کتنی ٹھنڈ ہے یہاں پر۔“ اس نے اس کا چہرہ اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔

”مجھے تمہارا آنا برا نہیں لگا تھا شمن! میں نے کبھی تم سے نفرت نہیں کی۔ تم سے تو میں بہت پیار کرتی ہوں بہت پیار کرتی ہوں۔ میں تم سے شمن۔“ ار تھنی اس کا سر اوپر نہیں اٹھا سکتا تھا۔ وہ خود بھی اس کے پاس گھاس پر بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح ہڈیانی انداز میں چلائے ہوئے رو رہی تھی۔

بارش کا شور اس کی آنکھوں کو دبانے میں ناکام تھا۔

”ار تھنی! آپ نے شمن کی جگہ چھوڑ دی۔ کتنا دکھ میں نے اُسے اس نے میری بات نہیں سنی۔“ اس نے اپنے برابر میں اپنے ار تھنی کی طرف دیکھا۔ وہ زور رہتی۔ آپ کے ساتھ رہتی۔ کچھ وقت دیتی تھی۔ اتنا وقت کہ میں ماما کا کھانا ہوا محبت کا مضمون سمجھ لیتی۔ مجھے محبت میں ضد کے بجائے صبر کرنا آ جاتا۔ ”وہ اب اس کے کندھے پر سر رکھ کر ہلک ہلک کر رو رہی تھی۔ اسے نہ سردی کا احساس ہو رہا تھا اور نہ بارش میں بھینکنے سے کوئی تکلیف وہ بس روئے چلی جا رہی تھی۔

”صبا! اندر چلو یہاں بہت سردی ہو رہی ہے۔“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھر کے اندر لایا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اسی کے سہارے چلتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔ لاؤنج میں سوئے ہوئے سہارے پر ایک نظر ڈالتا وہ اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ اسے بیڈ پر بٹھا کر وہ بیڈ پر آنے لگا تھا۔ وہ ابھی بھی چپ نہیں ہوئی تھی۔ اس کے رونے کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بس صرف اتنا فرق تھا کہ اب وہ روتے ہوئے چیخ نہیں رہی تھی۔ اس کے لبوں پر اب بھی یہی جملہ تھا۔

”شمن کو میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ جیسے خود ہی سے مخاطب تھی۔

”وہ میری زندگی کے سترہ سال تھے۔ سترہ دن یا سترہ مہینے نہیں۔ سترہ سالوں کی محبت تھی میری۔ میں اتنی جلدی کیسے بھول جاتی اپنی محبت کو۔ اتنی جلدی کیسے قبول کر لیتی۔ اس بات کو کہ سترہ سال تک جس شخص سے میں نے محبت کی وہ مجھے نہیں شمن کو مل گیا ہے۔ سترہ سال کی محبت کو بھلانے میں کچھ وقت لگنا تھا۔ اسے مجھے تھوڑا سا وقت دینا چاہیے تھا۔ وہ مجھے کچھ وقت دیتی، اتنا کہ میں تقدیر کے اس فیصلے کو قبول کر لیتی۔

میں اس کی بہن تھی۔ کیا اتنی کیسی ہو سکتی تھی کہ ساری زندگی اس سے حسد کرتی رہتی۔ مجھے تو بس تھوڑا سا وقت چاہیے تھا۔

اس نے مجھے بھٹکانے کا وقت نہیں دیا۔ تھوڑی سی

ساتھ نہیں دی۔ اس نے صرف مجھے سزا سنائی۔ اس نے مجھے کہنے میں خود بھی اپنی اتنی بد صورت اور کمرہ نظر دکھائی کہ وہی بد صورت کہ میں خود سے نظرت کرنے لگی۔ وہ اپنی نظریں میں کر گئی۔ "وہ اس طرح سر جھکا کر روئے ہوئے اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی پھر روئے روئے اس نے ار تفضی کی طرف دیکھا وہ ایک تک خاموشی سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

آپ سب روئے تھے اس کے مرنے پر۔ اماں کی پوتی مری تھی وہ روتی تھیں۔ ماما اور ڈیڈی کی بیٹی مری تھی وہ روئے تھے۔ بابا کی بیٹی اور سو مری تھی وہ روئے تھے۔ آپ کی بیوی مری تھی آپ کے بیٹے کی ماں مری تھی آپ روئے تھے۔ ظفر بھائی کی بہن مری تھی وہ روئے تھے۔ لیکن اس نے مجھے اپنی موت پر رونے بھی نہیں دیا تھا۔ اس نے مجھ سے سارے حق چھین لیے تھے۔

وہ غمی تھی مجھ پر۔ کس منہ سے تم میرے مرنے پر روؤ گی صبا؟ تم نے میرے مرنے کی دعائیں مانگی تھیں۔ تمہاری تو آج دعائیں قبول ہوئی ہیں۔ تمہارے لیے تو آج جشن کا دن ہے۔ وہ کتنی ظالم ہو گئی تھی۔ کتنی کنھور وہ خود مر گئی اور صبا کو اس نے جیتے جی مار ڈالا۔ میرے اتنے سارے رشتے مجھ سے بچھڑے۔ میں نہ رو سکی۔ اس نے میری آنسو چھین لیے تھے۔

کیا واقعی محبت اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس پر انسان کو کبھی معافی ملے ہی نہ؟ اور وہ محبت میں نے کیوں کی تھی؟ کب کی تھی؟ مجھے تو ڈھنگ سے یاد بھی نہیں میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ میں نے ہوش سنبھالتے ہی ایک شخص کو خود سے بہت قریب دیکھا تھا۔ وہ میرے ساتھ ایک غیر معمولی سلوک کیوں کرتا تھا؟ شاید کزن سمجھ کر؟ شاید چھوٹی بہن سمجھ کر؟ مگر اس توجہ کے میرے دل نے بہت چھوٹی عمر میں ہی بہت مختلف معنی نکال لیے تھے مجھے محبت کے معنی بھی نہیں پتا تھے اور میں ار تفضی غلط فہم سے محبت کرتی تھی بہت چھوٹی عمر میں محبت کے معنی بہت سمجھا دی تھی۔

"میں نے غصہ بہت زیادہ کیا تھا۔ یہ تمہاری اتنی پروا ہے۔ یہ صرف اور صرف تمہارا ہے۔" میں ار تفضی سے محبت کرتی تھی۔ اسے اپنی ملکیت سمجھتی تھی۔ "وہ اسی طرح اس کے پھرے پر نظریں جمائے ہوئے ہوتے ہول رہی تھی۔ اندازاً ایسا تھا جیسے اسے کوئی کھالی سارہی ہو۔ پھر کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہوئی اس پر سے نظریں بھی ہٹا لیں۔ لیکن پھر اچانک ہی جیسے اسے کوئی بات یاد آئی تھی۔ اس نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا اتنی دیر میں اب وہ پہلی بار براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"کیوں رکھتے تھے میرا اتنا خیال؟ کیوں کرتے تھے میری اتنی پروا؟ کیوں دیتے تھے مجھے اتنی اہمیت؟ کیوں ہر جگہ صرف صبا کی خاطر جیت کر آتے تھے؟ دیکھناں کتنا نقصان ہوا میرا۔ اسی وقت مجھے بتا دیتے کہ وہ دیتے کہ صبا میں یونہی تمہاری پروا کرتا ہوں۔ مجھے تم سے ویسی محبت نہیں جیسی تم سمجھتی ہو۔ اسی وقت میری غلط فہمی دور ہو جاتی۔ تب ہماری زندگی میں شمن نہیں آئی تھی، اسی وقت میری محبت کو رد کر دیتے تو میں اس کا ذمہ دار شمن کو نہیں سمجھتی۔ پھر میں یہ کبھی نہیں سوچتی کہ شمن کی وجہ سے میری محبت مجھ سے چھنی ہے۔

بولنے اور رونے کے ساتھ ساتھ وہ اس کے بازو کو بھی جھنجھوڑنے لگی تھی۔ جیسے اسے اس کی غلطی کا احساس دلانا چاہ رہی ہو۔ وہ ہنوز خاموش تھا۔

"آپ نے میری غلط فہمی دور نہیں کی۔ لیکن شمن نے کر دی۔ اس کے آنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ وہ شخص جسے میں بچپن سے صرف اپنا سمجھتی تھی وہ میرا نہیں تھا۔ وہ شمن کا تھا۔ میری بچپن کی محبت ایک جھٹکے میں شمن نے مجھ سے چھین لی۔ وہ محبت جو میری تھی ہی نہیں میں اس کے نہ ملنے کا ذمہ دار شمن کو سمجھنے لگی۔

میں اندر ہی اندر اس سے نفرت کرنے لگی۔ اس سے حسد کرنے لگی۔ مگر میری نفرت اور حسد بھی اسے آپ کی زندگی میں شامل ہونے سے روک نہیں

پائی۔ میں اپنی شکست اور ہلاکت پر سوچنے لگا اور
میں کو بد دعا میں دے کے کچھ کر نہیں سکتی تھی۔
بہت دعا میں مانگی تھیں میں نے آپ کو پانے کے
لیے میری کوئی دعا قبول نہیں ہوئی۔

میری دعاؤں میں اثر نہیں تھا مگر میری بد دعاؤں میں
بہت اثر تھا۔ جس رات آپ دونوں نے نئی زندگی
شروع کی میں ساری رات تم کو بد دعا میں دیتی رہی
تھی۔ اپنی بہن کے مرجانے کی دعا میں مانگی تھی میں
نے بڑے بچے دل سے۔

پھر میری بد دعاؤں نے قبر تک اس کا چھچھا کیا۔ اسے
قبر تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ میں بھول چکی تھی اپنی ان
بد دعاؤں کو۔ مجھے وہ اس روز یاد آئیں جب تم نے
پرل ساڑھی کی جگہ سفید کفن پہن لیا۔ میں نے تو
یونہی بے سوچے سمجھے غصے میں اسے بد دعا دے دی
تھی۔ کیا پتا تھا وہ اسے لگ بھی جائے گی۔ وہ دوبارہ
زور زور سے رونے لگی تھی۔ بہت دیر تک وہ اس
طرح چیخ چیخ کر روتی رہی۔

”آپ سے اگر یہ کہوں کہ میں تم سے بہت پیار
کرتی تھی تو آپ یقین نہیں کریں گے۔ اب تو کبھی
بھی نہیں کریں گے۔ لیکن میں اس سے پیار کرتی
تھی۔ وہ میری بہن تھی۔ آپ بھی نہ مانیں، تم بھی
نہ مانے۔ چاہے کوئی بھی نہ مانے، مجھے تم سے محبت
تھی۔ میں صرف اس لڑکی سے نفرت کرتی تھی جس
نے ار ترضی غنمفر کو مجھ سے چھینا تھا۔“

مستلزل رونے اور چیخنے سے اس کی آواز بیٹھ گئی
تھی۔ اس کے منہ سے لفظ پورے نہیں نکل رہے
تھے۔ لیکن وہ پھر بھی چپ نہیں ہوئی تھی۔ وہ سب
کچھ کہہ رہا چاہتی تھی۔ اسے اس بات کا نہ کوئی ہوش
تھا نہ ہوا کہ ار ترضی یہ سب باتیں سن کر اس کے
متعلق کیا سوچے گا۔ وہ ہر بات سے بے نیاز ہو چکی
تھی۔

”بڑی خوش تھی میں اس روز جب مم اور ڈیڈی
نے مجھے سفر فیروز کے سنگ رخصت کیا تھا۔ میں اپنے
صور میں تم کا چہرہ لاتے ہوئے مسکراتی تھی۔ میں

نے اسے چاہا تھا کہ اس کی سب دوستیں مل کر
میں نے اس کی کسی چیز پر قبضہ نہیں کیا۔ میں تو اس کو
سے بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ راجہ جی ہوں۔ کتا سگوں
ملا تھا مجھے اس روز۔ میں تم کی نظروں میں سرخو
ہو گئی تھی۔ مگر پھر میرے ساتھ کتا بھیا نک
کھیل لھیا۔ شادی کی پہلی رات میرے شوہر نے مجھے
قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ”وہ اب اپنے ہاتھوں میں
چہرہ چھپا کر رو رہی تھی۔“

”تم نے ایک روز مجھ سے کہا تھا کہ وہ میرے لیے
دعا کرتی ہے کہ مجھے ار ترضی غنمفر جیسا محبت کرنے
والا شوہر ملے، مجھے اس کی وہ بات بہت بری لگی تھی۔
کیوں دے رہی تھی وہ مجھے یہ دعا۔ ار ترضی غنمفر کے
بعد نہ پھر مجھے محبت چاہیے تھی اور نہ محبت کرنے والا
کوئی شخص۔ میں نے خود اپنے لیے دعا مانگی تھی کہ
جب میں ار ترضی کو اچھی نہیں لگی تو پھر کبھی کسی کو
اچھی نہ لگوں۔ جب اسے مجھ سے محبت نہیں ہوئی تو
پھر کبھی کسی کو مجھ سے محبت نہ ہو۔ مجھے کسی کی
محبت نہیں چاہیے، مجھے کسی کی توجہ نہیں چاہیے۔“
اس نے یک دم ہی اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا دیے
تھے۔

”بڑے بچے دل سے میں نے خود کو بد دعا دی تھی۔
صبا کو زندگی میں سب کچھ ملا، بس محبت ہی نہیں ملی۔“
اس نے اپنی ہتھیلیاں سامنے پھیلائی ہوئی تھیں۔
جیسے ان میں محبت کی لکیر ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی
ہو۔ اس کے آنسو اب اس کی ہتھیلیوں پر گر رہے
تھے۔

”دیکھیں، نہیں ہے محبت کی لکیر میرے ہاتھ میں۔
میں نے سفیر سے بھک مانگی تھی اس رشتے کو قائم
رکھنے کے لیے۔ مجھے کسی بے عزتی کا احساس نہیں
ہوا تھا۔ آپ کو لگا تھا مجھ میں عزت نفس اور غیرت
بالکل ختم ہو گئی ہے۔ ہاں ہو گئی تھی، مجھ میں عزت
نفس ختم۔ میں اس رشتے کو ختم کر کے واپس اپنے گھر
آجاتی۔ پھر سے تم کے سامنے شرمسار ہونے کے
لیے۔ اب کم از کم میں تم کی تصویر کے آگے سر اٹھا

کر تو کھڑی ہو سکتی تھی۔ میں کو ششیں کرتی رہی اس
رشتے کو جوڑے رکھنے کی۔ اور اس رشتے کو تو ختم ہونا
ہی تھا۔ زندگی نے مجھ سے کہا میں تمہیں کبھی معاف
نہیں کروں گی۔ تم شمن کی جگہ لینا چاہتی تھیں تو او
اب۔۔۔ لو یہ شمن کا شوہر تمہارا یہ اس کا بیٹا تمہارا یہ
اس کی جگہ تمہاری۔ اس کی ہر چیز تمہاری ہے۔ اب
تم بل بل جینا بل بل مرنا بنالیا میں نے اپنی بس کی قبر
پر اپنی محبت کا محل۔ چھین لی اس سے اس کی ہر چیز۔
تو دو کوڑے ماروں اپنے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے
کردوں۔ منادوں خود کو پھر بھی اس سچائی سے منہ
نہیں چھپا سکتی کہ جو زندگی میں کبھی چاہا تھا وہ آخر کار
پالیا ہے۔ میرا زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن موت
مجھے قبول نہیں کرتی۔ لوگ اتنی آسانی سے مر جاتے
ہیں مجھے تو موت بھی نہیں آتی۔“

ڈاکٹر کے لیے ہوئے انجکشن کی وجہ سے بڑی
اور گہری نیند سو رہی تھی۔

را کے پانچ بج رہے تھے اور نیند اس کی آنکھوں
سے کوسوں دور تھی۔ وہ اس کے پاس سے ایک لمحہ کے
لیے بھی نہیں ہٹا تھا۔ رات جو طوفان آیا وہ اب کھم چکا
تھا۔ بارش بالکل رک چکی تھی۔ موسم کل سے زیادہ
سرد ہو گیا تھا۔ وہ اس پر نظر میں جمائے گزرے کل کی
ساری باتیں ایک ایک کر کے سوچنا چلا جا رہا تھا۔ کل کا
دن اس کی زندگی کا کیسا دن تھا کل کی رات اس کی
زندگی کی کیسی رات تھی۔ آفس میں اسے بہت کام
تھا۔ ایک بہت اہم میٹنگ تھی۔ لیکن اس کا کوئی کام
اس کے بچے سے زیادہ اہم نہیں تھا اس نے آفس
میں اپنی اس مدد کی سب مصروفیات منسوخ کر دی
تھیں۔ وہ جلدی جلدی اپنے ضروری کام نمٹانے میں
لگا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے پاس انیس انکل کا فون
آیا۔ وہ دیا کے فون کے دونوں کے بہت اچھے دوست
تھے۔ دیا کے حوالے سے اس کی فکر کی بھی ان سے بہت
انجی انڈسٹریلنگ تھی۔ اس کے کچھ بھی انہوں نے

اسے اپنے کام سے فون کیا تھا۔ ان کی بی فیکٹری کی تعمیر
کا کام زور زور سے جا رہی تھا۔ وہ اس کی فیکٹری
کی سائٹ پر لے جانا چاہتے تھے اسے انیس انکل کو
منع کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔ پھر آج کی اپنی بالی تمام
مصروفیات تو وہ ملتوی کر ہی چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ
آفس سے بجائے ساڑھے چار کے تین بجے اٹھ جائے
گا۔

وہ آفس سے تین بجے اٹھ گیا، انیس انکل کو اس
نے ان کے گھر سے پک اپ کیا، سارا راستہ وہ ان سے
ان کی فیکٹری کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ وہ دونوں
سائٹ پر پہنچے تو گاڑی سے اترتے ہوئے اسے اپنے
موبائل کا خیال آیا۔ وہ موبائل اپنے آفس میں بھول
آیا تھا۔ اب یہاں پہنچ کر موبائل کو بھول آنے پر
سوائے افسوس کے کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ
انیس انکل کے ساتھ سائٹ کا معائنہ کرنے لگا۔ لیکن
اچانک ہی پتا نہیں انہیں کیا ہوا، ان کے چہرے کے
تاثرات بدلنے لگے، یوں جیسے وہ بڑی تکلیف میں
ہوں۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ اس نے انہیں
سہارا دے کر بٹھایا، انہوں نے خود اپنی جیب سے
ٹیبلیٹ نکال کر زبان کے نیچے رکھ لی تھی۔ وہ بہت
یرانے ہارٹ پینٹ تھے یہ وہ جانتا تھا۔ لینے
کے باوجود بھی ان کی حالت نہیں سنبھلی تھی۔ ایک
طرف ان کی اچانک طبیعت خراب ہوئی تھی۔ دوسری
طرف زوردار بارش اس نے جلدی سے انہیں گاڑی
میں بٹھایا۔ فوراً کسی قریبی ہاسپٹل پہنچ سکے۔ وہ وہاں
سے کچھ ہی دور گیا تھا کہ راستے میں اس کی گاڑی
خراب ہو گئی۔ بہت کوشش کے باوجود بھی گاڑی
اشارت نہیں ہو رہی تھی۔

تنگ آکر اس نے گاڑی کو اس کے حال پر چھوڑا
اور جلدی سے باہر نکل کر ٹیکسی ڈھونڈنے لگا۔ گاڑی
خراب ایسی سڑک پر ہوئی تھی جو بالکل سنسان تھی۔
بارش کے بعد تو وہاں اور بھی سناٹا ہو گیا تھا۔ اکا دکا
گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ہر کسی ٹیکسی کا کہیں کوئی وجود
نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس نے ایک دوپٹہ لٹکا دیا۔ گاڑیوں کو ہاتھ کے اشارے سے روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں رکیں۔
 اوپر گاڑی میں انہیں انکل کی حالت خراب تھی۔ دھڑک دھڑک کے آخری کونے تک ٹیکسی کی تلاش میں بھاگتا پھر رہا تھا۔ بڑی جدوجہد کے بعد وہ ٹیکسی لے کر آئے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہ لوگ ہسپتال پہنچے انہیں انکل کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ انہیں فوری طور پر آئی سی یو میں داخل کیا گیا تھا۔ وہ آئی سی یو میں لے جائے گئے اور وہاں پر کھڑا رہا۔ تب پہلی مرتبہ اسے کھڑی دیکھنے کا خیال آیا۔ کھڑی ساڑھے سات بج رہی تھی۔
 اسے معاذ کا خیال آیا۔ انہیں انکل کی طبیعت بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ ان کی بیوی اور بیٹی امریکہ گئی ہوئی تھیں وہ آج کل یہاں بالکل تنہا رہ رہے تھے۔ ان کے کسی قریبی عزیز کی غیر موجودگی میں اس حالت میں انہیں اکیلا چھوڑ کر آنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے صبا کی فکر تھی۔ اسے معاذ کی فکر تھی۔ اسے معاذ کی ناراضگی کی فکر تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اسے انہیں انکل کی فکر تھی۔ وہ گھبرون کرنے آیا تاکہ صبا اور معاذ اس کے لیے پریشان نہ ہوں۔ شام پانچ بجے آنے کا وعدہ کرنے والا اگر ساڑھے سات آنھ بجے تک نہ آئے اور اپنے بارے میں کوئی اطلاع بھی نہ دے تو گھر والوں کی پریشانی لازمی ہے۔

ریسیپشن پر آکر اس نے گھبرون کیا 'لائن انگیج' تھی۔ اس نے دوبارہ کیا دوبارہ بھی انگیج نہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب صبا، رضا اور پھر اس کے بعد ارغمنی کے تمام جاننے والوں کو فون کر رہی تھی۔ اس نے کتنی مرتبہ ٹرائی کیا۔ ہر بار لائن انگیج ملی۔ وہ واپس آئی سی یو کے باہر آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ سوچ کر کہ تھوڑی دیر میں پھر ٹرائی کروں گا۔ پھر جب اس نے جا کر ٹرائی کیا تو لائن مل گئی۔ نیل یا انکل ٹھیک جا رہی تھی وہ مطمئن ہو گیا۔ اس کے حساب سے تو پہلی ہی نیل پر کل رہیم کی جانی چاہیے تھی۔ اس کی پریشانی میں وہ یقیناً فون کے انکل پاس ہی ٹنگی ہوگی۔ مگر وہاں تو نیل پر نیل جا رہی تھی۔ اور کوئی فون ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ صبر

تک اس نے نیل پر ہونے والی ٹنگی کوئی فائدہ نہیں دیا۔ وہیں ریسیپشن پر کھڑا رہا اس نے دوبارہ ٹرائی کیا اس بار بھی نیل جا رہی تھی اور کوئی کل رہیم نہیں کر رہا تھا۔ وہ ٹنگ آ گیا۔ وہ سمجھ نہیں رہا تھا کہ یہ ہو گیا یا ہے۔ کیا بارش کی وجہ سے کھر کا فون خراب ہو گیا تھا۔ وہ اس حالت میں انہیں انکل کو اکیلا چھوڑ کر باقی نہیں سکتا تھا۔ اور کھر پر اس کا رابطہ ہو نہیں رہا تھا۔ وہ آیا کرے وہ حقیقتاً طبیعت میں پھنس گیا تھا۔

رضا اور فائزہ کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہ دونوں آج دوپہر کسی ضروری کام سے اسلام آباد چلے گئے ہیں۔ اگر وہ ہوتے تو وہ رضا سے ہی کاٹیکٹ کر لیتا۔ اللہ اللہ کر کے انہیں انکل کی طبیعت سنبھلی تھی۔ وہ اب مزید ان کے پاس نہیں رک سکتا تھا۔ پہلی فرصت میں وہ ٹیکسی سے گھر واپس آیا تھا۔ اس نے صبا کی پریشانی کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا۔ وہ اسے کتنا بھی انور کرتی تھی کتنا بھی مس لی ہو کرتی تھی اس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ سب باتیں بھول کر اس وقت وہ صرف اس کے لیے پریشان ہو رہی ہوگی۔ وہاں آکر جو اس نے دیکھا وہ اس کی توقعات سے بھی زیادہ سنگین تھا۔

وہ اب سوچ رہا تھا کہ کل جو جو کچھ بھی ہوا وہ سب محض اتفاق نہیں تھا۔ تقدیر نے کل کے دن کے واقعات اسی ترتیب سے رقم کیے تھے۔ اتنے سارے اتفاقات۔ اسے مان لینا پڑا کہ جب تقدیر کو کسی کام کو انجام دلوانا ہوتا ہے تو وہ اس کے لیے اسباب بھی خود ہی پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ کل رات جو کچھ ہوا وہ ہونا چاہیے تھا اور اسے ضرور ہونا چاہیے تھا۔

زندگی ایک ہی رات میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اسے صبا کی کسی بات پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ پہلے سے جانتا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور اب اس محبت کو چھپانے کے لیے نفرت کا اعلان کرتی ہے۔ باقی باتیں وہ نہیں جانتا تھا۔ صبا کے دشمن کے لیے جذبات اس کا ارتعاش اور دشمن کی شادی پر رد عمل دشمن کے مرنے کے بعد کی ان کی سوچیں اس کی ندامت اس

بے تکلفی سے اس کے برابر میں جتنی دیر دیا تھا۔
اسے اس کا وہ انداز یاد آگیا کہ لگتا تھا۔ اسے معلوم تھا
اس کا صرف قہر تھا وہ اسے اندر سے ہوا اتنی ہی پھولی
تھی جتنی پہلے تھی۔ وہ بھی وہی شرارتی تھی۔ وہ بھی وہی
صبری تھی۔ وہ بھی وہی بڑی ہو جاتی اور تنہی کے لیے
اسے بے چین ہی رہنا تھا۔

پھر اس کی زندگی میں شمن آئی۔ اور تنہی کو وہ بہت
اچھی لگی۔ وہ اس سے محبت کرنے لگا۔ اس نے شمن
سے شادی کا فیصلہ کیا۔ کتنا خوش تھا وہ شمن کے ساتھ
منگنی ہونے پر، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی زندگی
میں صبا کی اہمیت میں بھی گولی کی نہیں آئی۔ شمن کے
لیے وہ وہ خند خریدتا جو اس کا دل چاہتا کہ وہ شمن کو
دے۔ اور صبا کے لیے وہ وہ چیز خریدتا جو صبا کو پسند
ہوتی۔ بعض دفعہ صبا کی پسند کی چیز اسے بڑی مشکل
سے ملتی۔ اس کی پسند کی چیزیں کتنی بچکانہ سی ہوتی
تھیں۔ لیکن انہیں ڈھونڈتے اور خریدتے ہوئے کبھی
اسے یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک بے کار اور
احتمالاً کام میں اپنا وقت برباد کر رہا ہے۔ سیدھے
سیدھے اپنی مرضی سے کوئی بھی چیز خرید لے اسے
تفخ میں دینے کے لیے۔

صبا کی شادی ناکام نہ ہوتی تو شاید وہ کبھی اس بات کو
جان ہی نہ پاتا کہ صبا حقیقت میں اس کے لیے ہے کیا۔
صبا کے ساتھ اس کا انوکھا بندھن تھا۔ اس میں نہ
جبر تھا نہ وصال، اس میں نہ پانے کی خواہش تھی نہ
کھونینے کا ملال، اس کی صرف ایک خواہش تھی صبا
ہمیشہ خوش رہے۔ اسے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اس
نے زندگی میں کبھی کسی شخص سے اتنی نفرت نہیں کی
جتنی سفیر فیروز سے کی۔ وہ ہر اس شخص سے انتہائی
عدول تک نفرت کرتا تھا۔ جو صبا کو تکلیف دے۔

صبا کو یاد نہیں کہ اسے اور تنہی غصہ سے پہلی بار
محبت کب ہوئی۔ لیکن اسے یاد تھا وہ آٹھ اپریل
تھی۔ شام کا وقت تھا۔ جب اس نے پہلی بار صبا کو
دیکھا تھا۔ سات سال کی عمر میں اس نے اس لڑکی سے
محبت کرنا شروع کر دی تھی۔

اس نے صبا سے شادی کی خواہش کا اظہار صرف
مراتے آنسوؤں اور ٹپکی کی اداسیوں کو دیکھتے ہوئے
کیا۔
لیکن صبا اس شادی کو ماننے کے لیے تیار نہیں
تھی۔ وہ اس رشتے سے نفرت کرتی تھی۔ وہ صبا کے
اس دور عمل کی وجہ ڈھونڈنے میں لگا رہا۔

وہ کم عمر اور جذباتی سی لڑکی تھی۔ وہ پھولی سی لگی
کھتا تھا اس کے ساتھ آخر اس کا رشتہ تھا کیا؟ اس
کے بہت اندر چھپی تھی یہ بات۔ اسے اندر کہ کبھی خود
اس پر ہی مشکف نہ ہو سکی۔ صبا کے اعتراف نے
اسے ہلا دیا تھا۔ اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے زندگی
میں کبھی بھی کسی عورت کے آنسوؤں سے اتنی
تکلیف نہیں ہوتی تھی جتنی صبا کے آنسوؤں سے
ہوتی تھی۔ اور اس وقت بھی وہ اسی تکلیف سے
گزر رہا تھا۔ اس وقت جب وہ اس کے کندھے پر سر
رکھ کر رو رہی تھی۔

اس نے ایک پل کے لیے بھی نہیں سوچا۔ وہ صحیح
تھی یا غلط، وہ اچھی تھی یا بری۔ وہ صبا تھی۔ اس نے
زندگی میں جو کچھ کیا، وہ سب غلط تھا۔ تب بھی وہ اس
کے لیے وہی صبا تھی۔ وہ اس کے بارے میں اپنے
سوچنے کا انداز تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔

صبا کی طرف دیکھتے دیکھتے اس نے اپنی اور شمن کی
تصویر کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بیدار وہ اس نے
شمن کے لیے بڑی محبت سے سجایا تھا۔ اس میں لگی
اپنے ہنی میون کے دنوں کی یہ یادگار تصویر اسے کس
قدر پسند تھی۔ وہ کرسی پر سے ایک دم ہی اٹھا تھا۔
آہستہ قدموں سے چلتا ہوا وہ اب اس تصویر کے
سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہیں شمن کے
چہرے پر جمی تھیں۔

”شمن! میں نے نہ زندگی میں کل تم سے جھوٹ
بولی تھا اور نہ آج بولوں گا۔ تم میری زندگی میں آنے
والی سب سے اچھی لڑکی تھیں۔ تم اس دنیا کی لٹی ہی
نہیں تھیں۔ تم کسی اور دنیا کی لٹی تھیں۔ کسی
پرلوں کے دیس کی شہزادی مجورست بھول کر ہم انسانوں

کی دنیا میں آگئی تھی۔ تم! آج مجھے یہ اعتراف کر لینے
وہ کہ میں نے تم سے تمہاری خوبیوں کی وجہ سے محبت
کی تھی۔

اگر تم میں یہ تمام خوبیاں نہ ہوتیں تو میں کبھی
تمہاری محبت میں مبتلا نہ ہوتا اور صبا؟ صبا میرے لیے
کیا ہے؟

صبا مجھے اس لیے اچھی لگتی ہے کیونکہ وہ صبا ہے۔
وہ اچھی ہے یا بری۔ اس میں خوبیاں ہیں یا خامیاں وہ
صحیح ہے یا غلط، میں پھر بھی اس سے محبت کرتا
ہوں۔ تمہارے ساتھ دل کا رشتہ تھا، تم! تو صبا کے
ساتھ میرا روح کا رشتہ ہے۔ یہ محبت کا کون سا انداز
ہے میں نہیں جانتا۔ یہ عشق ہے، یہ جنون ہے۔ یہ کیا
ہے مجھے نہیں معلوم۔

ار تفضی کو کمرے میں آتا دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
”کیسی طبیعت ہے صبا؟“ وہ مسکراتے ہوئے اس
کے قریب آیا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے بہت آہستہ آواز میں اسے
جواب دیا۔

”یہ دیکھو چیز سینڈوچز بنائے ہیں، میں نے
تمہارے لیے کھا کر تاؤ کیسے بنے ہیں۔“ وہ ٹرے اس
کے سامنے رکھتے ہوئے اس کے برابر میں بیڈ پر بیٹھ
گیا۔ وہ خاموشی سے ٹرے کی طرف دیکھنے لگی۔

”لو ناں صبا! میں نے اتنی محنت سے تمہارے لیے
سینڈوچز بنائے ہیں اور میرا دعویٰ ہے کہ یہ سینڈوچز
تمہیں بہت پسند آئیں گے۔“ اس نے پلیٹ میں سے
سینڈوچ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں پکڑایا۔ اس نے کھانا
شروع کر دیا۔

”کو مزے کا ہے کہ نہیں۔“ اس سے جواب میں
کچھ بھی نہیں بولا گیا۔ نوالہ اس کے حلق میں پھنسے لگا
تھا۔ حلق میں آلسوں کا پسند اس کے گتے لگا تھا۔

”یہ کافی بھی تو ہے تمہارے جیسی مزے کی کافی تو
میں بھی نہیں بنا سکتا۔ ہر حال یہ کافی بھی اتنی بری

نہیں ہے۔ میرے حساب سے یہ میری بہترین کاوش
ہے۔“

وہ اس کی کیفیت سے انجان ناگہانی کامک اٹھا کر
اسے ویسے لگا۔ اس شخص کے سامنے وہ اپنی اصلیت
اس پر ظاہر کر کے پشیمان نہیں تھی۔ وہ ایسا سکون
محسوس کر رہی تھی جیسے ایک باضمیر مجرم اعترافِ جرم
کے بعد کرتا ہے۔

لیکن یہ شخص۔۔۔ وہ اس شخص کو کیا کہے۔ اس کی
سب باتوں کو سننے کے بعد بھی اس کا اس کے ساتھ وہی
انداز تھا۔ وہی نرم اور شیریں لہجہ، وہی چہرے پر
مسکراہٹ۔

اس نے اپنے برابر میں بیٹھے اس شخص کی طرف
دیکھا۔

”میری یاں اگر تم پر اندھا اعتماد کرتی تھی تو بالکل
ٹھیک کرتی تھی۔ تم واقعی میرے لیے ایک سلیہ دار شجر
کی مانند ہو۔ تم نے میرے اتنے بڑے گناہ کو معاف
کر دیا۔“

”اتنے اچھے کیوں ہو ار تفضی غضنفر؟ تمہیں میری
کوئی بات بری کیوں نہیں لگتی؟“ اس کی آنکھوں میں
آنسو آنے لگے تھے۔ اس نے ار تفضی پر سے اپنی
نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔

”معاذ کو زبردستی لے کر آئے ہیں۔ بہت ناراض
ہے مجھ سے۔ بالکل بات نہیں کر رہا۔ تم اپنی طبیعت
جلدی سے ٹھیک کر لو تاکہ پھر ہم کہیں باہر جا سکیں اور
معاذ کا موڈ ٹھیک ہو۔“ وہ اس کی سوچوں سے بے نیاز
نظر آ رہا تھا۔ اسے صبا کے چہرے پر جیسے کچھ نظر آ رہی
نہیں رہا تھا۔ اس نے ار تفضی پر سے نظریں ہٹالیں۔ وہ
اب خاموشی سے سینڈوچ کھا رہی تھی۔ سینڈوچ ختم
کر کے اس نے کافی کامک بھی پورا خالی کر دیا تھا۔

”بس ایک سینڈوچ؟ اور لو نا۔“
”میں کھا چکی۔“ اس نے پہلے سے بھی ہلکی آواز
میں جواب دیا۔

اس نے مزید اصرار کیے بغیر ٹرے سامنے سے ہٹا کر
سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف

رکھتے لگا تھا۔ وہ اس کی نظریں محسوس کر رہی تھی لیکن اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا نہیں تھا۔

”تم تم سے بہت محبت کرتی ہو۔ تمہارے یقین والے بغیر بھی بہت مجھے مظلوم ہے۔ تم نے خود کو سزا دی اس بات پر کہ جس سے تمہیں اتنی محبت تھی اس کے بارے میں لمحہ بھر کے لیے بھی تمہارے دل میں برے خیال کیوں آئے تھے۔“ صبا نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تم تمہاری وجہ سے نہیں مری تھی صبا! یہ کاتب تقدیر کا فیصلہ تھا۔ وہ حادثہ تمہاری وجہ سے نہیں ہوا تھا۔ اور نہ تم کوئی بہت پیچی ہوئی اور بزرگ ہستی ہو کہ کسی کو بددعا دے اور وہ اسے لگ بھی جائے۔ تمہیں صرف ہماری شادی ہونا اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن اسے ہونے سے روکنے کے لیے تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ تم ہم دونوں کے بیچ غلط فہمیاں پیدا کروا سکتی تھیں۔ تم مجھ سے بھی تم کے خلاف بہت کچھ کہہ سکتی تھیں۔ تم بڑی آسانی سے ہمارے درمیان لڑائی کروا سکتی تھیں۔ لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔

صرف محبت کرنا جرم نہیں ہاں اپنی محبت کے حصول کے لیے غلط راستہ اختیار کرنا ضرور جرم ہے۔ اور تم اس جرم کی مدد تکب نہیں ہوئی ہو۔ تم نے کچھ غلط نہیں کیا ہے صبا! تم نے تم سے کچھ نہیں چھینا۔ تمہاری مجھ سے شادی ہونا ہماری قسمت میں لکھا تھا۔“

اس کا اسے سمجھانے کا وہی انداز تھا جو ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔ وہ اب خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی ان کے درمیان آئی تھی۔ پھر اس خاموشی کو اس نے توڑا۔

”کل تم نے مجھ سے کچھ سوالات کیے تھے۔“ بولتے ہوئے اس نے جوی آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

”جیسا کہ تمہارے ان سوالوں کا جواب دینا چاہتا ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ مضبوط کیے ہوئے الفاظ سنائی دے رہے تھے۔

میں تمہارا خیال اس لیے رکھتا تھا کہ تمہارا خیال ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا۔ تمہیں اہمیت اس لیے دیتا تھا کہ تم میرے لیے بہت اہم تھیں۔ تمہارے لیے اس وجہ سے دیتا تھا کہ تم میرے جیتنے سے خوش ہوتی تھیں۔ تمہاری خوشی مجھے اپنی خوشی لگتی تھی۔

جس توجہ جس خیال کرنے کو تم محبت سمجھتی تھیں وہ محبت تھی وہ بالکل ویسی ہی محبت تھی جیسا تم اسے سمجھتی تھیں۔“

وہ ایک ایسی بات اسے بتا رہا تھا کہ وہ آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی لیے پلکیں جھپکائے بنا اسے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اس نے اس کی آنکھوں کی حیرت اور بے یقینی کو فوراً ”پڑھ لیا تھا۔“

”تم جانتی ہو صبا کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اگر مجھے تم سے محبت تھی تو میں نے تم سے شادی کیوں کی؟ میں یہ بات تمہیں نہیں سمجھا سکتا۔“

محبت ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کی ہے۔ مگر ہماری محبت کا انداز بہت مختلف تھا۔ تمہاری محبت حق جتانے والی تھی، ملکیت سمجھنے والی تھی۔

اور میں چاہتا تھا کہ تم سے ہر کوئی محبت کرے۔ بالکل ویسی جیسی میں کرتا ہوں۔ کتنی دعا میں مانگی تھیں میں نے کہ سفیر تمہارا اسی طرح خیال رکھے جیسا میں رکھتا ہوں۔ وہ تم سے محبت کرتا، تم اس کے ساتھ خوش رہیں تو مجھے ایک بل کے لیے بھی افسوس نہ ہوتا۔ ہمارے محبت کرنے کا انداز مختلف تھا صبا لیکن ایک دوسرے سے محبت ہم ایک جتنی ہی کرتے تھے۔ میری زندگی کے تمام سالوں میں سے صرف سات سال نکال دو۔ ان شروع کے سات سالوں کے بعد پھر ساری زندگی میں نے تم سے محبت کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔

تمہارے ساتھ جو میرا رشتہ ہے صبا، وہ بہت ہی عجیب رشتہ ہے۔ اسے میں کوئی نام دے نہیں پا رہا۔ وہ اپنے دل کی تمام تر جالیوں اور گہرائیوں کے ساتھ اس سے مخاطب تھا۔ صبا کی آنکھوں کی بے یقینی

تھوڑی سی تھی۔ وہاں اب صرف حیرت تھی۔

ایک بار ایسا ہوا تھا صرف ایک بار۔ جب میں تھوڑے لیے نہیں جیتا تھا۔ کیونکہ میرے ہارنے سے شمن خوش ہوتی تھی۔ بڑا خوش تھا میں بار کر لیکن تمہارے آنسوؤں نے میری اس خوشی کو بہت جلد اسی میں بدل دیا تھا۔

اور ایسا زندگی میں ہمیشہ ہوا ہے صبا، وہ خوشی جس کے راستے میں صبا کے آنسو آتے ہوں۔ وہ خوشی پھر مجھے کبھی بھی خوشی نہیں دے سکتی۔ یہ سچ ہے کہ شمن کبھی میرے دل سے نہیں نکل سکتی لیکن اس سے بھی بڑا سچ یہ ہے کہ میری زندگی میں جو جگہ اور جو مقام تمہارا ہے وہ کسی کا بھی نہیں۔

تمہارے لیے میرے دل نے کبھی کوئی منطق نہیں مانی۔ تم برے سے برا اور غلط سے غلط کام بھی کرو گی تو میں اسے غلط سمجھنے کے باوجود بھی تمہارا ساتھ دینے پر خود کو مجبور پاؤں گا۔

وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بڑے یقین سے بول رہا تھا۔ اور صبا کو کیا ہوا تھا اس پل وہ ہار گئی تھی خود سے۔

ار تفضی کہہ رہا تھا کہ وہ اپنا دل نہیں بدل سکتا۔ اور صبا پر اچانک ہی انکشاف ہوا کہ وہ بھی اپنا دل نہیں بدل سکتی۔ وہ خود سے کچھ بھی کہے۔ کتنے بھی جھوٹ بولے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ آج بھی اسی شخص سے محبت کرتی ہے۔ جو چیز اس کے بس میں نہیں تھی۔ اس کے لیے وہ خود پر گرفت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے یک دم ہی آنسو بہنے لگے تھے۔ اپنی برسوں کی تھکن اتارنے کے لیے اسے وہ کندھا میسر تھا جس پر سر رکھ کر وہ اپنے سارے آنسو بہا سکتی تھی۔ اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

بایا اور ویلیٹی ان لوگوں کی اتنی جلد واپسی پر بہت حیران تھے۔

”نہیں آپ، وہاں مجھے بہت بار آرہے تھے۔ اس لیے مجھے واپس آئے۔“

اس نے مسکراتے ہوئے بایا سے کہا۔

”خیر، تم لوگ جلدی آگے تو ایک طرح اچھا ہی ہوا۔ پچھلے رات ظلم کا فون آیا تھا۔ وہ لوگ پالستین آرہے ہیں۔“ بایا نے ان لوگوں کو اطلاع دی۔

”واقعی؟“ وہ ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”ہاں ظلم واپس آ رہا ہے۔ ہمیشہ کے لیے۔ اس گھر کے مہین واپس اپنے گھر آرہے ہیں۔ یہ کچھ پھر سے آپا ہونے والا ہے۔“ ویلیٹی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ خوشی تھی اطمینان تھا۔ زندگی جس طرح ایک روز اچانک اس گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ اسی طرح اچانک واپس بھی آگئی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد سب اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ وہ ار تفضی کے لیے کافی بنانے کچن میں آئی تھی۔ کافی بنا کر وہ کچن سے نکلی تو اس کی نگاہ لاونچ میں لگی اس تصویر پر پڑی۔ وہ اس تصویر سے نگاہیں چرانے کے بجائے بڑی بے ساختگی میں اس کے قریب آگئی۔

اس نے اپنی نگاہیں شمن کے چہرے پر جمادی تھیں۔

”مجھے بتاے، تم مجھ سے ناراض نہیں ہو۔ پھر بھی میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“ وہ ایک قدم مزید بڑھا کر اس تصویر کے بالکل نزدیک آگئی۔

”محبت سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی شمن! میں ار تفضی غصہ سے محبت کرتی ہوں شمن! میں معاذ ار تفضی سے محبت کرتی ہوں شمن! لیکن میں ان سے صرف محبت کرتی ہوں۔ ان پر اپنا کوئی حق نہیں سمجھتی۔ تمہارا شوہر اور تمہارا بیٹا میرے پاس تمہاری امانت ہیں۔ اور اگر قیامت کے دن ایسا کرنا ہم انسانوں کے بس میں ہوا، تو تمہاری یہ امانت میں خوشی خوشی تمہیں لوٹا دوں گی۔“

اس تصویر کے پاس سے ہٹ کر اس نے اپنے قدم میڑھیوں کی طرف بڑھا دیے تھے۔ اس کے یہ قدم اس کمرے کی طرف جانے کے لیے اٹھ رہے تھے جہاں جاتے ہوئے آج اسے کوئی ندامت نہیں تھی۔

the end